اُردو ڈائجسٹ

شبستان

نئی دہلی

غالب نمبر

مع

دیوانِ غالب مصوّر

اضافوں کے ساتھ

دوسرا ایڈیشن

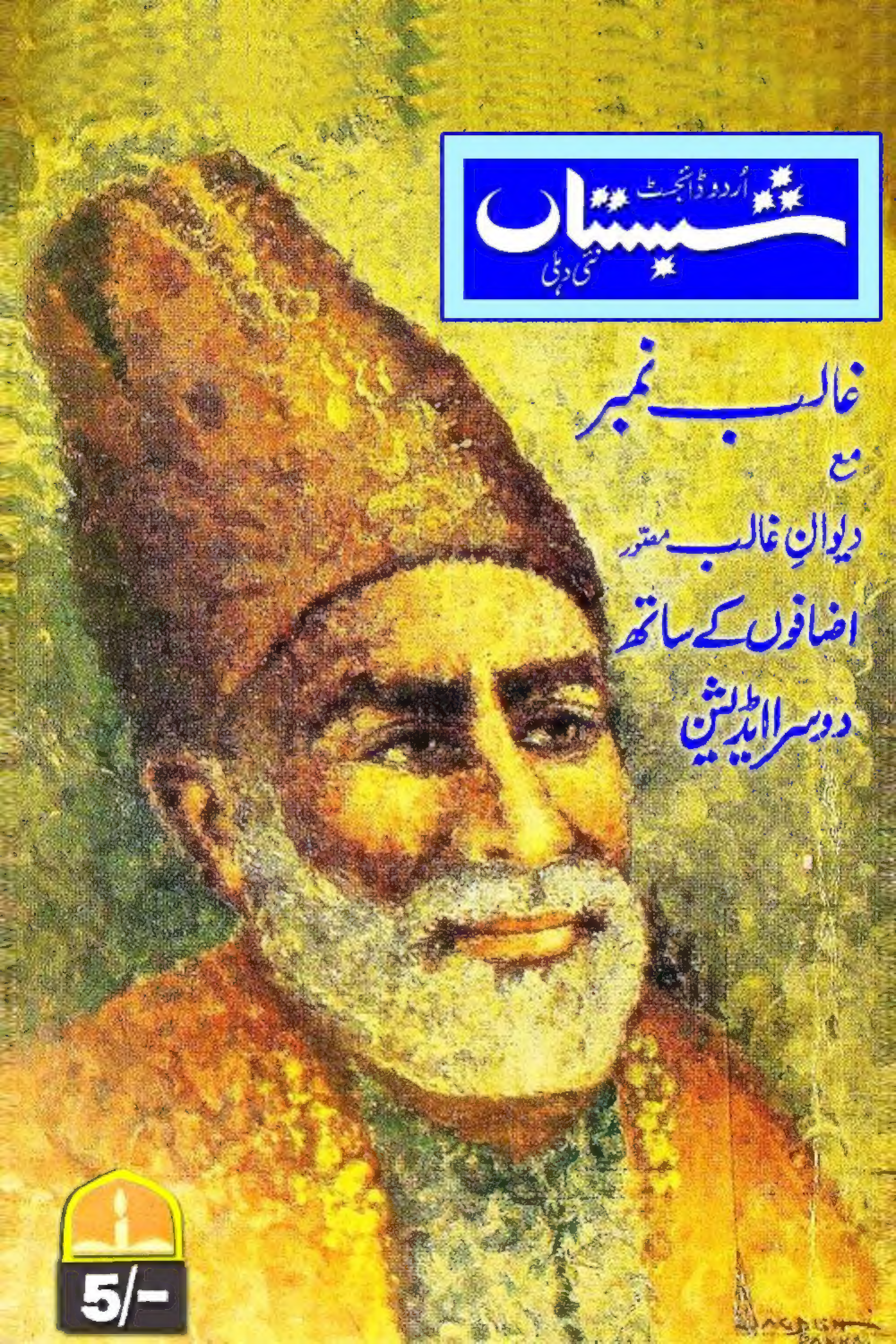

5/-

اردو ڈائجسٹ

شبستان

نئی دہلی

اضافوں کے ساتھ دوسرا ایڈیشن

غالب نمبر

مع مکمل دیوانِ غالب مصور

www.taemeernews.com

نگراں:
یوسف دہلوی

مدیران:
یونس دہلوی
ادریس دہلوی
الیاس دہلوی

اشاعتِ خاص

غالب نمبر کے اضافہ شدہ
ایڈیشن کی قیمت:
پانچ روپے

صدر دفتر:
آصف علی روڈ، نئی دہلی
فون: ۲۷۲۰۶۶، ۲۷۲۰۶۷، ۲۷۲۰۶۸
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ اور مدراس
ایجنسی: اُردو بازار دہلی
فون: ۲۶۱۷۷۳

www.taemeernews.com

لکھنے والے

ڈاکٹر ذاکر حسین
سرسید احمد خاں
بابائے اردو مولوی عبدالحق
نظم طباطبائی
غلام رسول مہر
فیض احمد فیض
مولانا حسرت موہانی
مالک رام
علامہ اقبال
مولانا محمد حسین آزاد
الطاف حسین حالی
میر مہدی مجروح
مختار الدین احمد آرزو
عرش ملسیانی
جگر مرادآبادی
سید مسعود حسن رضوی
فکر تونسوی
حمید احمد خاں
غلام احمد فرقت
حمیدہ سلطان
قاضی عبدالستار
یگانہ چنگیزی
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

عبادت بریلوی
شوکت تھانوی
مولانا ذکاء اللہ دہلوی
کوثر چاندپوری
صہبا لکھنوی
ڈاکٹر فرمان فتح پوری
پروفیسر آل احمد سرور
علیم اختر مظفر نگری
متین طارق
عابد رضا بیدار
شمیم اختر
مختار زمن
نادم سیتاپوری
محمد قاسم صدیقی
شہزاد اختر
والی آسی
شمیم کرہانی
وہاب حیدر
مرزا سجاد علی خاں اختر
ملاقاتی
سلامت علی مہدی
اور
بذاتِ خود — مرزا غالب

www.taemeernews.com

فہرست

اپنا صفحہ	مدیران	5
مرزا غالب سے انٹرویو	ملاقاتی	7
اے گہوارۂ علم و ہنر	علامہ اقبال	18
غدر 1857 میں غالب پر کیا بیتی	بہادر شاہ ظفر	19
غالب کے سفر	مرزا سجاد علی خاں اختر	23
غالب کو خراج ہائے عقیدت	عرش ملسیانی	29
حالی کا مرثیہ	مولانا حالی	34
حضرت غوث علی شاہ قلندر کی رند بلانوش سے ملاقات	مختار الدین احمد آرزو	35
غالب پر سرسید کا ایک سو بارہ سال پرانا مضمون	سرسید	39
غالب کے انتقال پر پہلا مضمون	سید مسعود حسن رضوی	42
پہلا غالب پرست	محمد قاسم صدیقی	44
غالب کی برسی پر غالب کے نام کی تجارت	غلام احمد فرقت	46
غالب کے لطیفے	ولی آسی	51
نظم: چاندنی رات کا میخوار	شمیم کرہانی	57
حیات غالب کے چند ورق	مولانا محمد حسین آزاد	58
غالب کی بہو سے ایک ملاقات	حمید احمد خاں	66
غالب کی شہرت کا راز	علیم اختر مظفر نگری	70
غالب کی محبوبہ	حمیدہ سلطان	74
غالب کا انداز بیاں	شہزاد اختر	78
فکر تونسوی غالب کے شعر کی شرح کرتے ہیں	فکر تونسوی	80
غالب کے اشعار - کارٹونسٹ کی نظر میں	وہاب حیدر	82
نظم: میر مہدی مجروح کے آنسو	میر مہدی مجروح	88
غالب کے خطوط	ادارہ	93
خراج عقیدت	جگر مراد آبادی	98
دیوانِ غالب	مرزا غالب	99
غزلیں	مرزا غالب	101
قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، مرثیہ، سلام، منقبت، نظم، مدح، خمسہ، سہرا	مرزا غالب	199
متفرقات	مرزا غالب	239
انتخاب از نسخۂ حمیدیہ	مرزا غالب	249
غیر مروجہ کلام	مرزا غالب	275
قادر نامہ	مرزا غالب	291
انتخاب از تحقیقات آسی	مرزا غالب	299
غالب کے انتقال کی پہلی خبر	اکمل الاخبار دہلی	307
غالب کے دو صاحب طرز شاگرد	متین طارق	308
جب غالب نے اپنی ہتکِ عزت کا دعویٰ کیا	بابائے اردو مولوی عبدالحق	312
غالب: دو شعر دو ستارے	غلام رسول مہر	314
کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو	عابد رضا بیدار	318
کیا غالب کی موت ذیابیطس سے ہوئی؟	شمیم اختر	322
جب غالب کے نام پر پورے ملک کو اپریل فول بنایا گیا	محمد ابراہیم خلیل	323
فیض احمد فیض کے آئینے میں غالب کا عکس	مختار زمن	324
لکھنؤ کی دو رشیا زہرہ اور مشتری غالب کی سخت دشمن تھیں	نادم سیتاپوری	328
شرح کلام غالب	مولانا حسرت موہانی	334
یہ غالب کے جعلی شاگرد ہیں	مالک رام	338
غالب نے بیسویں صدی کی آہٹ سن لی تھی	ڈاکٹر ذاکر حسین خان (صدر جمہوریہ ہند)	340
دیوان غالب مصنفوں کے لیے مشعل راہ	صہبا لکھنوی	342
پیروڈی بر غزل غالب	شوکت تھانوی	345
غالب یادگار قائم کرنے کی تجویز سو سال پرانی ہے	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	346
آخری مضمون	سلامت علی مہدی	350

www.taemeernews.com

اپنا صفحہ

غالب کی سو سالہ برسی منائی جا رہی ہے اور سو برس کی مدت ایک بڑی لمبی مدت ہوتی ہے لیکن ہم نے شبستاں کے غالب نمبر میں سو برس کو مختصر کر کے صرف ۲۵۴ صفحات میں محدود کر لیا ہے اور ہم مطمئن بھی ہیں کیوں کہ پھولوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور پھولوں سے نکلنے والے عطر کی مقدار ہمیشہ کم ہوتی ہے۔

یہ غالب نمبر نہیں ہے ایک عطر بیز صحیفہ ہے۔ اس صحیفہ کو ایک صحیفۂ ناطق بھی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کا ہر صفحہ ایک بولتی ہوئی تصویر ہے۔ اس کے ہر صفحہ میں غالب بھی ہے اور وہ نغمہ بھی جس نے غالب کے لبوں پر دم توڑ دیا تھا اور جسے آج دیوانِ غالب کہا جاتا ہے —— غالب کے بارے میں شبستاں کی اس دستاویز میں غالب کا ماضی بھی ہے اور حال بھی لیکن اس میں غالب کا مستقبل نہیں ہے کیوں کہ غالب کا مستقبل اردو ہے۔ غالب کی مٹی ثمرقند کی تھی ان کی مادری زبان فارسی تھی لیکن انہوں نے اردو سے محبت کی اردو میں شاعری کی کیوں کہ اردو ہندوستان کی زبان تھی لیکن، یہ غالب کی شومیٔ قسمت ہی ہے کہ ہندوستان کے پچاس کروڑ بیٹے غالب کی سو سالہ برسی تو منا رہے ہیں لیکن اردو کو اپنے ملک کی زبان تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں

کچھ دوسرے ایڈیشن کے بارے میں

ہم غالب کو پوری دنیا پر محیط دیکھنا چاہتے تھے ہم ادب کی رفعتوں میں غالب کو تلاش کرنا چاہتے تھے اور ہم خود یہ جاننا چاہتے تھے کہ غالب کون تھے ؟ شبستاں کے اضافہ شدہ غالب نمبر میں ہم نے اپنی ان ہی تمناؤں کی تکمیل کی ہے —— اس میں غالب کا وہ کلام بھی ہے جو دیوانِ غالب میں نہیں تھا، اس میں غالب کے بارے میں کچھ چونکا دینے والے انکشافات بھی ہیں اور اس میں "پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے" کی ایک مکمل تشریح بھی ہے۔

ہمیں پوری امید ہے کہ غالب نمبر کا یہ اضافہ شدہ ایڈیشن اس کہانی کو مکمل کر دے گا جو سابقہ ایڈیشن میں ادھوری رہ گئی تھی۔

—— مدیران

www.taemeernews.com

ملاقاتی

کا

مرزا غالب سے انٹرویو

www.taemeernews.com

ملاقاتی نے یہ انٹرویو مرزا غالب سے عالم تصور میں لیا ہے۔ انٹرویو کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ملاقاتی کے ہر سوال کا جواب مرزا غالب کی اپنی زبان میں ہے اور ملاقاتی نے اس میں اپنی طرف سے ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں کیا ہے۔

میں گلی قاسم جان سے گزر رہا تھا۔

کچھ نئی اور کچھ پرانی عمارتیں نظروں کے سامنے تھیں، پرانی عمارتوں کے در و دیوار پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ کبھی اس گلی میں عظمت و سطوت کے پرچم لہرایا کرتے تھے ——— اسی گلی میں غالب کا مکان بھی تھا۔ مکان نہیں حویلی ——— ایک شان دار حویلی۔

حکیم محمد شریف خاں کی مسجد سے شروع ہونے والی اس گلی کی کہانی پورے ڈیڑھ سو برس کی کہانی ہے ایک ایسی کہانی جس میں غالب بھی جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔

شاہ عالم کا زمانہ تھا بخارہ سے تین بھائی قسمت آزمانے کے لئے ہندستان کی طرف روانہ ہوئے اور دہلی آکر انہوں نے اپنا سفر ختم کر دیا ——— ان میں سے ایک بھائی کا نام قاسم جان تھا اور دوسرے کا نام عارف جان ——— ایک بھائی نے یہ گلی آباد کی اور دوسرا لوہارو اور فیروز پور جھرکہ کا حاکم ہوگیا ——— عارف جان جلد ہی نواب لوہارو کہے جانے لگے چند سال بعد انہوں نے اپنی لڑکی کی شادی آگرہ کے ایک رئیس مرزا نصر اللہ بیگ خاں سے کی۔ آگرہ سے برات آئی ——— یہ برات نہیں آئی تھی غالب کا نام گلی قاسم جان میں داخل ہوا تھا کیوں کر مرزا نصر اللہ بیگ غالب کے چچا تھے۔

اس شادی کے تقریباً پندرہ برس بعد آگرہ سے ایک اور برات اس گلی میں داخل ہوئی۔ دولہا کی عمر صرف پندرہ سال تھی، نام اسد اللہ خاں تھا۔ دلہن نواب لوہارو کے بھائی مرزا الٰہی بخش معروف کی لڑکی امراؤ بیگم تھی۔ اسد اللہ خاں اس گلی میں تقریباً ساٹھ برس رہے۔ یہیں وہ اسد سے غالب ہوئے، یہیں انہیں نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کا خطاب ملا اور یہیں سے ۱۵ فروری ۱۸۶۹ کو ان کا جنازہ اٹھا۔

میں گلی قاسم جان سے گزر رہا تھا ——— میری نظریں عالم تصور میں غالب کے جلوس جنازہ کو اس گلی سے نکل کر جامع مسجد کی طرف، وہاں سے دہلی دروازے کی طرف اور پھر درگاہ حضرت نظام الدین کی طرف بڑھتے دیکھ رہی تھیں ——— یہ جنازہ نہیں جا رہا تھا، ایک تاریخ کا خاتمہ ہو رہا تھا۔

اور میں صرف جنازہ کو ہی نہیں دیکھ رہا تھا ——— میں صرف جنازے کو کندھا دینے والے ہجوم کو ہی نہیں دیکھ رہا تھا میں عالم تصور میں اسی گلی کے ایک حویلی نما مکان میں ایک ستر سالہ بوڑھی عورت کو بیوگی کے آنسو بہاتے بھی دیکھ رہا تھا ——— ابھی ابھی اس عورت نے اپنی چوڑیاں توڑی تھیں اور رنگین دوپٹہ اتار کر ایک سفید دوپٹے سے اپنا سر ڈھکا تھا۔ ٹھیک ایک سال بعد اس عورت کا یہ سفید دوپٹہ بھی سفید کفن میں تبدیل ہوگیا ——— امراؤ بیگم کو غالب کے بغیر قرار نہیں آیا تھا۔

میں عالم تصور میں ڈوبا ہی رہا ——— اور پھر جیسے میرے تخیل نے مجھے سو سال پیچھے ڈھکیل دیا اب میرے سامنے ایک شان دار حویلی سر اٹھائے کھڑی تھی ——— وہ حویلی جس میں غالب کا دل دھڑک رہا تھا۔ میں اس حویلی میں داخل ہوگیا۔

مرزا غالب کی اس حویلی کے دو دروازے تھے ایک مردانہ اور دوسرا زنانہ، بیرونی پھاٹک کے اوپر ایک کمرہ تھا جس کے دونوں جانب دو کوٹھریاں تھیں۔ پھاٹک کے بعد ایک چھوٹا

www.taemeernews.com

سا صحن تھا اور اس کے بعد دالان در دالان بنے ہوئے تھے
صحن پار کرتے ہی میں نے مرزا غالب کو دیکھ لیا۔ وہ اندرونی دالان میں گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے تھے۔

ان پر نظر پڑتے ہی میں ان کی شخصیت میں گم ہو کر رہ گیا۔ وہ انتہائی حسین نظر آ رہے تھے، اونچا قد، چوڑی چکلی ہاڑ، سرخ و سفید رنگ بھری ہوئی داڑھی، سر پر لمبی سیاہ پوستین کی ٹوپی، برکا سفید پیجامہ، ململ کا انگرکھا، اس پر رنگین جامہ دار چغہ ——— قریب ہی حقہ رکھا تھا اور ایک منقش اُگالدان۔

میرے قدموں کی آہٹ پاکر انہوں نے نگاہیں اونچی کر کے میری طرف دیکھا ——— بڑی شگفتگی تھی ان آنکھوں میں ——— میں نے ادب سے سلام کیا اور انہوں نے سلام کا جواب دے کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

دالان واقعی ایک مشرقی رئیس کا دیوان خانہ نظر آ رہا تھا۔ ہر چیز میں نفاست بھی تھی اور شعریت بھی۔

میں نے ان سے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ وہ مسکرائے اور پھر انہوں نے مجھے سوالات کرنے کی اجازت دے دی۔ میں نے پوچھا: "کچھ مجھے اپنے خاندانی حالات بتایئے ———" انہوں نے جواب میں سوچ سوچ کر کہا۔

"۱۲۱۲ ہجری میں پیدا ہوا ہوں۔ میں قوم کا سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا تھا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد میں چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو

غالب کی ایک سادہ سا قلمی تصویر

سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصر اللہ بیگ خاں میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبے دار تھا۔ اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا۔ صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار کا بریگیڈیر ہوا۔ ایک ہزار روپیہ ذات کا، لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر، عین حیات علاوہ سال بھر مرزبانی کی تھی، کہ بمرگ ناگاہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہوا۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔ وہ اب تک پاتا ہوں۔

www.taemeernews.com

غالب زندگی کے آخری دور میں

پانچ برس کا تھا جب باپ مرگیا، آٹھ برس کا تھا جو چچا مرگیا۔"

اپنی تعلیم کے بارے میں انہوں نے کہا۔

"بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھے ملے بارے مراد بر آئی اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبرآباد فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان فارسی کے معلوم کئے۔ اب مجھے اس امر میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔ مگر دعویٰ اجتہاد نہیں ہے۔ بحث کا طریقہ یاد نہیں ہے۔"

اپنا جملہ ختم کرتے ہی انہوں نے اپنی ٹوپی اتاری۔ مجھے ان کا منڈا ہوا سر نظر آیا۔ حیرت زدہ ہو کر میں نے پوچھا "مرزا صاحب آپ نے اپنا سر کیوں منڈا دیا" وہ جواب دینے سے قبل مسکرائے اور پھر انہوں نے کہا۔

"میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آ گئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مستی بھی چھوڑ دی۔ اور داڑھی بھی۔ مگر یاد رکھئے اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے۔ عام ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارا، جولاہا، کنجڑا، مونہہ پر داڑھی، سر پر بال، فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈوا دیا۔"

اپنی شادی کے بارے میں انہوں نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔

"۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی (بیوی) میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔"

میں نے ان کے بچوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"بھائی اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ چوہتر برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے۔ لڑکے بھی لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔"

وہ میرے سوال کا جواب دے رہے تھے اور میں مرزا صاحب کے اس درد کے بارے میں سوچ رہا تھا واقعی اولاد کا نہ ہونا انسان کی سب سے بڑی بدقسمتی ہوتا ہے۔

اب میں نے اُن سے ان کی شاعری کے بارے میں

پوچھا۔ میں نے پوچھا: "آپ نے شعر شاعری کب سے شروع کی"
انہوں نے جواب میں کہا۔

"بارہ برس کی عمر سے کاغذ نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ پچاس برس اسی شیوے کی ورزش میں گزرے۔ ابتدائی سن تمیز تھے اُردو زبان میں سخن سرائی کی۔ بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اس روش پر خامہ فرسائی کی۔ نظم و نثر فارسی کا عاشق ہوں، ایک کم ستر برس دنیا میں رہا۔ اب کہاں تک رہوں۔ ایک اُردو کا دیوان۔ ہزار بارہ سو ابیات، تین رسالے نثر کے۔ یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے۔ اب اور کیا کہوں گا۔ مدح کا صلہ نہ ملا۔ غزل کی داد نہ پائی، ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی۔"

مرزا صاحب کی زندگی کا سب سے دل چسپ حادثہ یہ تھا کہ انہیں ایک مرتبہ قمار بازی کے جرم میں جیل بھیج دیا گیا تھا چناں چہ میں نے جب اس بارے میں ان سے سوال کیا تو انہوں نے کہا۔

"کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجود یہ کہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے۔ میرے بارے میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سشن جج باوجود یہ کہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کا برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا اس نے بھی اغماز اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کہ کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعادِ قید گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آ گیا اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھجوانے پر اس کی بہت تعریف کی۔ سنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے

دیوان غالب کا یہ ایڈیشن غالب کی زندگی میں چھپا تھا

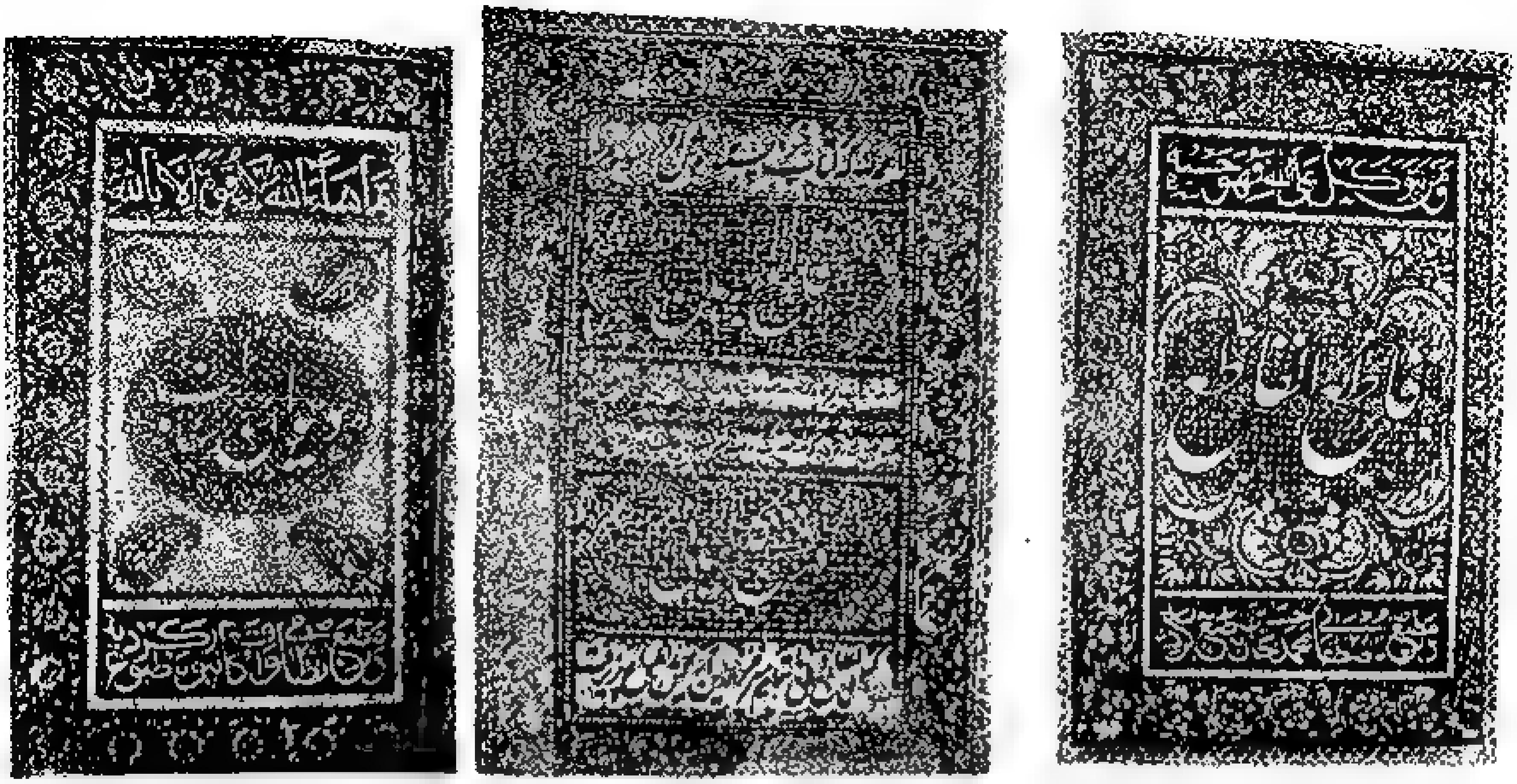

غالب کی تصنیفات کے پہلے ایڈیشنوں کے سرورق

مجسٹریٹ کو بہت منفرہیں کی اور میری خاکساری اور آزردہ حالی سے اس کو مطلع کیا۔ یہاں تک کہ خود بخود اس نے میری رہائی کی رپورٹ بھیج دی۔ میں ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا عین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے، نجات پاؤں اور بغیر اس کے کوئی منزلِ مقصود قرار دوں، سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ مجھ پر گزرا اور یہ ہے جس کا میں آرزومند ہوں۔"

غالب نے اپنی آرزو بیان کی تھی۔ ان کو موت کی آرزو تھی، لوگ جینے کی تمنا کرتے ہیں۔ غالب کو موت کی تمنا تھی۔ میں سوچتا رہا غالب کو موت کی تمنا کیوں ہے؟ کیا اس لئے کہ وہ زندگی سے تھک گئے تھے یا اس لئے کہ ان کو زندگی کا راز معلوم ہو گیا تھا۔

اب میں نے ان سے پوچھا: "آپ گلی قاسم جان کی اس حویلی میں کب سے رہتے ہیں؟" میں نے ان سے یہ سوال اس لئے کیا تھا کہ غالب پہلے کالے صاحب کی حویلی میں رہتے تھے اور اس سے قبل چند ماہ جامع مسجد کے قریب بھی رہے تھے۔ انہوں نے جواب میں کہا۔

"دس گیارہ برس سے اس تنگنائے میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بماہ چار روپیہ دیئے گیا۔ تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو یکمشت دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا۔ جس نے لیا ہے اس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام کیا۔ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو میں اٹھوں۔ بدعہد نے مجھ کو عاجز کیا اور حد لگا دی۔ صحن بالاخانے کا جس کا دو گز عرض اور دس گز طول اس میں باڑھ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سویا، گرمی کی شدت، باڑ کا قرب، گمان یہ گزرتا تھا کہ کٹہرا ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گزریں۔ دوشنبہ ۲۹؍ جولائی کو دوپہر کے وقت ایک مکان ہاتھ آ گیا۔ وہاں جا رہا جان بچ گئی۔ یہ مکان بہ نسبت اس مکان کے بہتر ہے۔ نہ مجھے

غالب کی تصنیفات کے پہلے ایڈیشنوں کے سرورق

مخوفِ مرگ ہے، نہ دعویٰ صبر ہے۔ میرا مذہب بخلاف عقیدہ قدریہ جبر ہے۔ تم نے میاں بخیگری کی۔ بھائی نے برادر پروری کی۔ تم جیتے رہو وہ سلامت رہیں۔ ہم اس حویلی میں تاقیامت رہیں گے۔

لال قلعہ کی عظمت پارینہ سے اپنے تعلق پر میرے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا۔

"دلّی کی سلطنت سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ بادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینہ مقرر کیا تھا۔ ان کے ولی عہد نے چار سو روپیہ سال، ولی عہد اس تقرری کے دو برس بعد مر گئے۔

جب بادشاہ دہلی نے مجھے نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تازہ لکھی مقطع اس کا یہ ہے۔

غالب وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے بخشی ناظر حکیم، کسی سے توقیر کم نہیں مگر فائدہ وہی قلیل۔ اس کا نام "مہر نیم روز" ہے اور سلاطین تیموریہ کی تاریخ ہے اب وہ بات بھی گئی گزری بلکہ وہ کتاب اب چھپانے کے لائق ہے نہ چھپوانے کے قابل ہے۔

اور پھر انہوں نے خود ہی غدر ۱۸۵۷ء کی داستان سنانا شروع کر دی ـــــ انہوں نے کہا۔

"پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچہ صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگرے کھلے رہے ہیں باقی سب اٹ گیا۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا ہے۔

لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر

بیٹھتا ہے جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے پاس سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو،

دہلی میں غالب کا مجسمہ بنایا جا رہا ہے

کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔

کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں؟ دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز بازار مسجد جامع کا۔ ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو۔ دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔

مسجد جامع واگذاشت ہو گئی۔ چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں میں کبابیوں نے دوکانیں بنالیں۔ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگے۔ عشرہ مبشرہ یعنی دس آدمی مہتمم ٹھہرے۔ مرزا الٰہی بخش، مولوی صدرالدین، تفضل حسین خاں ابن فضل اللہ خاں تین یہ اور سات اور۔ ۷ نومبر ۱۴ جمادی الاوّل سال حال جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے رہا ہوئے

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

یہاں شہر ڈھے رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار، اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا۔ اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ کشمیری کٹڑہ گیا۔ وہ اونچے اونچے در اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں دور دور یہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں۔ آہنی سڑک کا آنا اور اس کی رہ گزر کا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے۔

لو سنو تمہاری دلّی کی باتیں ہیں۔ چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا۔ اس میں سنگ و خشت و خاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلّی ماروں کے دروازے کے پاس کی کئی دوکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان صاف ہو گیا۔ پنجابی کٹڑہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت کا کٹڑہ، جرنیل کی بیوی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی

غالب کی یہ تصویر لکھنؤ کے ایک مصور نے ان کی موت کے بعد بنائی تھی

[illegible] قلمی تصویر

ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر کہ شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے۔ پون ٹوٹی کوئی چیز ہے وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔

جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا دوکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ دارالبقا فنا ہو جائے گا۔ رہے نام سدا اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کے بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑا چل رہا ہے۔

اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے دیکھے فارسی عبارت یہ ہے:

ٹکٹ آبادی درون شہر دہلی بہ شرط ادخال جرمانہ

وہ یہ داستان سنا رہے تھے اور میں ان کے چہرے پر ایک غبار سا چھایا دیکھ رہا تھا۔ ماضی کی ان تلخ یادوں نے غالب کو بے قرار سا کر دیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں غم کی گھٹائیں سی امنڈ آئی تھیں۔

نواب رام پور سے اپنے تعلق کے بارے میں انہوں نے کہا۔

" نواب یوسف علی خاں بہادر والی رام پور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں اس سال یعنی ۱۸۵۵ء میں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔ میں پچیس غزلیں اردو کی بھیجتے ہیں۔ اصلاح دے کر بھیج دیتا، گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری، انگریزی پنشن کھلا ہوا ان کے عطایا فتہ گنے جاتے تھے جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگانی کا مدار ان کے عطیے پر رہا۔ بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے میں عذر کرتا تھا۔"

میں نے پوچھا: "آج کل آپ کی صحت کیسی ہے۔" جواب

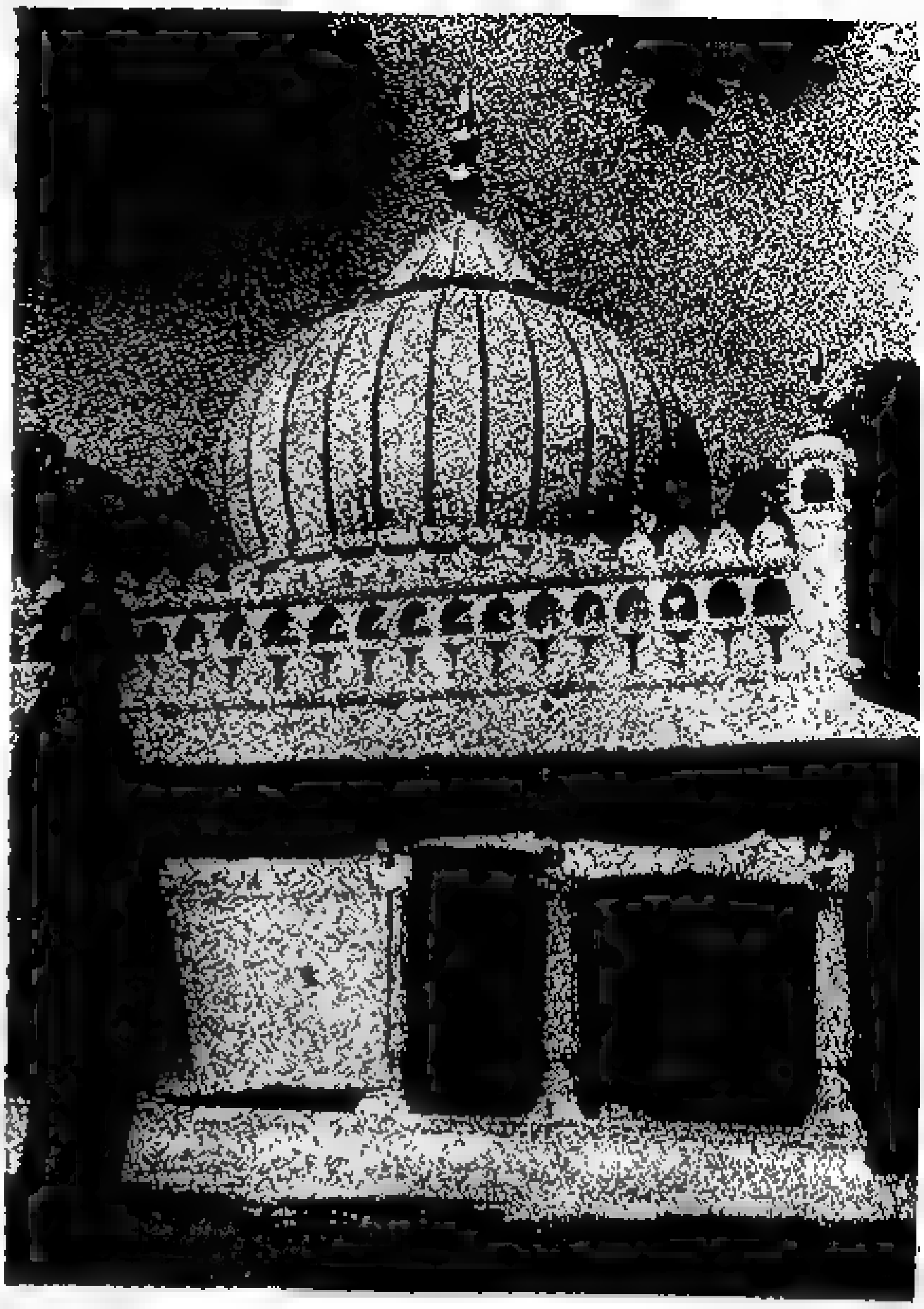

درگاہ حضرت نظام الدین جس کے سائے میں غالب دفن ہوئے۔

میں ان کے لبوں پر ایک مایوس مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر انہوں نے کہا۔

"ناتوانی زوروں پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر در پیش ہے، زادِ راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں اگر ناپرسیدہ بخشند یا تو خیر، اگر بازپُرس ہوئی تو سقر مقر ہے، ہاویہ زاویہ ہے، دوزخ جاوید اور ہم ہیں۔

اس تین برس میں ہر روز مرگِ نَو کا مزہ چکھتا رہا ہوں حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں۔ پھر میں کیوں جیتا ہوں۔ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ حواس کھو بیٹھا، حافظہ کو رو بیٹھا۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں کہ جتنی دیر میں ایک قدِ آدم دیوار اٹھے۔ آگے ناتواں تھا اب نیم جاں ہوں۔ آگے بہرہ تھا اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رعشہ، ضعفِ بصر، جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں۔ حروف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتّر برس جیا اب زندگی برسوں کی نہیں۔ مہینوں اور دنوں کی ہے۔ میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں میرے ہمسایوں سے پوچھنا۔

دم واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے"

مرزا غالب اس کے بعد خاموش ہو گئے —— ان کی اس طویل خاموشی سے اکتا کر میں کچھ اور پوچھنے والا تھا کہ اچانک میری آنکھوں کے سامنے سے سب کچھ غائب ہو گیا —— کسی نے مجھے دوبارہ حال کی دنیا میں واپس دھکیل دیا تھا۔

غالب کی حویلی اب بھی میرے سامنے کھڑی تھی ——

غالب کی ایک اور قلمی تصویر

مدفن غالب کی نئی عمارت بننے کے بعد وہاں ایک افتتاحی مشاعرہ ہوا تھا

غالب کی تحریر کا ایک عکس

لیکن اب اس بوڑھی حویلی کے صرف کھنڈر باقی تھے۔ میں دیر تک پرانی اینٹوں کے اس ڈھیر کی طرف دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ ۱۵ فروری ۱۹۶۹ کو ہم غالب کی صد سالہ برسی منا رہے ہیں —— دنیا میں برسی پر اظہار غم کیا جاتا ہے لیکن ہم ۱۵ فروری کو غالب کا جشن موت منائیں گے، ڈرامے دکھائیں گے، قوالیاں گائیں گے، مشاعرے کریں گے —— اور وہ سارے کام کریں گے جو خوشی اور مسرت کے موقع پر کیے جاتے ہیں۔

سو سال پیشتر ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو غالب کا جنازہ اٹھا تھا —— سو سال بعد ہم ان کے مرنے کا جشن منائیں گے —— اے کاش ہم ان کے مرنے کا جشن منانے کے بجائے ہر سال ۲۷ دسمبر کو ان کی پیدائش کا جشن مناتے —— اور یا پھر ۲۷ دسمبر ۱۹۹۶ کو ان کا سو سالہ جشن ولادت مناتے۔

میں دیر تک وہاں کھڑا رہا اور گلی قاسم جان کی زندگی میرے چاروں طرف بہتی رہی۔

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اُس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر
آہ! تو اُجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں!
آہ! اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں!
گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

اے جہاں آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

بہادر شاہ ظفر

غدر ۱۸۵۷ء میں غالب پر کیا بیتی

۱۲ ستمبر کو لوگ خبر لائے کہ لوٹ مار کرنے والے بھائی کے گھر پر چڑھ دوڑے۔ گئی اور گھر میں لوٹ مار کی، دیوانے بھائی مرزا یوسف اور دونوں بڑھیا بڈھوں کو زندہ چھوڑ دیا، اس افراتفری میں دو ہندو کہیں سے آ کر پناہ گزیں ہوگئے۔ بوڑھے دربان اور بڑھیا کنیز، دونوں نے ان ہندوؤں کی مدد سے کھانے پینے کے انتظام کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، واضح ہو کہ اس پکڑ دھکڑ اور قیامت کے عالم میں جس طرح ہر کوچے اور بازار میں اس مصیبت کی صورت یکساں نہیں ہے۔ اس طرح قتل کرنے اور لوٹ مار میں بھی سب سپاہیوں کا انداز یکساں نہیں ہے، اگر ایک سپاہی رحم کرتا ہے تو دوسرا سپاہی

جب غالب کی قبر پر مقبرہ نہیں بنا تھا۔

سختی، بات ساری ذاتی رحم دلی اور سنگ دلی کی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اس یلغار میں حکم یہ ہے کہ جو شخص اظہارِ اطاعت کرے اُس کو قتل نہ کیا جائے۔ مال چھین لیا جائے۔ مقتولین کے متعلق خیال ہے کہ انہوں نے یقیناً اطاعت نہیں کی اس وجہ سے اُن کو قتل کر دیا گیا۔ مشہور بھی یہی ہے کہ عموماً سامان لوٹ لیتے ہیں، قتل نہیں کرتے بہت کم ایسا ہوا ہے اور وہ بھی صرف دو تین کوچوں میں کہ پہلے قتل کر دیا اور پھر سامان لوٹ لیا۔ بوڑھوں، عورتوں اور بچّوں کا قتل روا نہیں رکھا۔

اس مقام پر پہنچ کر توسن خامہ رُک گیا، اب میں ایک پُر زور آواز بلند کروں کہ سمندِ قلم آگے بڑھائے۔ اے انصاف کی تعریف کرنے والے اور ظلم کو بُرا کہنے والے حق پرستو! اگر ظلم کی مذمت اور انصاف کی تعریف میں تمہاری زبان اور تمہارا دل ایک ہے تو خدا کے واسطے ہندوستانیوں کا طرزِ عمل یاد کرو اِس کے بغیر کہ پہلے سے دشمن کی کوئی بُنیاد اور عداوت کا کوئی سبب ہو، ہندوستانیوں نے اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اُٹھائی۔ بے چاری عورتوں اور گہوارے میں کھیلتے ہوئے بچّوں کو قتل کر ڈالا۔ حالاں کہ سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بے وفائی کرنا گناہ ہے، اُن کے مقابلے میں اُن انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی کا بدلہ لینے کے لئے لڑنے اُٹھے، اور گناہگاروں کو سزا دینے کے لئے لشکر آراستہ کیا تو موقع تھا کہ قابض ہونے کے بعد کُتّے اور بلّی تک کو زندہ نہیں چھوڑتے، لیکن اُنہوں نے ایسا نہیں کیا، اُن کے سینے میں غضب کی آگ بھڑک رہی تھی، لیکن اُنہوں نے عورتوں اور بچّوں کو ذرا نہیں ستایا۔ جان و مال اور گھر بار محفوظ رہنے کی ذمّے داری نہیں لی گئی تو اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ بے گناہوں اور گناہ گاروں میں امتیاز رہے۔ جن لوگوں کو باز پرس کے لئے بُلایا گیا تھا اُن کے علاوہ اور کسی کو حاضر ہونے کی زحمت نہیں دی۔

شہر کے بیش تر لوگوں کو باہر نکال دیا ہے، کچھ لوگ بدستور امید و بیم میں گرفتار شہر کے اندر موجود ہیں۔ جو لوگ شہر سے نکل کر ویرانوں اور جنگلوں میں پناہ گزیں ہوئے ہیں اُن کے بارے میں ابھی کوئی حکم صادر نہیں ہوا ہے۔ کاش شہر کے اندر بسنے والے اور شہر کے باہر رہنے والے دونوں ایک دوسرے کی موت اور زندگی سے واقف ہوتے، بس یہ جاننا کافی ہے کہ جو جس جگہ ہے، پریشان اور دل گرفتہ ہے۔

۵ اکتوبر کا دن مصیبت کا دن تھا، دوپہر کے وقت اچانک چند انگریز اس دیوار پر چڑھ گئے جو بند کردہ دروازے سے ملی ہوئی تھی، پھر اس دیوار پر سے کود کر گلی میں داخل ہو گئے۔ راجہ نریندر سنگھ کے سپاہیوں نے اُن کو روکنے کی کوشش کی، لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ پھر اُن انگریزوں نے چھوٹے چھوٹے مکانوں کو نظر انداز کر کے میرے مکان کا رُخ کیا اور میرے گھر میں گھس پڑے۔ انہوں نے میری کسی بھی

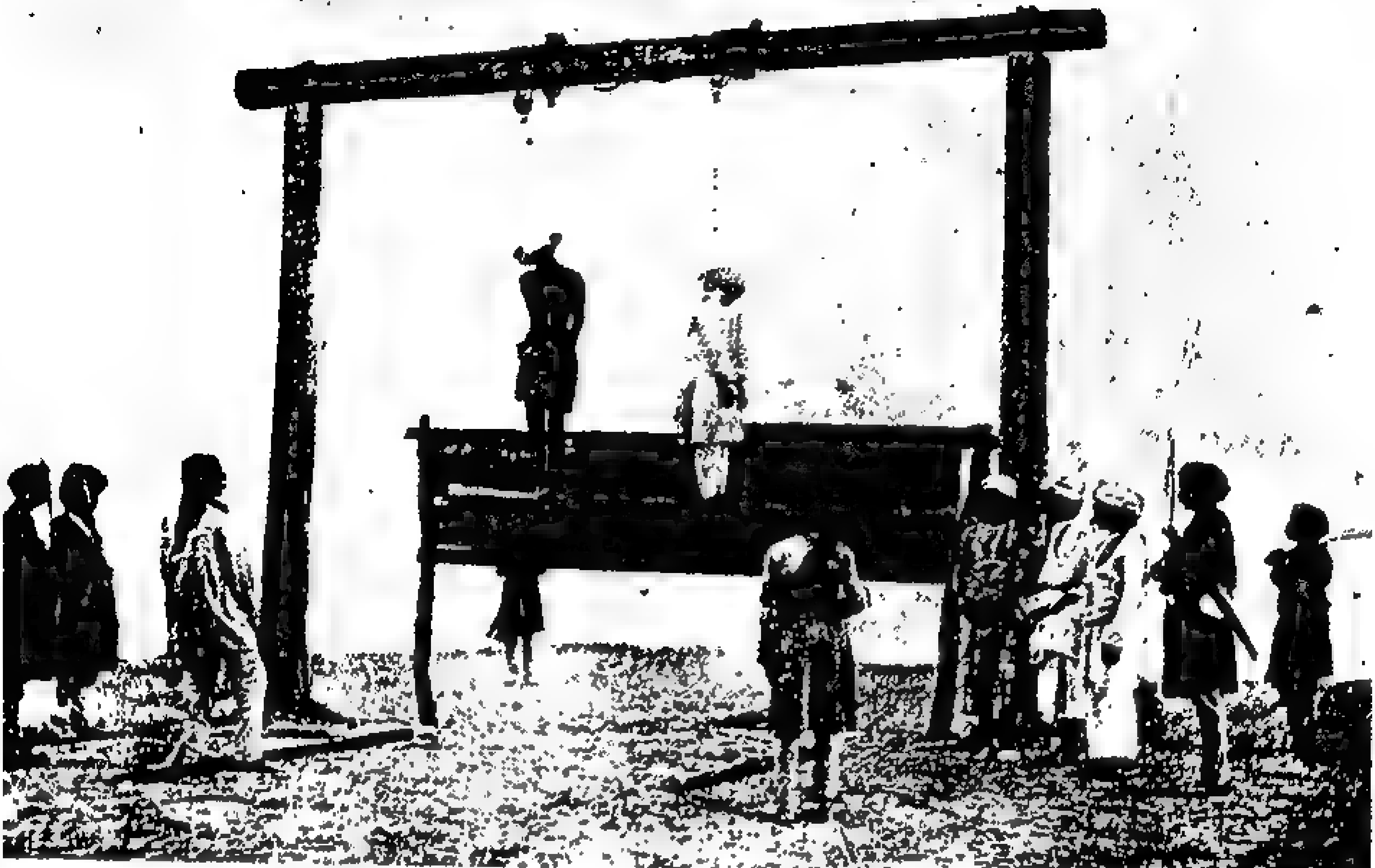

غدر میں مجاہدینِ آزادی کو سرِ عام پھانسی دی جاتی تھی۔

چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائی، صرف اتنا کیا کہ مجھے میرے دونوں بچوں، دو تین ملازموں اور چند نیک کردار پڑوسیوں کو پکڑ کر دو فرلانگ تک پیدل چلا کر کرنل براؤن کے حضور میں پیش کیا، جو قطب الدین سوداگر کی حویلی میں مقیم تھے، کرنل براؤن نے میرے ساتھ انتہائی مہذب اور شریفانہ طریقے پر بات چیت کی، مجھ سے نام اور پیشے کے متعلق پوچھا، خوش اسلوبی کے ساتھ جانے کی اجازت دی، میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور با اطمینان لوٹ آیا۔

۷ اکتوبر کو شام کے وقت ۲۱ توپوں کی آواز نے قوتِ سامعہ کو نوازا۔ میں سوچنے لگا کہ لفٹنٹ گورنر بہادر کے آنے پر سترہ توپوں کی سلامی سے استقبال کیا جاتا ہے، ۲۱ توپوں کی ہوش افزا سلامی کی وجہ کیا ہے، دوسرے دن بھی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے کہ انگریزوں کو کسی دوسری جگہ باغیوں پر فتح ہوئی تھی جس پر انہوں نے اکیس توپوں کی سلامی سے اپنے جشنِ مسرت کا آغاز کیا۔ واضح رہے کہ ابھی باغیوں کے بہت سے گروہ بریلی، فرخ آباد اور لکھنؤ میں جگہ جگہ شورش پھیلانے اور انگریزوں کا مقابلہ کرنے کی ناکام کوششوں میں مصروف ہیں۔

ادھر سونہہ اور نوہ کے علاقے میں بلوائیوں نے بے طرح شورش برپا کر رکھی تھی جیسے دیوانے زنجیروں سے آزاد ہو گئے ہوں۔ سیتارام شورش پسند کچھ دنا تک لوہاری میں ہنگامہ آرا رہا، پھر شیطان کی رہنمائی سے بلوائیوں سے مل گیا، یہ گروہ میدانوں اور پہاڑوں میں انگریزوں سے برسرِ پیکار رہے۔ ان غم انگیز حالات میں آنکھوں نے رونے کے علاوہ کچھ اور دیکھا ہو تو اندھی ہو جائیں۔

جس دن انگریز مجھ کو پکڑ کر لے گئے تھے، اس دن کے

دہلی کے محاصرہ کے بعد انگریزوں سے مجاہدینِ آزادی کی جنگ

علاوہ چوکھٹ پہ قدم رکھنا، گھر سے باہر نکلنا، گلی یا بازار میں چلنا، یا دوسرے چوک کو دیکھ لینا نصیب نہیں ہوا ہے، میں کچھ نہیں جانتا ہوں کہ دنیا میں کیا اچھائی ہو رہی ہے اور کیا برائی، مجھ کو تو یہ سوچنا چاہیے کہ میں مر چکا ہوں۔ مجھ کو باز پرس کے لیے اٹھایا گیا اور سزائے اعمال بد کے نتیجے میں دوزخ کے کنویں میں لٹکا دیا گیا ہے، اس قید میں بے چارگی اور پریشانی کے ساتھ ہمیشہ جینا پڑے گا۔

۹ اکتوبر کو کم بخت دربان میرے بھائی مرزا یوسف کے مرنے کی خوش خبری لایا، کہتا تھا کہ وہ گرم رفتار تھا پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہ کر آدھی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت ہوگیا، پانی، کفن، غسال، گورکن، اینٹ، چونے، گارے وغیرہ کا کیا ذکر، یہ بتاؤں میں اس تک کیسے جاؤں، میت کو کہاں لے جاؤں کس قبرستان میں سپردِ خاک کروں۔ بازار میں اچھا برا کسی بھی قسم کا کپڑا کفن سے دستیاب نہیں، زمین کھودنے والے مزدور ناپید ہوگئے، ہندوؤں کو آسانی ہے کہ وہ اپنے مردوں کو نذرِ آتش کر سکتے ہیں، لیکن مسلمانوں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ دو تین کی تعداد میں گذر سکیں، چہ جائے کہ میت کو شہر سے باہر لے جائیں۔

پڑوسیوں نے میری تنہائی پہ رحم کیا اور اس کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہوگئے، پٹیالہ کے ایک سپاہی کو آگے کیا، دو نوکروں کو ساتھ لیا اور چل دیے۔ میت کو غسل دیا، دو تین سفید چادریں گھر سے لیں، ان میں لپیٹا اور اس مسجد میں زمین کھود کر دفن کر دیا جو گھر کے برابر تھی، افسوس کہ میرا بھائی ساٹھ سال کی عمر میں تیس سال شاد رہا اور تیس سال ناشاد، اے خدا اس مرنے والے پر رحم کر کہ اس نے زندگی میں آرام کی صورت نہیں دیکھی۔ اس نیک سرشت لیکن بدقسمت شخص نے زندگی کے ساٹھ سال خوش اور ناخوش گزارے، تیس سال ہوش مندی کے ساتھ اور تیس سال دیوانگی کے عالم میں۔ ۲۹، صفر ۱۲۷۴ھ کی شب کو مر گیا۔

ایک شخص نے مجھ ستم رسیدہ سے مرزا یوسف کی تاریخ وفات پوچھی، جس نے اس دنیا میں اپنے سے بیگانہ ہو کر زندگی گذار دی، میں نے ایک سرد آہ کھینچی اور کہا "دریغ دیوانہ" واضح ہو کہ دریغ دیوانہ سے ۱۲۹۰ عدد حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے آہ کے ۱۶ عدد نکال دیے جائیں تو ۱۲۷۴ رہتے ہیں جو مطلوب ہیں۔

غالب کے سفر

مرزا سجاد علی خاں اختر

ایک مدت مرزا اسداللہ خاں غالب کا تعلق لکھنؤ سے رہا۔ ان کے والد بزرگوار مرزا عبداللہ بیگ نواب آصف الدولہ فرماں روائے اودھ کے ملازم رہے۔ نواب سے نہ بن سکی اس لئے لکھنؤ چھوڑ کر حیدر آباد چلے گئے۔ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ جس طرح باپ کو راس نہ آیا اسی طرح بیٹے کے لئے بھی یہاں کا ماحول کبھی سازگار نہ ہو سکا۔

جس وقت مرزا صاحب کی مالی حالت خراب ہوئی ریاست فیروز پور جھرکا کی پنشن بھی بند ہو گئی۔ پریشان حالی نے دامن پکڑا۔ قرض خواہوں نے گھر گھیرا۔ چھوٹے بھائی کی دیوانگی نے دیوانہ بنایا تو دہلی چھوڑ کر کلکتہ کا سفر اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔

۱۸۳۶ء اور ۳۷ کے لگ بھگ میں غالب لکھنؤ آئے۔ کہتے ہیں کہ موصوف یہاں ٹھہرنے کے ارادے سے نہ آئے۔ اس امر خاص پر کوئی مضبوط دلیل نہیں دی جا سکتی کیوں کہ کلکتہ کے سفر کی تفصیل میں لکھنؤ کے قیام پر بہت زیادہ نہیں لکھا گیا ہے۔ بہرحال جب دلی لٹی۔ دربار شاہی کی بہاریں مبتدل بخزاں ہوئیں۔ رؤسا و امرائے شہر کی زندگیوں میں انقلاب آیا تو جیسے شہر کے فن کاروں کو وطن چھوڑ کر تلاشِ معاش میں رواں دواں ہونا پڑا اسی طرح شاعروں، افسانہ نگاروں۔ موسیقاروں۔ اور دوسرے ادیبوں اور مفکروں کو بھی غریب الوطنی اختیار کرنا پڑی۔ حکومت کی تبدیلی کے بعد حالات بھی بدلے۔ شاعروں میں نہ ذوقؔ کو شاہ کی استادی کا فخر رہا نہ مرزا صاحب کو روسائے دہلی کی جنبہ داریوں پر ناز۔ جس طرح عوام پر بدلتے ہوئے ماحول کا اثر ہوا اسی طرح مرزا

اسداللہ خاں غالب بھی زمانہ کی گردشوں کا شکار ہوئے۔ ہر طرف سے راہ چارہ مسدود ہوئی۔ نفس نے تنگی کی۔ دماغ منتشر ہوا۔ تو سفر پر کمر باندھی۔ اپنی بے کسی کا عالم مرزا صاحب نے خود اپنے ایک خط میں تحریر کیا ہے:

"ہنگامۂ دیوانگی برادر یک طرف و غوغائے
دام خواہاں یکسو۔ آشوبے پدید آمد۔ چناں
جہاں تنگ گشتگی و عالم و عالم خستگی با خود گرفتم ....."

زندگی کے ان ہی مصائب نے مجبور کیا کہ وہ کلکتہ کا سفر اختیار کریں۔ شاید اس سفر ہی سے تکلیفیں دور ہو جائیں۔

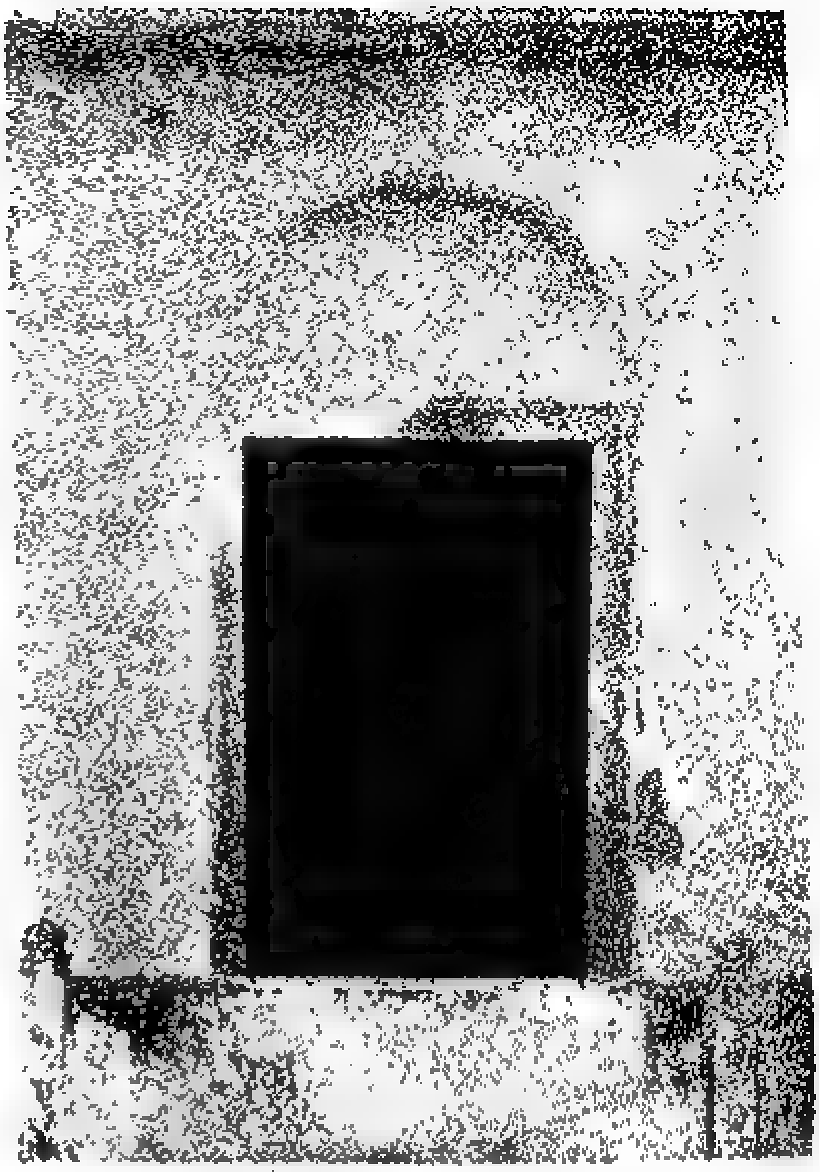

بنارس کا وہ کمرہ جس میں غالب ٹھہرے تھے ۔

سفر کا کوئی مخصوص پروگرام تو بن نہ سکا۔ سب کو خدا پر چھوڑا اور بسم اللہ کہہ کر گھر سے نکل پڑے۔ منزلیں طے کرتے ہوئے تھکے ماندے کانپور تک آئے تو سوچا کر کچھ دن آرام کیا جائے۔ پھر کچھ ذہن میں آیا تو لکھنؤ کی جانب رُخ کیا۔ اودھ سے چونکہ رشتہ دیرینہ تھا۔ پدر بزرگوار کی اچھی خاصی زندگی یہاں گذر چکی تھی۔ گو شاہی دور میں تبدیلی ہو چکی تھی آصف الدولہ سا سخی دنیا سے اُٹھ چکا تھا لیکن سخن پرستی اور ادب نوازی میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی دولت کی فراوانی کا وہی عالم تھا جو آج سے تیس سال پہلے تھا۔ ادیب اور شعرا لکھنؤ آتے جاتے رہے .... مگر نہ جانے کیوں دربار شاہی سے ان کا توسل کبھی مضبوط نہ ہو سکا۔ نواب آصف الدولہ کے دور میں میر تقی میسّر آئے۔ نواب سے مدت تک انھیں خاصی نزدیکی رہی لیکن چونکہ خوددار تھے اک روز فنِ شاعری کے کسی مسئلہ پر ردوقدح ہوئی.... میر صاحب نے دربار کو سلام کہا۔ فاقہ گوارا کیا لیکن ذلت کی روٹی گوارا نہ کی۔ دردر کی ٹھوکریں کھائیں مگر دربار کا کبھی رُخ نہ کیا۔ غالب کے پدر بزرگوار مرزا عبداللہ بیگ کا بھی یہی حشر ہوا۔ نواب وزیر آف اودھ کی نازک مزاجی برداشت نہ ہو سکی۔ اس لئے ترک ملازمت کے بعد لکھنؤ چھوڑ کر حیدرآباد سدھارے۔

مرزا صاحب کے لکھنؤ آنے کے بہت سے اسباب ہیں لیکن یہ امرِ واقعہ ہے کہ جب وہ دہلی سے کانپور پہنچے تو یک بارگی خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھ لیا جائے۔ چنانچہ پچاس میل کا سفر بھی برداشت کیا اور افتاں و خیزاں شہر میں پہنچ گئے۔ باشندگان لکھنؤ کا ذوق شاعری اس وقت اپنے پورے عروج پر تھا۔ فرماں روایانِ اودھ کو فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی۔ شاعری اور موسیقی دونوں کا خواص اور عوام میں دور دورہ تھا۔ رؤسا اور امرا خود بھی شاعر تھے اور اساتذہ کا احترام بھی کرتے تھے۔ شاہی محلوں میں بیگمات اور شاہ زادیاں بھی شعر و شاعری پر جان دیتی تھیں۔ مثل مشہور ہے کہ رعایا اپنے حکمراں کی پیروی کرتی ہے۔ لکھنؤ کی رئیس زادیوں نے بھی شاہ زادیوں کی دیکھا دیکھی موسیقی اور شاعری دونوں کو خوب خوب اپنایا۔ نواب آصف الدولہ اور ان کی بیگم شمس النسا بیگم کی شاعری کے چرچے جب بیرون محل آئے تو پھر کیا تھا مردوزن میں نہ صرف ذوقِ شاعری نے جنم لیا بلکہ فنِ شاعری نے عروج کی منزلیں طے کرنا شروع کیں مشہور ہے کہ شمس النسا بیگم صاحب دیوان بھی تھیں ان کی ایک جوابی غزل کے چند شعر اُس وقت کے معیار کا پتہ دیتے ہیں اپنے شوہر کی غزل کے جواب میں وہ فرماتی ہیں ؎

خوشی دل میں ہم اپنے کم دیکھتے ہیں
اگر دیکھتے ہیں تو غم دیکھتے ہیں

صدر جمہوریہ مدفن غالب پر

نہ قطرہ کوئی خوں کا باقی ہے دل میں
نہ آنکھوں کو ہم اپنی نم دیکھتے ہیں
تو آئے نہ آئے یہاں ہم تو ہر شب
پڑے راہ تا صبح دم دیکھتے ہیں

لکھنؤ میں اُردو شاعری کی جانب عام رجحانات کی خبریں اکثر مرزا صاحب کو دلی پہنچا کرتی تھیں۔ اس حالیہ سفر میں ہو سکتا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ خیال آیا ہو کہ سرزمین لکھنؤ اُن کے مراتب کے لحاظ سے اُن کو خوش آمدید کہے گی اور وہاں کے باشندے بلاتفریق دولت و غربت ان کے شایانِ شان اُن کا خیر مقدم کریں گے۔ ایسا ہی ہوا بھی۔ یہ بادشاہ نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا۔ شاہی خزانہ بھرا پڑا تھا۔ زر و جواہرات کے انبار تھے۔ خزانہ میں دس کروڑ روپے جمع تھے۔ بادشاہ کی جوانی تھی، ۲۵ سال کی عمر تھی اور اودھ کی شاہی تھی تو جوان خیالات میں بھی جوانی آئی۔ بہت سے نیک کام بھی کئے۔ شاعری اور موسیقی دونوں کے ربط باہمی کی نظیر ان کے دربار سے شروع ہوئی اور آخری تاجدار اودھ نواب واجد علی شاہ بہادر پر ختم ہوئی۔ افتخار الدولہ مہاراجہ میوہ رام بادشاہ نصیر الدین حیدر کی ناک کا بال تھے۔ اردو شاعری سے بڑا شغف تھا۔ جب مرزا غالب کی آمد کی خبر ان تک پہنچی تو نام سن کر بے چین ہو گئے ایک ایک سے کہا: "بھائی کوئی جائے اور اس ادیب کامل کو مجھ تک تو لائے......" لوگوں نے مرزا صاحب تک مہاراجہ کا پیغام تو پہنچایا مگر نہ جانے کیوں مرزا صاحب نے مہاراجہ تک جانے کی تکلیف برداشت نہ کی۔ کسی نامعلوم ذریعہ بادشاہ کے نائب روشن الدولہ تک رسائی کی جدو جہد کی۔ چونکہ قلمدان وزارت روشن الدولہ ہی کے پاس تھا اس نے خطاب دلانے کا وعدہ بادشاہی تک پہنچنے میں ان ہی کا ذریعہ تلاش کرتے ہوں اور ان ہی کے در کی کنجی کھٹکھٹا رہے

غالب کا ایک بڑا یادگاری ٹکٹ

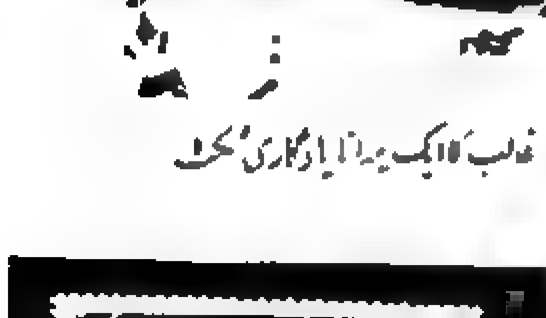

غالب صد سالہ برسی پر جاری
ہونے والا ڈاک ٹکٹ

محلہ راج دوارہ رام پور کا ایک مکان جہاں غالب رہتے تھے۔

مراد کو پہنچے ہوں۔ مرزا صاحب کو بھی روشن الدولہ کی چوکھٹ پر آنا پڑا۔ وہ آئے اور بادشاہ نصیر الدین حیدر کی شان میں قصیدہ بھی کہہ کر لائے۔ مگر وزیر اعظم نے بڑی بے اعتنائی برتی اس لئے ان کا یہ شاہکار بادشاہ کی خدمت میں نہ پہنچ سکا۔ یہ وہ وقت تھا جب اردو زبان کے سلسلہ میں دہلی اور لکھنؤ کی رقابت حدوں سے گذر چکی تھی۔ شاید اسی وجہ سے روشن الدولہ نے غالب کا دربار شاہی تک پہنچنا گوارا نہ کیا ہو۔ قصیدہ پیش کرنا تو درکنار بادشاہ کو ان کی آمد تک کی اطلاع نہ دی۔ مرزا صاحب

نرے کھرے شاعر ہی نہ تھے۔ علم مجلس کے علاوہ علم نفسیات میں بھی دخل تھا۔ بڑے قیافہ شناس تھے اپنی ناکامی کے اسباب تک دماغ نے فوراً رسائی کی اور پھر پریشانیوں کے عالم ہی میں قصیدہ تو نہ ہو سکا مگر ایک مدحیہ نثر نائب سلطنت کی شان میں کہی جو صنعت تعلیل کا بہترین نمونہ کہی جاتی ہے لیکن وہ نثر بھی وزیر اعلیٰ تک نہ پہنچ سکی۔ بعض محققوں کا یہ کہنا ہے کہ مرزا صاحب نے اس نثر کے پیش کرنے اور روشن الدولہ سے ملاقات کرنے کی دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں۔ ایک یہ کہ نائب میری تعظیم دیں۔ دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جائے۔ عام لوگوں نے لکھنؤ میں مرزا صاحب کی وزیر اعظم تک رسائی میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ ان کی ایک دعوت خود روشن الدولہ کے محل میں کی گئی تاکہ وزیر اعظم سے اس شاعر نامدار کا تعارف ہو سکے مگر نہ جانے غالب کا ستارہ اس وقت کس برج میں تھا کہ کسی پہلو بھی کامیابی کی جھلک نہ مل سکی۔ آخر گھبرا کر لکھنؤ چھوڑا اور مزید کچھ کہے سنے کلکتہ روانہ ہو گئے۔

لکھنؤ کے قیام کا تذکرہ بالتفصیل کہیں نہیں ملتا نہ جانے یہاں کے بزرگوں نے کسی کی کہی ہوئی کہہ ڈالی کہ "بہار اجبہ میوہ رام سے جب نہ بنی تو مرزا صاحب حسین آباد میں نواب سالار جنگ بہادر کے کسی بیٹے پوتے کے مہمان ہوئے۔ اور جب ہر طرف سے مرزا جی پر ناکامی کی بوچھار ہوئی تو حسین آباد بھی چھوڑا اور کچھ دنوں لکھنؤ کی گلیاں چھانتے رہے ....." یہ بات من گھڑت ہی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ کلکتہ کا مسافر سیکڑوں میل کا جب جب اختیار کرے گا تو ایسے ساز و سامان کے ساتھ گھر سے قدم باہر نکالے گا کہ راہیں تنگ نہ ہونے پائیں اور منزل ہاتھ آجائے۔ کہنے والے نے شاید غلط فہمی میں یہ سب کچھ کہہ دیا اور شاید اس نے میر تقی میر پر گذری ہوئی داستان غالب پر منطبق کر دی یہ تو کہیں جگہ ملتا ہے کہ ان کے لئے مشاعرے منعقد کئے گئے جہاں شعر و سخن کی تقریبیں نہایت شائستہ طور پر منائی گئیں۔ رئیس زادوں نے ان کی دعوتیں

کیں۔ اُن کے فن کو سراہا۔ ان کی شاعری کا لوہا مانا۔ یہ دعوتیں اور دوسری نشستیں زیادہ مشہور تو نہ ہو سکیں لیکن بعض جگہ ان کے لطیفے اور چٹکلے ایسے پسند کئے گئے کہ ان کے مزاج کی لطافتوں نے اکثر کے دلوں میں گھر کر لیا۔ ان جلسوں اور محفلوں کا ذکر کہیں کہیں "لکھنؤ کا سفر اور وہاں کے باشندوں کے اخلاقی مظاہرے" کے عنوان سے ملتا ہے۔ مگر ان سب کی تفصیل سوانح غالب میں کہیں نہیں ملتی۔

کہتے ہیں کہ کلکتہ سے واپسی پر مرزا صاحب نے لکھنؤ میں قیام کر کے پھر کوشش کی کہ وہ قصیدہ جو نواب نصیر الدین حیدر کی شان میں کہا تھا اسے کسی نامعلوم دوست کے ذریعہ دربار تک پہنچا دیا جائے چنانچہ قصیدہ بادشاہ تک پہنچا جس پر پانچ ہزار روپے بطور صلہ ملنے کا حکم ہوا مگر یہاں بھی درباری رقابت کارفرما ہوئی۔ شیخ امام بخش نے مرزا کو لکھا:

"پانچ ہزار ملے تھے۔ تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے اور یہ دو ہزار بچے ہیں جو آپ کو ارسال ہیں۔"

ان دو ہزار میں سے بھی متوسط سے شیخ نے کہا "اس میں سے جو تم چاہو لے سکتے ہو۔" مرزا صاحب کو جب یہ خبر پہنچی تو انہوں نے اس توہین کو برداشت نہ کیا اور واقعات کو بادشاہ کے حضور پہنچانے کی مہم شروع کی۔ ابھی یہ تحریک بار آور نہ ہونے پائی تھی کہ نواب نصیر الدین حیدر کا ۱۸۳۷ء میں انتقال ہو گیا۔ اور مرزا بے نیل و مرام دلی واپس چلے گئے۔

غالب نے لکھنؤ کے علاوہ اور بھی کئی سفر کئے تھے چنانچہ ڈاکٹر حکم چند نیر نے لکھا ہے کہ مرزا غالب کو سیر و تماشا کی ہوس رہتی اُن کی اُفتاد طبع بھی کچھ ایسی ہی تھی کہ ذرا سی تکلیف اُن کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی تھی۔ اگرچہ وہ اپنے میں طاقت رنج سفر اور یاران وطن کی جدائی کا حوصلہ نہیں پاتے تھے لیکن کچھ تو حالات

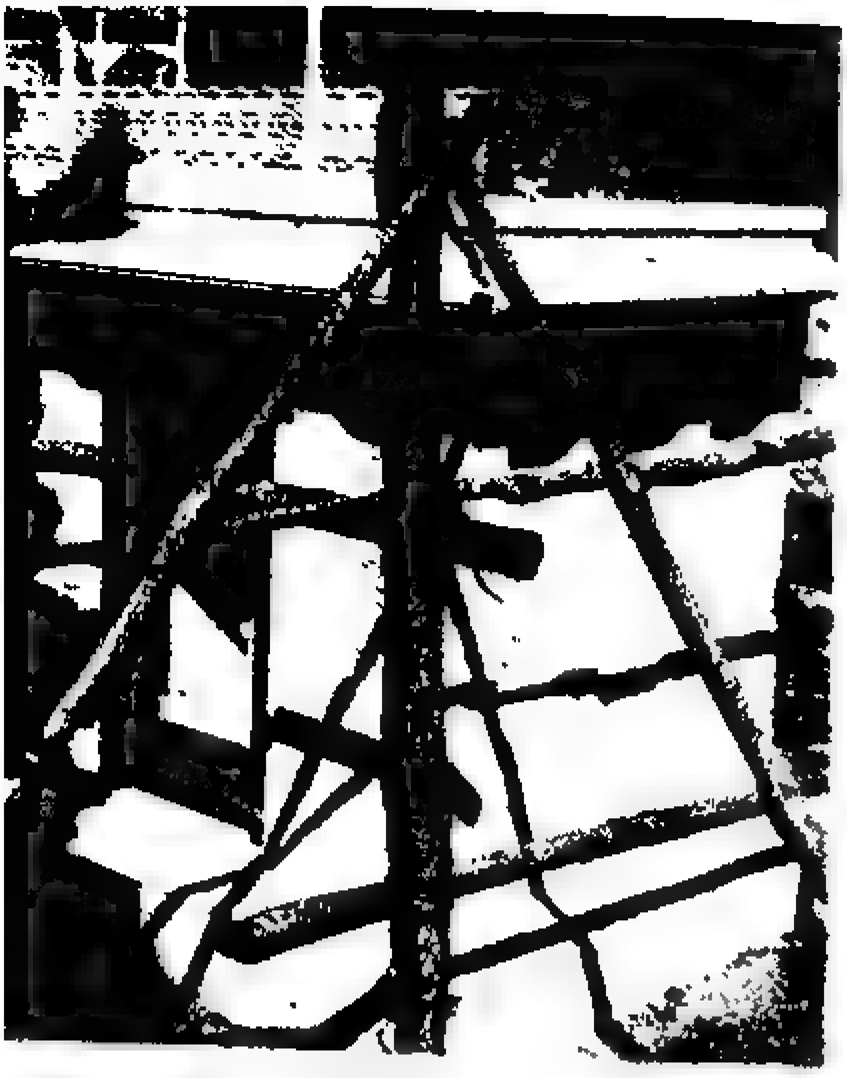

غالب کے مقبرہ کی تعمیر۔

کے پیش نظر انہیں چار و ناچار سفر کرنا پڑتا تھا۔ اُن کا پہلا سفر وہ تھا جو انہوں نے عالم ارواح سے عالم آب و گل کی طرف آتے ہوئے ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو بدھ کے دن سورج نکلنے سے چار گھڑی پہلے آگرے میں پورا کیا۔ ایک خط میں اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:

"ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔"

اُن کا دوسرا سفر دلی کی طرف تھا اور یہ چودہ پندرہ برس کی عمر میں طے ہوا تھا۔ دلی آنے اور مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد انہیں کلکتے اور رام پور جانا پڑا۔

کلکتے کا سفر مرزا غالب کی زندگی کا سب سے لمبا سفر تھا، اس سفر میں انہیں لوہارو، فیروز پور جھرکہ، بھرت پور، کان پور، لکھنؤ، باندہ، الہ آباد، بنارس، عظیم آباد اور ہگلی وغیرہ مقامات پر

دلی کا جیل خانہ جہاں غالب نے سزا کاٹی۔

رُکنا پڑا۔ کلکتے کا یہ سفر پنشن کے جھگڑے کے سلسلے میں ہوا تھا چونکہ اس زمانے میں ریل اور موٹریں نہ تھیں اس لئے اُنہیں یہ سفر گھوڑا گاڑی اور کشتی کے ذریعہ کرنا پڑا تھا۔ کان پور پہنچ کر مرزا غالب بیمار ہو گئے تھے اور ایسے بیمار کہ اُن میں چلنے پھرنے کی طاقت بھی نہ رہی۔ چونکہ کانپور میں اچھے معالج نہ تھے۔ اس لئے بیماری ہی کی حالت میں وہ لکھنؤ چلے آئے۔ جہاں وہ پانچ مہینے زیرِ علاج رہے۔ جب یہاں بھی اُن کی صحت بحال نہ ہوئی تو وہ باندہ کی طرف چل کھڑے ہوئے اور جوں توں کر کے باندہ پہنچ گئے۔ یہاں خدا کے کرم اور نواب ذوالفقار علی بہادر کی تیمارداری اور ہمدردی سے اُنہیں بیماری سے نجات مل گئی۔ قیامِ باندہ کی یادگار وہ اُردو غزلیں ہیں جو حافظ محمود شیرانی والے نسخے پر درج ملی ہیں۔ باندہ سے روانہ ہوئے تو الہ آباد ہوتے ہوئے بنارس پہنچے۔ بنارس میں وہ یقیناً موسمِ برسات کے بعد آئے تھے۔

۲۱ دسمبر ۱۸۲۷ء کو وہ کشتی میں سوار ہوئے اور عظیم آباد، ہگلی ہوتے ہوئے ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے کلکتہ میں اُنہیں اپنے مقدمے کی پیروی کرنا تھی لیکن مقدمہ جلدی فیصل ہوتا نظر نہ آیا تو وہ منشی نصر اللہ کو اپنا وکیل مقرر کر کے دِلّی کے لئے روانہ ہوئے اور تقریباً تین برس باہر رہ کر ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو دِلّی پہنچ گئے۔ اِس سفر میں الہ آباد اور کلکتے میں ناخوشگوار واقعات پیش آئے جن کی تلخی کو وہ زندگی بھر نہیں بُھلا سکے۔

مرزا غالب کا چوتھا سفر رام پور کا سفر تھا۔ محمد یوسف علی خاں نواب رام پور سے اُن کے پُرانے تعلقات تھے ۱۸۵۵ء میں مولانا فضلِ حق خیر آبادی کی بدولت اُن تعلقات کی تجدید ہوئی اور نواب صاحب نے اپنے کچھ اشعار مرزا غالب کے پاس بغرضِ اصلاح بھیجے۔ نواب صاحب نے رام پور آنے کی اُنہیں کئی مرتبہ دعوت دی، لیکن وہ ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء سے پہلے رام پور نہ جا سکے۔ مرزا غالب جب رام پور پہنچے تو اُن کی اچھی طرح پذیرائی ہوئی۔ خاص کوٹھی قیام کے لئے ملی۔ لیکن بچوں کی وجہ سے وہ اُس کوٹھی کو چھوڑ کر محلہ راج دوارہ کے ایک شاہی مکان میں جا رہے۔ مرزا صاحب گرمی اور برسات کا موسم یہاں گزارنا چاہتے تھے لیکن عارفؔ مرحوم کے صاحبزادوں نے دِلّی چلنے کی رٹ لگا دی۔ اِس لئے نواب صاحب سے اجازت لے کر ۲۴ مارچ ۱۸۶۰ء کو دِلّی آ گئے۔

رام پور کا دوسرا سفر ۱۸۶۵ء میں پیش آیا۔ اس سفر کی تقریب نواب محمد یوسف علی خاں مرحوم کی تعزیت اور نواب کلب علی خاں کے جشنِ مسند نشینی کی تہنیت تھی۔ مرزا غالب ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو رام پور پہنچے۔ نواب صاحب تعظیم و تکریم اور محبت سے پیش آئے۔ اس بار اُن کا قیام جرنیلی کوٹھی میں تھا۔ تقریباً ڈھائی مہینے رہ کر وہ ۲۸ دسمبر کو دلی کے لئے روانہ ہوئے۔

مرزا صاحب کا یہ سفر کامیاب ترین سفر تھا۔ نواب صاحب نے اُنہیں ایک ہزار روپے بتقریبِ جشنِ تخت نشینی اور دو سو روپے بطورِ زادِ راہ عنایت فرمائے۔

غالب کو خراجِ ہائے عقیدت

عرش ملسیانی

غالب نے جب یہ کہا "گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے۔ جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے۔" تو یہ کوئی تعلی نہ تھی بلکہ واقعہ تھا۔ اور جب اس نے کہا ؎

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

تو یہ ایک پیش گوئی تھی جو حقیقت پر مبنی تھی۔ ہر چند غالب کو بادشاہِ وقت اور اُمرا نے نوازا لیکن یہ قدر افزائی زیادہ قابلِ اعتنا نہیں۔ بہادر شاہ ظفر، نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رام پور، مہاراجہ بیکانیر، مہاراجہ الور، مرزا فخرو، نواب واجد علی شاہ اور دوسرے کرم فرماؤں نے غالب کی مالی مدد کی لیکن غالب کی صلاحیتوں کی صحیح قدر افزائی اس کے زمانے میں نہیں ہوئی۔

غالب کے انتقال کے بعد سب سے زیادہ جن لوگوں نے اس کی عظمت کو محسوس کیا وہ اس کے شاگرد تھے۔ 'یادگارِ غالب' لکھ کر حالی نے پہلے پہل بہت بڑا خراجِ عقیدت اس بادشاہِ اقلیمِ نظم و نثر کو پیش کیا۔ اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ حالی نے غالب کا جو مرثیہ لکھا اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اِک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس
پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
لاکھ مضمون اس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات۔
اس کے مرنے سے مر گئی دلی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

ایک دوسرے بند کے تین شعر ملاحظہ فرمائیے

اس کو اگلوں پہ دیں نہ کیوں ترجیح
اہلِ انصاف غور فرمائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
غالب نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

میر مہدی مجروح بھی غالب کے محبوب شاگرد تھے،

اُنھوں نے ایک ترجیع بند لکھا۔ ترجیع کا شعر یہ ہے ؎

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خاں غالب مُرد

یہی شعر غالب کے سنگِ مزار پر کندہ بھی ہے۔ ایک بند کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے :

کیوں نہ ویران ہو دیارِ سخن
مرگیا آج تاجدارِ سخن
بُلبلِ خوش ترانۂ معنی
گلِ رنگیں و شاخسارِ چمن
آبیاری تھی جس سے وہ نہ رہا
اب خزاں ہوگئی بہارِ سخن

منشی ہرگوپال تفتہ مرزا کے اتنے عاشق تھے کہ لوگ انہیں مرزا گوپال تفتہ لکھتے ہیں۔ وہ فارسی ہی میں بیشتر کہتے تھے۔ مرزا کے شاگرد تھے۔ مرزا کے انتقال پر اردو میں دو شعر کہے :

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے
ہم سے ہزار ہیچداں نام ور ہوئے
فیض و کمال صدق و صفا اور حُسن و عشق
چھ لفظ اس کے مرتے ہی بے پا و سر ہوئے

اقبال نے بھی 'مرزا غالب' کے عنوان سے ایک بے مثال نظم کہی ہے۔ اقبال گوئٹے کے قائل تھے۔ مرزا کو گوئٹے کا ہم نوا قرار دیا ہے

مسدس کا ایک بند ملاحظہ ہو :

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر

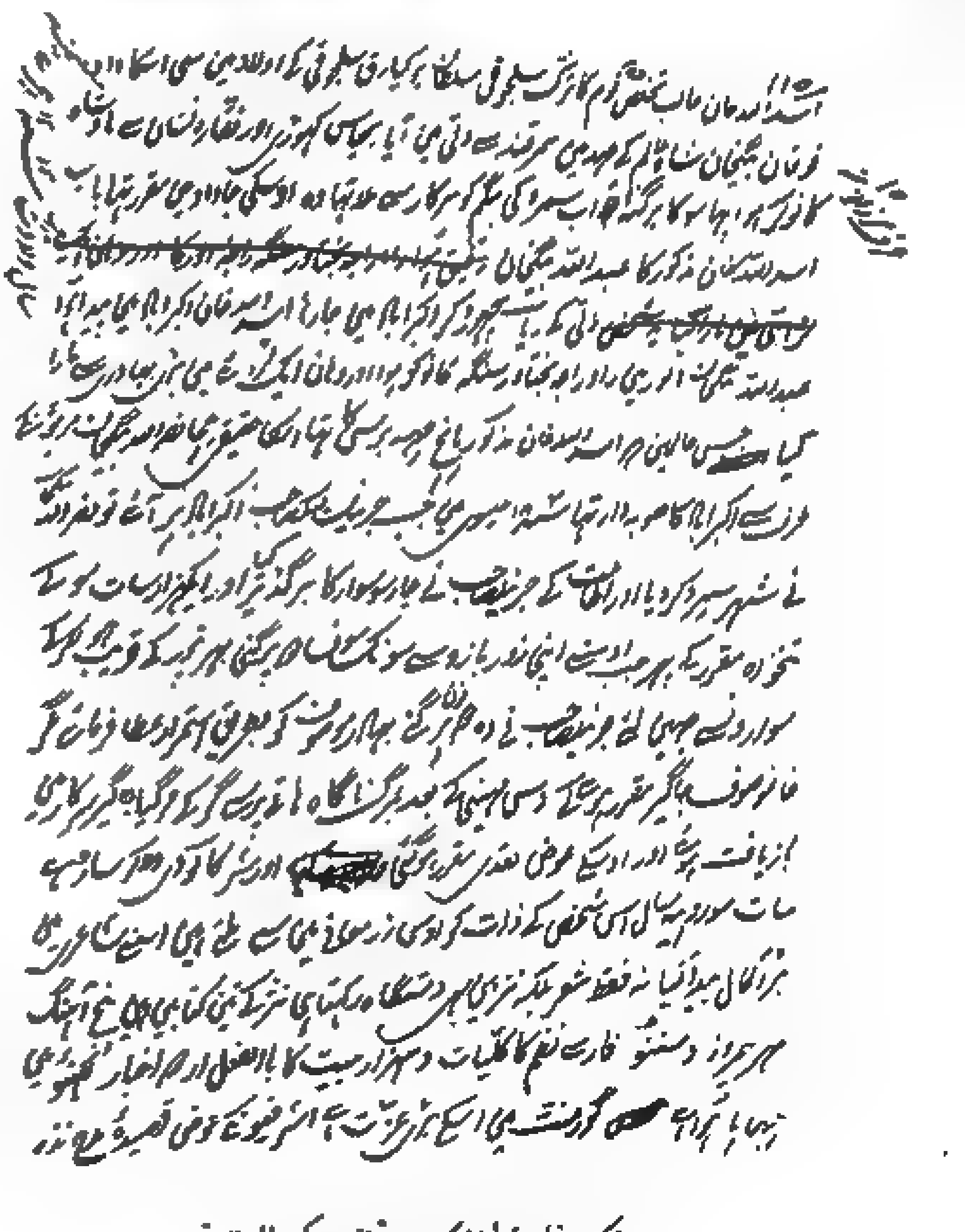

تذکرہ مظہر العجائب میں غالب کے حالات خود
غالب کے قلم سے ـــــ زمانۂ تحریر ۱۸۶۴ء

آہ تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ مریم میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

خدا کے فضل سے دلّی اب اُجڑی ہوئی تو نہیں۔ البتہ غالب کے نہ ہونے سے یہاں کی محفلِ ادب ضرور اُجڑی ہوئی ہے اور یہی اقبال کا مفہوم بھی ہے۔

اب نثر میں کچھ خراج ہائے عقیدت ملاحظہ فرمائیے:

رشید احمد صدیقی

جو لوگ اس جہان سے اُٹھ چکے ہیں اُن میں کچھ ایسے ہیں جن کے بارے میں میرا اکثر جی چاہا ہے کہ کاش میں اُن کی زندگی میں اُن سے مل سکتا۔ ان میں ایک غالب بھی ہیں۔ مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلّف یہ تین نام لوں گا، غالب، اُردو اور تاج محل۔ یہ ہندوستان کی تہذیبی پیداوار ہیں۔

احتشام حسین

غالب کے مطالعہ کے دوران ایک دل کش حقیقت کی طرف ذہن ضرور منتقل ہوتا ہے کہ گو وہ ہندوستانی سماج کے دورِ انحطاط سے تعلّق رکھتے تھے یعنی ایسے انحطاط سے جو ہر طبقے کو بے جان بنائے ہوئے تھا، لیکن اُن کی فکر میں توانائی اور تازگی، اُن کے خیالوں میں بلندی اور بے باکی غیر معمولی طور پر پائی جاتی ہے۔

عبدالماجد دریابادی

حضرت غالب کا مرتبہ فارسی شاعری میں بھی یقیناً بہت بلند ہے، لیکن مجھ بے بصر، تنگ نظر کے علم میں تو اُردو میں جہاں تک غزل گوئی کا تعلّق ہے۔ کوئی شاعر اس پایہ کا نہ غالب کے قبل پیدا ہوا تھا نہ غالب کے بعد آج تک ہوا ہے۔

جب سے اُن کے خطوں کا مجموعہ مرتبہ مولوی مہیش پرشاد بناری نظر سے گذرا ہے البتّہ عبدیت سطر سطر سے نمایاں ہے۔ غالب اس آئینے میں ایک مکمّل انسان ایک عبدِ خالص نظر آتے ہیں اور اسی حقیقت کی خود آرائی انشا پردازی کا منتہائے کمال ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدّس وید اور دیوانِ غالب۔ غالب اور گوئٹے کی ہستی انسانی تصوّر کی آخری حدود کا پتہ دیتی ہے۔ شاعری کا دونوں پر خاتمہ ہو گیا ہے۔ جدید خیالات، حقیقت اور مجاز، قدرت اور حیات کی کثرت اُن کے دماغوں میں وحدت میں منتقل ہو کر وجود پاتی ہے۔ دونوں اقلیمِ سخن کے شہنشاہ ہیں تہذیب، تمدّن، تعلیم، تربیت، فطرت کوئی زندگی کا ایسا پہلو نہیں جس پر دونوں کا اثر نہ پڑا ہو۔

خاندانِ غالب کی
ایک زندہ نشانی۔
مرکزی وزیر
برائے تجارت و صنعت
جناب فخرالدین علی احمد

غالب کے شاگرد مولانا اسمٰعیل میرٹھی

شیخ محمد اکرام

مرزا کے قوم اور ملک پر بڑے احسانات ہیں، لیکن یہ احسانات محض ادبی نہیں، مرزا کا صرف یہی کارنامہ نہیں کہ انہوں نے ہماری نظم و نثر کے خزانے میں بیش بہا جواہرات کا اضافہ کیا ہے بلکہ ان کی عظیم الشان شخصیت اور مثالی زندگی بھی ہماری قومی روایات کا بیش بہا زیور ہے۔ چنانچہ خود غالب فرماتے ہیں:

دبیرم، شاعرم، رندم ندیمم شیوہ ہا دارم
گرفتم رحم بر فریاد و افغانم نمی آید

سر عبد القادر

غالب کی عام محبت محض ذاتی دوستوں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ تفتہ کو وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ وہ ہر انسان کو خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو یا عیسائی عزیز رکھتے ہیں۔ ان کے اس نظریے کا ترجمان ان کا یہ شعر ہے ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

غلام رسول مہر

مکاتیب اُردو کے انداز و اسلوب کی نسبت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ سادہ سلیس اور بہار آفریں تحریر کا کوئی ایسا نمونہ اُردو زبان میں موجود نہیں — حسنِ بیان، اعجازِ نگارش اور کمالِ اظہار، جزئیات کی اتنی فراواں مثالیں ان مکاتیب میں موجود ہیں کہ اُردو کی بڑی بڑی اور بہترین کتابیں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں غالب کے بعد بڑے بڑے ادیبوں اور مصنفوں کے خطوط شائع ہوئے لیکن ایک مجموعہ بھی مکاتیبِ غالب کے مقامِ بلند تک نہ پہنچ سکا۔

پنڈت جیالال کول

کشمیر کے ایک پُر مغز استاد ہیں وہ اپنی کتاب (INTERPETATIONS OF GHALIB) میں رقم طراز ہیں۔ اُردو کے عام غزل گو ادا و ناز، خیال اور شوخی کے شاعر ہیں، زندگی اور فطرت سے ان کو کوئی واسطہ نہیں، لیکن غالب فکر و تخیل کے شاعر ہیں۔ ان کا فکر جذبہ انگیز ہے۔ غالب کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ غزل کو وہ جامہ پہناتے ہیں جو عام غزلوں کا طرۂ امتیاز نہیں کیوں کہ ان میں تصنع ہے نہ صرف یہ بلکہ ان میں جذبے کی گہرائی بھی نہیں، ان کے استعارے دوسرے درجے کے اور خیال پست ہے۔

عام طور پر ایران میں ہندوستان کے فارسی شعراء کی زیادہ قدر و منزلت نہیں لیکن اب وہاں سبکِ ہندی کی اصطلاح میں ان شاعروں کا قدرے اعتراف ہونے لگا ہے۔ ڈاکٹر علی اصغر حکمت نے تہران سے ایک پیغام یوم غالب کے موقع پر ایک زمانے میں بھیجا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

اب جب کہ دلّی میں یوم غالب منایا جا رہا ہے میرے لئے بڑی مسرت کا مقام ہے کہ میں جامعہ ادبی

نظام مراد آبادی - رفعت بھوپالی - رمزدہلوی - غالب کے تین شاگرد

ایران کے احساسات پیش کروں۔ اسداللہ خاں غالب ہندوستان کے خاتم الشعراء تھے اور ہم ایرانیوں کے نزدیک وہ بہت گرامی و عزیز ہیں۔ اور دیوانِ غالب ایران کے زمانۂ آخر کے شعراء قاآنی اور نشاط کے دیوانوں کی طرح محبوب ہے۔

مالک رام

ماہرِ غالبیات جناب مالک رام صاحب نے فرمایا ہے کہ " ہماری شاعری میں انیسویں صدی کے آخر میں جو اصلاحی تحریک شروع ہوئی اس کے سب سے پہلے علمبردار آزاد اور حالی تھے اور یہ دونوں براہِ راست مرزا سے متاثر ہوئے۔ حالی تو مرزا کے شاگرد بھی تھے، اقبال نے مشرق اور مغرب کے علمی اور ادبی خزانوں سے استفادہ کیا اور اس پر اپنی ژرف نگاہی اور غور و فکر سے بہت کچھ اضافہ کر کے ہماری زبان کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ لیکن کیا اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ اقبال، غالب کے معنوی فرزند ہیں۔ اگر غالب نے اُردو شاعری کو نئی شاہراہ پر نہ ڈال دیا ہوتا اور آزاد اور حالی نے اس پر سنگ میل نہ قائم کئے ہوتے، تو اقبال، اقبال نہ ہوتے اور اگر ہوتے بھی تو کم از کم اتنی دور دراز کی مسافت طے کر کے وہ ہمارے ادب کو منزل مقصود کے اتنا قریب نہ پہنچا سکے ہوتے

کسی زندگی کی عظمت صرف اسی بات پر منحصر نہیں کہ اس میں شاندار فتوحات اور کارنامے ہوں یا اس میں غیر معمولی ایثار اور قربانیوں کے واقعات ہوں۔ بے شک یہ بھی ایک معیار ہے۔ لیکن اس کا ایک اور رُخ بھی ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ آپ نے دُنیا کے اطمینان اور راحت و مسرت میں کتنا اضافہ کیا۔ آپ کے چہرے پر کھیلنے والی مسکراہٹ جو آپ کے آس پاس رہنے والوں کو خوش و خرم بناتی رہی۔ آپ کی وہ لطف آمیز گفتگو جو آپ نے کسی سوالی اور بھیک منگے سے کی، حالانکہ آپ نے اس پھیلے ہوئے ہاتھ پہ ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں رکھی تھی۔ آپ کی وہ معمولی معمولی مہربانیاں جن سے آپ نے بنی نوعِ انسان کو خوش وقت کیا۔ غرض کہ آپ کے وہ چھوٹے چھوٹے کام جن سے آپ کے ملنے والے ہمیشہ دوچار ہوتے رہے۔ آپ کی زندگی کو شاندار اور عظیم الشان بنانے کے لئے کافی ہیں۔ آپ اس معیار سے دیکھیں تو آپ کو مرزا کی زندگی بہت کامیاب اور بہت شاندار معلوم ہوگی۔ اور ان کا یہ فیضان آج بھی جاری ہے اور جب تک اُردو اور فارسی زبانیں بولی اور سمجھی جائیں گی یہ جاری رہے گا۔ ★★

حالی کا مرثیہ

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں

کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل
کس کی دادِ سخنوری پائیں

مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب
کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں

پست مضموں ہے نوحۂ استاد
کس طرح آسماں پہ پہنچائیں

لوگ کچھ پوچھنے کو آتے ہیں
اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں

لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو
سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح
اہلِ انصاف غور فرمائیں

قدسی و صائب و اسیر و کلیم
لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

حضرت غوث علی شاہ قلندرؒ کی رندِ بلانوش سے ملاقات

مختارالدین احمد آرزو

حضرت سید غوث علی شاہ قلندر (ولادت در قصبۂ استھواں، بہار۔ ۱۲۱۹ھ وفات در پانی پت ۷ ۱۲۹ھ) تیرھویں صدی ہجری میں سلسلۂ قادریہ کے بڑے مشہور بزرگ گزرے ہیں، ان کے حالات و ملفوظات ان کے "خادم طریق دوحی باتحقیق" شاہ گل حسن نے مرتب کر کے شائع کئے ہیں اردو اور فارسی میں جس قدر ملفوظات دیکھنے کا اتفاق ہوا، بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس قدر دل چسپ اور عام فہم کتاب کوئی اور دیکھنے میں نہیں آئی، یہ بڑے جہانیاں جہاں گشت تھے، ملفوظات میں پچاسوں ان مقامات کا نام آتا ہے جہاں جہاں کی سیاحت کی تھی، اور بیسوں ان بزرگوں کے اسماء ملتے ہیں جن سے انھیں ملنے کے مواقع حاصل ہوئے تھے۔ ان لوگوں میں مولانا فضل حق: ۱۲۳، ۲۴۵، مفتی صدرالدین ۴۴ ۱۲ اسمٰعیل میرٹھی کے نام قابل ذکر ہیں۔ مرزا غالب سے بھی ملاقاتیں ہوئی تھیں، یہ اس زمانے کی بات ہے جب شاہ صاحب دہلی گئے ہوئے تھے اور "زینت المساجد" میں فروکش تھے، ان کا قیام دہلی میں کب تھا یہ معلوم نہ ہوسکا ورنہ مرزا سے ان کی ملاقات کے زمانہ کی تعیین ہوجاتی، صرف یہ معلوم ہے کہ ان کا قیام چھ ماہ دہلی میں رہا اور مرزا سے ہمیشہ ملاقاتیں رہیں، راقم کا قیاس ہے کہ یہ سن ستاون سے پہلے کی بات ہوگی، اس قیاس کی تائید دو باتوں سے ہوتی ہے، مرزا نے دہلی میں مختلف مکان

بدلے، لیکن وہ ہمیشہ "بلی ماران" اور آس پاس کے "دائرے" ہی میں "قدم" رکھتے ہیں۔ پھر وہ مالی پریشانیوں اور ہجوم افکار کا زمانہ تھا، اس وقت ہر دو دن کے بعد ایک خوان سجا کر شاہ صاحب کے لئے لے جانا ویسے بھی مستبعد معلوم ہوتا ہے، پھر یہ امر غور طلب ہے کہ اس وقت تک رجب علی بیگ سرور سے ان کے تعلقات تھے نہ ملاقات، اسی زمانے میں مرزا کی ان کی ملاقات ہوئی اور تعلقات قائم ہوئے، مرزا نے ان کی کتاب "گلزار سرور" پر ایک تقریظ بھی لکھی ہے جو اس کتاب کے علاوہ عودِ ہندی میں بھی موجود ہے۔

غوث علی شاہ، پہلی مرتبہ خود ہی مرزا سے ملنے گئے، پھر بعد میں چھ ماہ تک مرزا سے ہمیشہ ملاقات رہی اور ان ملاقاتوں کا بڑا اچھا اثر شاہ صاحب پڑا ان کے ملفوظات میں دو مقام پر مرزا غالب کا

ذکر ہے اور جس انداز میں انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور غالب کے اخلاق و عادات کی تصویر جس طرح کھینچی ہے اس سے غالب ہی نہیں خود شاہ صاحب کے اعلیٰ اخلاق پر روشنی پڑتی ہے، ورنہ ان دونوں کا کیا میل۔ مرزا ایک رند مشرب آدمی اور شاہ صاحب اپنے وقت کے بڑے اہلِ دل بزرگ۔

ان کے ملفوظات میں مرزا غالب کے اشعار بھی ملتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں مرزا سے کتنی محبت تھی۔ کچھ شعر یہ ہیں:

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے آگے
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

ع گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اب ان کی مرزا غالب سے ملاقات کا حال انھیں کی زبانی سنئے:

ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے، بہایت حسن اخلاق سے ملے، لب فرش تک آن کر لے گئے، تمام حال دریافت کیا، ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت ہی پسند ہے علی الخصوص یہ شعر:

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو
تیرے کوچے کی شہادت ہے سہی

کہا صاحب، یہ شعر تو میرا نہیں کسی اُستاد کا ہے فی الحقیقت نہایت اچھا ہے۔ غزل مرزا نوشہ:

عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اس دن سے مرزا صاحب نے دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے، ہر چند ہم نے عذر کیا کہ تکلف نہ کیجے مگر وہ کب مانتے تھے ہم نے ساتھ کھانے کے لئے کہا تو کہنے

لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں، مے خوار و سیاہ گنہ گار مجھکو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے البتہ ادش کا مضائقہ نہیں ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا اُن کے مزاج میں کمال کی کسرنفسی اور فروتنی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی سرور مصنف فسانۂ عجائب لکھنؤ سے آئے۔ مرزا نوشہ سے ملے اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے کہا چہار درویش کی، میاں رجب علی بولے اور فسانۂ عجائب کیسی ہے مرزا بے ساختہ کہہ اُٹھے اجی لاحول ولا قوۃ اُس میں لطف زبان کہاں، ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں، جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا، بہت افسوس کیا اور کہا ظالمو پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے یہ قصہ سُنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے عدم دانستگی میں ہوگیا آیئے آج ان کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں، ہم ان کے ہمراہ ہولئے اور میاں سرور کی فرود گاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہوکر بولے کہ جناب مولوی صاحب رات میں نے جو فسانۂ عجائب کو جو بہ غور دیکھا تو اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں، نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہوگی اور کیوں کر ہو، اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا، غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا، دوسرے دن ان کی دعوت بھی کی اور ہم کو بلایا۔ اس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی، مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے اور درحقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔ المؤمن من سلم من یدہٖ ولسانہٖ

مباش درپئے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در طریقتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

ایک دن ہم نے مرزا غالبؔ سے پوچھا کہ تم کو کسی سے محبت بھی ہے، کہا کہ ہاں حضرت علی مرتضیٰ سے۔

پھر ہم سے پوچھا کہ آپ کو! ہم نے کہا واہ صاحب آپ تو مغل بچہ ہو کر علی مرتضیٰؓ کی محبت کا دم بھریں، ہم ان کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں، کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے۔

ایک روز راقم خدمت میں حاضر تھا کہ کسی شخص نے مرزا نوشہ صاحب کے انتقال کی خبر سُنائی آپ نے فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون،

نہایت خوب آدمی تھے، عجز و انکسار بہت تھا فقیر دوست بدرجہ غایت اور خلیق از حد تھے، ایک روز ہم ان کے پاس گئے تو انھوں نے اپنے یہ دو قطعے پڑھے تھے:

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار
ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند
حق را بہ سجودے و نبی را بہ درودے

بروز حشر الٰہی چو نامۂ عملم
کنند باز کہ آں روز باز خواہ من است
بکن مقابلہ آں را ز سرنوشت ازل
اگر زیادہ و کم باشد آں گناہ من است

رند مشرب، بے شر، رحم دل تھے اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے لیکن افسوس یہ ہمارے محب بھی چل دیے۔

شاہ صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ وحشت ہی سہی اُدالی غزل غالب نے انھیں سُنائی لیکن فحوائے کلام سے یہی مترشح ہوتا ہے۔ مرزا نے کہا ہوگا کہ جو شعر آپ سُنا رہے ہیں وہ تو میرا نہیں۔ لیکن اس زمین میں میں نے غزل لکھی ہے اور وہ یہ ہے۔

"زینت المساجد" عالمگیر کی صاحب زادی زینت النساء بیگم کی یادگار ہے جس کی تعمیر دریا گنج میں ۱۱۱۹ھ میں انھوں نے کرائی تفصیل کے لئے دیکھئے واقعات دار الحکومت ۲/۱۲۷، آثار الصنادید، مفتاح التواریخ بیل: ۲۹۷

رجب علی بیگ سرورؔ کی انشا پردازی کے متعلق غالب کی رائے اس تقریظ میں ملے گی جو انھوں نے گلزار سرور (ترجمہ حدائق العشاق) پر لکھی تھی اور عودِ ہندی اور اردوئے معلیٰ، دونوں میں موجود ہے۔ ذیل کی سطریں دیکھئے اس میں فسانۂ عجائب کا بھی ذکر آگیا ہے۔

ہاں اے صاحبانِ فہم و ادراک، سرورِ سحر بیاں کا اردو کی نثر میں کیا پایہ ہے اور اس بزرگوار کا کلام شاہد معنی کے واسطے کیسا گراں بہا پیرایہ ہے:

رزم کی داستاں اگر سُنئے
ہے زباں ایک تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام کر کیجیے
ہے قلم ایک ابرِ گوہر بار

مجھ کو دعویٰ تھا کہ انداز بیان کی خوبی میں فسانۂ عجائب بے نظیر ہے، جس نے میرے دعویٰ کو اور فسانۂ عجائب کی یکتائی کو مٹایا وہ یہ تحریر ہے، کیا ہوا کہ ایک طرح اور ایک قماش کی ہیں یہ دونوں دل فریب نقش ایک ہی نقاش کے ہیں، مانا کہ ایک نقش دوسرے کا ثانی ہے، یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نقاش لا ثانی ہے، مانی نقاش بے معنی صورتیں بنا کر دعویٰ پیمبری کا کرے کیا عقل کی کمی ہے، یہ بندۂ خدا معنی کی تصویر کھینچ کر دعویٰ خدائی نہ کرے کس حوصلہ کا آدمی ہے" (عود ہندی طبع اول: ۱۸۱، اردوئے معلیٰ حصہ دوم طبع لاہور: ۳۵۱)

مرزا غالب نے جو دو فارسی کے قطعے، شاہ صاحب کو سنائے تھے ان میں پہلا تو بہت مشہور ہے، اور کلیات فارسی میں موجود (طبع ۱۸۶۳: ۱۴۰) لیکن دوسرا قطعہ نہ تو ان کے دیوان میں ہے نہ سبد چیں کی اشاعت اول میں اور نہ غالب کی کسی اور تحریر میں اس کا ذکر ملتا ہے اس لئے بے حد اہم ہے۔

●●

مرزا غالب کی "قاطع برہان" نے لوگوں کو ایسا برافروختہ کر دیا تھا کہ جواب تو خیر در کنار، اکثر زباں درازیوں پر اُتر آئے تھے بُرا بھلا کہتے، گالیاں دیتے اور فحش خط لکھتے تھے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ مرزا صاحب کے پاس مولانا حالی بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک خط اسی قسم کا آیا مرزا صاحب نے لفافہ مولانا حالی کو دیا کہ اس کو کھول کر پڑھو۔ مولانا نے پڑھنا شروع کیا ایک جگہ پر خط میں ماں کی گالی بھی لکھی تھی مولانا کو پڑھنے میں تکلف ہوا تو مرزا صاحب نے ان کے ہاتھ سے خط چھین لیا اور خود پڑھ کر کہنے لگے۔

"کم بختوں کو گالیاں بھی دینی نہیں آتیں۔ بڈھے یا ادھیڑ کو ماں کی گالی نہیں دینی چاہئے بلکہ بیٹی کی۔"

■■

غالب پر سرسید کا ایک سو بارہ سال پرانا مضمون

ہمائے اوجِ مفاخر و معالی جاگزینِ سدرۃ المنتہیٰ مراتب بلند و مدارج عالی، موسسِ اساسِ شیوا بیانی بانی پایۂ الفاظ و معانی، عندلیبِ بہارستانِ سخن گستری، طوطیِ شکرستانِ معنی پروری، اوجِ سمائے برتری و والا تباری مہرِ سپہرِ بلند اختری و گردوں اقتداری، شاگردِ رحمان، اُستادِ سحبان المعیٰ زمان نو دعیٔ بیان، فرزدقِ دہر و لبیدِ آدان، سمی وصیٔ رسول اللہ جناب مستطاب مرزا اسد اللہ غالب تخلص، دیوانِ حافظ اُن کی لسان الغیبی کے عہد میں دنوں سے فراموش، زبانِ خلاق المعانی اُن کے معنی ایجاد کے زمانے میں خاموش، چراغِ الوذری اُنہیں کے شعلۂ فکر سے روشن اور سینۂ آذری انہیں کی آتشِ حسرت سے گلخنِ عنصری، اُن کے رشکِ افکار سے ایسا جل گیا کہ گویا اُس کا پیکر فقط عنصرِ آتش سے مکون ہوا تھا اور سحبان اُن کی حسرتِ کمال سے ایسا رو دیا کہ گویا اس کی بینائی چشم فقط عنصرِ آب سے بنی تھی۔ زلالی اُن کے چشمۂ ہنر کا تشنہ لب، اور ابو اسحاق اطعمہ اُن سے خوانِ استعداد سے نعمت طلب، خاقانی اس خسروِ معنی کی کمترِ رعیت اور خسرو اس بادشاہِ سخن کے آگے سرگرمِ خدمت، اطاعت

کلامِ سعدی اُن کے خوانِ فیض کی نمک خوار اور شیرینی زبانِ حافظ اُن کی نعمتِ مقال سے روزینہ دار، رنگینیٔ معنی سے صفحے کو گُل رنگ اور طرازیٔ فکر سے کاغذ کو ارژنگ کرنا خامہ اسی چمن طرازِ سخن وری اور نقاشِ صحیفۂ ہنر پروری کا ہے۔ اگر الفاظ ثقیل سے گرانی اٹھائے تو کوہ کاہ کا حکم پیدا کرے اور اگر سخن میں متانت صَرف کرے تو ورقِ بیاضِ صدمۂ صرصر سے جگہ سے نہ ہلے، قلم اُن کا معنیٔ روشن کی تراوش سے فوارۂ نور اور عبادتِ پاکیزہ اُن کی لطف کیفیت سے شرابِ انگور۔ اگر اس سخن طراز کے کمالِ استعداد کو جو طرفِ حصر و شمار سے افزوں ہے۔ خامہ دو زباں بیان کرے۔ اوّل چاہیئے کہ کلکِ عقل فعال سے عاریت مانگے اور زبانِ قلم تقدیر سے مستعار لے۔ میں ارادہ کرتا ہوں کہ اس حضرت کے اوصافِ حمیدہ اور محامدِ پسندیدہ کو دفترِ کتاب میں درج کروں اور عقل فریاد کرتی ہے کہ ہرگاہ میں نے اس تقدس جوہر امداد مبدا فیاض کے ساتھ جب اس امر کا قصد کیا، کارکنانِ بارگاہِ جلال سے کمیٔ استعداد کا طعنہ سُنا اور سوءِ ادب کی سرزنش کی تو بایں ہمہ نقصانِ عقل و ہوش کس شمار میں ہے۔ فی الحقیقت اگر لنگ لنگاں اپنے تئیں جادۂ مقصود میں ڈال دیا ہو تو ہوس حق السعی یعنی شاباش کی متوقع ہوئی اور حال یہ ہے کہ دشوار پسندانِ بلند فکر بلکہ دقیقہ یابانِ انصاف طینت کے آگے حصولِ صلۂ آفرین تو کیا خجلتِ نارسائی اور طعنۂ ناعاقبت بینی سے سر اٹھانے کو جگہ نہ رہے گی۔ ظہوری نے سچ کہا ہے "کسی کہ عہدۂ ثنائے کسی بیروں نیایدش چرا اوّل بعجز اعتراف نماید"۔ بہتر یہ ہے کہ فکر کو اس اندیشۂ محال سے باز رکھے اور اپنی نارسائی کا پردہ فاش نہ کرے ـــــ بیت:

بامی است بصد بلند و پستی
ہاں پائے نہ لغزدت ز مستی

نام نامی اور اسمِ سامی اُن کے والدِ ماجد کا عبداللہ بیگ خان تھا۔ آپ اتراک سے ہیں اور سلسلہ آپ کے نسب کا افراسیاب و پشنگ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے بزرگ سلجوقیوں کے عہد میں بسبب اس کے کہ اُن کے ہم جنس و ہم گہر تھے فرمان روائی رکھتے تھے۔ جب سلجوقیوں کے عہدِ سلطنت کا دورہ تمام ہوا اُن کے آبا و اجداد نے سمرقند میں توطن اختیار کیا۔ اس حضرت کے جدِّ امجد اپنے پدرِ مشفق سے ایک امرِ سہل پر قدرے شکر رنج بہم پہنچا کر ہند میں تشریف لائے اور لاہور میں معین الملک کے رفیق ہوئے اور اس کے تباہ ہونے کے بعد وارد دہلی ہو کر سلطان عہد کی سرکار میں سررشتۂ ملازمت کو ہاتھ میں لا کر سلسلۂ چاکری کو استحکام دیا۔ حضرت ممدوح کے والد ماجد دہلی میں متولد ہوئے اور یہیں نشو و نما حاصل کی۔ پھر کسی سبب سے بود و باش اکبرآباد میں اختیار کی اور حضرت ممدوح کو والدۂ مشفقہ کے کنارِ شفقت اور آغوشِ عاطفت میں پانچ برس کا چھوڑ کر جناتِ نعیم کے گلگشت کی طرف متوجہ ہوئے، آپ کے چچا حقیقی نصر اللہ بیگ خاں کہ اس عہد میں مرہٹہ کی طرف سے اکبرآباد کے صوبہ دار تھے، آپ کی پرورش اور تربیت میں معروف ہوئے، جب ہندوستان میں تصرف حکامِ انگریز کا ہوا نصر اللہ بیگ خاں لارڈ لیک بہادر کے رفیق ہو کر چار سو سوار کے رسالے سے اعادی بادپیما کے ساتھ سرگرمِ جنگ رہے۔ جرنیل لیک صاحب بہادر نے اس کارِ نمایاں کے صلہ میں دو پرگنہ مضافاتِ اکبرآباد سے اُن کی عینِ حیات تک جاگیر میں عطا کئے، پھر اُن کے سانحۂ ناگزیر کے بعد جو ۱۸۰۱ء میں پیش آیا اور جاگیر موافق قرارداد کے ضبط ہوئی اور جاگیر کے عوض میں اس حضرت کے واسطے نقدی مقرر ہو گئی۔ پھر وہاں سے بسبب اُنس طبیعت اور میلِ خاطر کے

بحوالہ غالب نمبر شبستاں اُردو ڈائجسٹ نئی دہلی ۱۹۶۹

شاہجہاں آباد میں تشریف لائے۔ اور اُس معاش پر قناعت کر کے گوشہ نشینی اختیار کی ہے اور بہترین شغل آپ کا اس عالم تنہائی میں سخن سنجی اور معنی پروری ہے۔ حق یہ ہے کہ ماں سخن پر منت اور سرِ معنی پہ بار احسان رکھتے ہیں، ہر دائرۂ الفاظ دہنِ شکر اور ہر حرف زبان سپاس ہے اُن کی نعمت تربیت کا راقم آثم کو جو اعتقاد اُن کی خدمت میں ہے اُس کا بیان نہ قدرتِ تقریر میں ہے اور نہ احاطۂ تحریر میں آسکتا ہے اور چونکہ "دلہا را بدلہا راہ باشد" آں حضرت کو بھی وہ شفقت راقم کے حال پہ ہے کہ شاید اپنے بزرگوں کی طرف سے کوئی مرتبہ اُس کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ میں اپنے اعتقاد میں اُن کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے، اور اُن کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں اور اگر دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے۔ خوشا حال اُن لوگوں کا جو آپ کی خدمت بابرکت سے مستفید ہوتے ہیں اور جوہر گراں مایہ کہ آپ سے حاصل کرتے ہیں، اُس کو مغتنم جان کر بہی جزودانِ حافظہ میں محفوظ اور نہی صندوق بیاض میں امانت رکھتے ہیں۔ اس طرح کے مضامین عطائی پر مستفید کے پاس خریدار خریدار فراہم آگئے ہیں اور چونکہ مثل مبداء فیاض کے آپ کی طبیعت فیض موہبت نسبت بخل سے مبرا ہے۔ آپ کو اُن جواہر بے بہا کے اعطا میں کچھ دریغ نہیں۔ آرے:

نطقش کہ بدستِ جانِ توانا!
چوں بادہ خرد فزائے دانا!

آپ کا جوہر خانہ نفائس سخن حدِ شمار سے افزوں اور ظرف حصر سے بیروں ہے۔ ایک دیوانِ قصائد و غزلیات کا تیس جزو سے زیادہ مرتب اور منطبع ہوا ہے اور اسی طرح سے نثر اور ایک کتاب پنج آہنگ نام نہایت فوائد جلیلہ پر مشتمل قریب چودہ پندرہ جزو کے آپ کے نتائج فکر سے ہے کہ منتہیان معنی رس کے واسطے مغتنمات عظمٰی سے ہے اور ایک مثنوی مشتمل او پر غزوات حضرت رسالت دستگاہی ختمی پناہی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اگرچہ ہنوز نا تمام ہے لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو کے ہو چکی ہے، انشاءاللہ تعالیٰ جس وقت اتمام کو پہنچے گی گلدستۂ بزمِ احباب ہوگی ●

غالب کے ارسال کردہ ایک لفافے کا فوٹو۔ وسط میں جا بجا تار ہے وہ جو کچھ گے جواب ہیں۔

غالب کے انتقال پر پہلا مضمون

سید مسعود حسن رضوی

منشی بالگوبند ماتھر نے آگرہ سے ایک ماہوار رسالہ "ذخیرۂ بالگوبند" کے نام سے ۱۸۶۸ء کی ابتدا میں جاری کیا۔ منشی صاحب دہلی گزٹ پریس، آگرہ کے دفتر میں کلرک تھے۔ خود اُن کا بھی ایک مطبع تھا، آگرہ اردو، اخبار پریس۔ اور اس کے مہتمم اپرنٹر اور پبلشر وہ خود ہی تھے۔ یہ مطبع آگرے کے محلے پیپل منڈی میں واقع تھا۔ "ذخیرۂ بالگوبند" اسی مطبع میں بہت بڑی تقطیع کے ۴۸ صفحوں میں چھپتا تھا۔ اس کا چندہ سالانہ چھ روپے اور محصول ڈاک بارہ آنے تھا۔ اس رسالے کے تیئس ۲۳ پرچے میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان میں سے پہلا پرچہ مارچ ۱۸۶۸ء کا اور آخری دسمبر ۱۸۷۰ء کا ہے۔ رسالے کے مضامین کی نوعیت کا اندازہ سرورق کی حسب ذیل عبارت سے کیا جا سکتا ہے:

"ذخیرۂ بالگوبند مشتمل بر جمیع علوم و فنون و تحقیقات ہر قسم و رائے و تقاریر و معرفت الٰہی و عجائبات روزگار و حالاتِ دلچسپ و قصص رنگین و لطائف و ظرائف و مراسلات و غزلیاتِ شعرائے حال مع نقشہ جات و تصاویر"

اس رسالے کے مارچ ۱۸۶۹ء کے پرچے میں مرزا غالب کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان ہے "مرزا اسداللہ خاں متوفی المتخلص بہ غالب و نوشہ"۔ غالب کی وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو واقع ہوئی۔ اس سانحے کے صرف چند روز بعد یہ مضمون لکھا گیا اور غالباً مرزا غالب کے حالات میں یہ پہلا مضمون تھا جو کسی رسالے میں شائع ہوا۔

یہ شخص شہر دہلی میں ایک بڑا نامی گرامی شاعر فارسی کا تھا۔ اگرچہ اشعار اردو بھی اس کے بہت ہیں مگر زیادہ تر شہرت فارسی میں حاصل تھی۔ ممالک مغربی و شمالی ہند کے پڑھے لکھوں میں کم شخص ہوں گے جنھوں نے اس کے شعر اردو و فارسی پڑھے یا سنے نہ ہوں گے۔ کلام میں تخلص اپنا اس نے کہیں غالب اور کہیں نوشہ لکھا ہے۔ اگرچہ نام اسداللہ خاں تھا مگر دہلی اور دیگر اضلاع میں عموماً لوگ مرزا نوشہ کہا کرتے تھے۔

اس کی تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ سلسلہ اس کے خاندان کا افراسیاب بادشاہ ترکستان سے مسلسل تھا۔ ابتدا میں اس نے اور اس کے بزرگوں نے جو دولت ملکیت اور اختیارات پائے بہ فن سپہ گری و جوہر شمشیر پائے۔ علم فارسی اس نے بامیدِ روزگار تحصیل نہیں کیا تھا، اپنے دلی ذوق سے سیکھا تھا۔ موزونی طبع کے باعث طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ علاوہ ناظم ہونے کے ناثر بھی تھا۔ نثر میں سات کتابیں اس کی تصنیف و تالیف کی ہوئیں زیادہ معروف ہیں اور بہت سی چھپ بھی گئی ہیں۔ نام اور مطالب ان کے یہ ہیں یعنی۔

۱۔ دیوان فارسی۔ اس میں تخمیناً دس ہزار شعر ہیں۔

۲۔ دیوان ریختہ۔ یہ دیوان اردو نہایت مختصر ہے۔

۳۔ مہر نیم روز۔ یہ تاریخ خاندان تیموریہ کی نثر میں ابتدائے زمانۂ ہمایوں شاہ سے تا بہ عہد بہادر شاہ خارج شدہ بادشاہ

دہلی تخلص ظفر ہے۔

۴۔ **دستنبو** ۔ اس میں ایام غدر ۱۸۵۷ء کی تباہی اور بربادی اپنی کا حال نثر میں قلم بند کیا ہے اور عبارت میں کوئی لفظ عربی کا نہیں لایا ہے۔

۵۔ **پنج آہنگ** ۔ اس کتاب میں اپنے خطوط، دیباچے، خاتمے کتب کے، اصطلاحی محاورے، قواعد فارسی، الفاظ اور مصادر درج کئے ہیں۔

۶۔ **اردوئے معلیٰ** ۔ اس صحیفے میں اکمل المطابع واقع دہلی کے مہتمم نے اردو زبان کے رقعات اُن کے جمع کرکے یہ نام رکھا ہے اور انھیں کے یہاں شاید چھپ بھی رہے ہیں

۷۔ **قاطع برہان** ۔ یہ تبدیلی ’درفش کاویانی‘۔ اِس میں برہان قاطع مشہور کتاب لغت کے مؤلف کی غلطیاں ظاہر کی ہیں۔ لکھا ہے کہ سوائے اِن کتابوں کے اور بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور رسالے اُس کے موجود ہیں مگر اس قدر مشہور نہیں ہیں اور نہ ہنوز معرض طبع میں آئے ہیں۔

ایک عرصہ ہوا جب یہ نامی شاعر زیور اسلام اُتار کر حلیہ فرنگیین سے آراستہ ہوا تھا۔ ہر چند اُس کے احباب نے حال اِس مذہب نو اختیار کا اور کیفیت فرنگیین ہوس کی دھوکہ دے دے کر بھی دریافت کی پر اُس نے ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا۔ یہی کہے گا کہ کچھ نہ پوچھو (یہ کرامت اور وصف اس مذہب کا خاص مشہور ہے) مے پرستی کا ایام شباب سے تابہ عالم پیری شوق تھا۔ جس وقت عالم سرور اور دن ابر کا ہوتا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی ہوتی۔ روشِ باغ میں سیر چمن و گلگشت گلشن کرتا ہوتا تھا، اُس وقت طبیعت درختہائے دلکش و گلہائے رنگیں، کو خیابانوں میں تراوت بخش دلہا دیکھ کر لہرایا کرتی تھی۔ بعد وفات مرزا ذوق، نامی گرامی شاعر اردو، ملک الشعرا خطاب، استاد بہادر شاہ کے یہی مورد عنایاتِ سلطانی رہا کرتا تھا اور غزل بھی اس کی دیکھا کرتا تھا۔

اخیر میں اِن دنوں کہ زمانے میں بطفیل سرکار دولتمدار انگلشیہ کے علم و ہنر کی ترقی اور رواج بہت ہے تو اکثروں نے واقف ہو کر اُن کے نظم و نثر کلاموں پر بہتیرے اعتراض کئے۔ وہ اخباروں میں شائع ہوئے تھے۔ جوابات بھی اُن کے اسد اللہ خاں کی طرف سے اکثر درج کئے جاتے تھے ـــ بہت سے قیل و قال ہوتے تھے۔ اُن میں بڑا عذر اس شخص کا یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ میں نہایت ضعیف ہو گیا ہوں، حواس باختہ اور خاطر پریشان رہتی ہے، بدن میں ضعف ضعیفی غالب ہے، سماعت سے عاری ہوں، ہاتھ پاؤں کام کم کرتے ہیں، آدمی کی صورت نہیں پہچانتا، آواز کم سنائی دیتی ہے، جو کوئی بروقت ملاقات بات کیا چاہتا ہے لکھ کر دیتا ہے اور اس کا جواب تحریری لیتا ہے، کاغذ قلم دوات چاقو قلم دان بستہ ہر وقت پیش نظر رہتے ہیں، خورد و نوش کے ہضم کی قوت نہیں، زندگی کا لطف نہ رہا، موت نزدیک معلوم ہوتی ہے، اگر چند روز مر مر کے جئے تو کیا جئے، اب قابلِ معافی ہیں۔ اور واقع میں یہ جواب اُس کا معقول تھا۔

کہتے ہیں کہ آدمی اچھا، خوش مزاج، یار باش، خوش وضع، خوش انداز، جلیل القدر، حسب و نسب میں اعلیٰ، ملکوں میں نام ور اور شاعر اور منشی قابل تعریف تھا۔ دم اُس کا بھی غنیمت تھا۔ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا اور ۱۲۸۵ھ میں ۷۳ برس کی عمر پا کر روضۂ رضواں میں جاگزیں ہوا۔ جس نے سُنا اس کے مرنے کا افسوس کیا۔ لیکن جب تک اس کا کلام، جو اُس نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے، روئے زمین پر قائم رہے گا، وہ زندہ تصور کیا جائے گا اور نام اس کا یادگار رہے گا۔ اب ہماری بھی یہی دعا ہے کہ غفور الرحیم اُس کی مغفرت کرے۔

●●

پہلا غالب پرست

محمد قاسم صدیقی

مولانا حالی نے یادگارِ غالب لکھ کر غالب کو زندۂ جاوید بنانے کی کوشش کی تھی اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ اس لئے کہ مولانا حالی سے لے کر آج تک "یادگارِ غالب" سے جامع کتاب غالب کے حالاتِ زندگی پر نہیں لکھی گئی۔ لیکن مولانا حالی کے اسلوبِ نگارش میں وہ بات نہ تھی کہ کسی کو چونکا دیتی۔ اس لئے آہستہ آہستہ غالب کی یاد پر ایک پردہ سا پڑتا گیا۔ پھر غالب کا ایک سودائی اٹھا جو خود بھی ایک مصوّر تھا اور اس نے غالب کی یاد پر جمی ہوئی دھول کو صاف کیا۔ غالب کی تصویر کو ایک نئے ڈھنگ سے دیکھا۔ اس مصوّر کا نام عبدالرحمٰن بجنوری تھا۔

غالب کو غالب بنانے میں جتنا ہاتھ مولانا حالی کا تھا، عبدالرحمٰن بجنوری کا اس سے کم نہ تھا بلکہ اگر سچ پوچھا جائے تو غالب کو نیا قالب دینا بجنوری کا کارنامہ تھا۔ غالب نے جو کچھ کہا تھا اس میں بجنوری کا کوئی اضافہ کرنے کا سوال تو تھا نہیں بلکہ سوال اسے سمجھنے اور سمجھانے کا تھا اور انہوں نے اسے بالکل نئے ڈھنگ سے سمجھنے کی مزید کوشش کی، بقول رشید احمد صدیقی "اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کو نفسیاتی اسلوب تنقید کی روشنی میں پہلے پہل بجنوری مرحوم ہی نے پیش کیا۔ یہ بجنوری مرحوم کے مقالے کا تصرف ہے کہ آج کل کے پڑھے لکھوں میں غالب سے شیفتگی پیدا ہوئی اور اربابِ ذوق و فکر نے غالب ہی نہیں بلکہ دوسرے شعراء کو بھی بجنوری مرحوم ہی کے اندازِ تنقید سے جانچنا اور پرکھنا شروع کیا۔"

"محاسنِ کلامِ غالب" کے پہلے جملے سے ہی غالب پرستی کا اعلان ہو جاتا ہے۔

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوانِ غالب"۔ بجنوری نے دیوانِ غالب کو الہامی کتاب مان کر غالب کے مصرع کی تردید کر دی ؎

"تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا!"

بجنوری کو بادہ خواری کے باوجود غالب کی ولایت میں شبہ نہ تھا۔ انہوں نے اپنے لئے ایک الگ راہ اختیار کی تھی۔ یہ اندازِ فکر خود چونکا دینے والا۔ خواہ اُن کے نقطۂ نظر سے اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن اُن کے خلوص سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قاضی عبدالغفار نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"محاسنِ کلامِ غالب کے متعلق عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے اپنا جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے اگر اس سے بعض نقادِ فن اختلاف بھی کریں تب بھی وہ بجنوری کی وسعتِ نظر اور عالمانہ اندازِ تنقید کا وزن ضرور محسوس کریں گے۔"

بجنوری نے اگر دیوانِ غالب کو الہامی کتاب مانا تو بے جا نہیں۔ اس لئے کہ اُن کا خیال تھا اور صحیح تھا کہ "کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں۔" اور اسی لئے انہوں نے غالب کو ایک "ادب المتنوع" تسلیم کیا ہے۔

عبدالرحمٰن بجنوری

غالب پر اُن کا یہ دیباچہ جو بعد کو "محاسنِ کلامِ غالبؔ" کے نام سے شائع ہوا، غالب کے سلسلہ میں سب سے اہم دستاویز ہے۔ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر آج جب کہ غالب کی صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے، اُس پہلے غالب پرست کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ۱۸۸۲ء میں سیوہارہ (ضلع بجنور) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد خان بہادر نور الاسلام کوئٹہ میں انجینئر تھے۔ اس لئے اُن کی پرورش کوئٹہ ہی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بھی کوئٹہ ہی میں ہوئی۔ پرورش انگریزی ماحول میں ہوئی، اور بنیادی مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی پڑھائی گئی۔ لیکن اعلیٰ تعلیم علی گڑھ میں شروع ہوئی۔ جہاں اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ "علی گڑھ" میں پوری پوری دلچسپی لی۔ شعیب قریشی، عبدالرحمٰن بندھی اور ڈاکٹر سید محمود اُن کے ساتھی تھے اور اُن کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ علی گڑھ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد بیرسٹری کے لئے انگلستان روانہ ہو گئے۔ بجنوری کو شروع سے انگریزوں سے منافرت تھی۔ بیرسٹری کا امتحان شاندار کامیابی کے ساتھ پاس کرنے کے بعد وہیں انگلستان میں انگریزوں کے خلاف کام شروع کر دیا۔ چنانچہ اُن کے خلاف ایک سازش کی گئی لیکن اُن کے پاس ایک ملازم یہودی تھا۔ اُسے اس سازش کی کچھ بھنک پڑ گئی اس نے وہ اس سے آگاہ ہو گئے اور فوراً فرانس چلے گئے۔ فرانس میں رہ کر آپ نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے لئے مقالہ لکھا۔ یہ مقالہ جرمنی زبان میں لکھا گیا اور وہیں چھپا۔ یہ مقالہ ہفتہ پر ہے۔

جرمنی سے ڈگری لینے کے بعد وطن واپس آ گئے اور مرادآباد میں وکالت شروع کر دی۔ اسی زمانے میں کلامِ پاک کا جرمنی زبان میں ترجمہ کیا۔ آپ ایک مرتبہ ترکی بھی گئے لیکن وہاں آپ پر جاسوسی کا الزام لگا دیا گیا اور چھ ماہ وہاں کی جیل میں بند رہے۔

ہندستان کی آزادی اور دوسرے مسائل پر مہاتما گاندھی سے آپ کی تفصیلی بات ہوئی تھی۔ آپ کو مادرِ درسگاہ علی گڑھ سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اور آپ کا خیال تھا کہ اس قسم کی کئی یونیورسٹیاں قائم کی جائیں، اسی لئے جب یونیورسٹی کا قانون بنا تو ڈاکٹر بجنوری نے دہرہ دون میں ایک اسکیم بنائی اور اپنے دوستوں، خاص طور سے شعیب قریشی، عبدالرحمٰن سندھی، ڈاکٹر سید محمود کو شریک کیا۔ پھر یونیورسٹی کے ڈھانچے کو تبدیل کرنے کے لئے جب ایک کمیٹی بنائی گئی تو اُس کے سلسلہ میں مشاورتی جلسہ ڈاکٹر بجنوری نے امروہہ میں طلب کیا۔

آپ کی غیر معمولی لیاقت کو دیکھتے ہوئے انگریزوں نے آپ کو نوکری دینی چاہی۔ اس سے اُن کی مُراد یہ بھی تھی کہ وہ انگریزوں کے خلاف اپنی آواز کو بند کر دیں۔ لیکن اُنہوں نے صاف انکار کر دیا۔ نظام حیدرآباد نے بھی خواہش ظاہر کی کہ وہ وہاں آ جائیں۔ لیکن آخر نواب حمید اللہ خاں (بھوپال) نے اپنا مصلاح کار بنا لیا۔ نواب صاحب بھوپال آپ کے کلاس فیلو تھے اور اُن کی پیشکش آپ نہ ٹھکرا سکے۔ اور بھوپال میں رہنے لگے۔ وہیں دیوانِ غالب نظر سے گذرا۔ یہ نسخہ بھوپال کے فوجدار خاں کو نذر کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً اُس کو چھپ سے طبع کرانے کے انتظامات کئے، لیکن وہ نسخہ "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے اُن کے انتقال کے بعد چھپا۔

ڈاکٹر بجنوری کے خطوط کے مجموعے "باقیاتِ بجنوری" اور "یادگارِ بجنوری" کے نام سے چھپے ہیں۔ جن سے اس دور پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ان دونوں مجموعوں میں مضامین بھی شامل ہیں۔ جو اُن کی جدت طرازی کا نقش ہیں۔

"محاسنِ کلامِ غالب" میں دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اور آج بھی غالب پر اتنا کام ہونے کے باوجود اس پائے کا مقالہ نہیں لکھا جا سکا۔

■ ■

غالب کی برسی پر غالب کے نام کی تجارت

غلام احمد فرقت

فرقہ پرستی اور اُردو کشی کا ٹھیکہ لینے کے بعد جب دیس آزاد ہوا اور ملک کی قومی زبان پر اُردو زبان کا بکرا صدقے کر کے اُس کا گوشت چیل کوؤں کو دیا جا چکا تاکہ قومی زبان نظرِ بد سے بچی رہے تو کچھ ستم ظریفوں کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ حضور! اس کی ہڈیوں کو دیکھ لیا جائے کہ کوئی ایسی بوٹی تو لگی نہیں رہ گئی ہے جس میں جان باقی ہو اور چھپکلی کی دُم کی طرح جسم سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی وہ زمین پر رقصاں رہے۔

اس پر ایک اُردو کش اور ماہر لوٹ کھسوٹ بولا کہ بجا ہے! اب مزید فکر و تردد کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ اس زبان کی جو ہڈیاں باقی رہ گئی ہیں۔ اُن کی کھپت کا بھی ہماری کانگریس نے پورے طور پر انتظام کر لیا ہے اور اُس کی ہڈی کی شکر بنانے والوں سے ٹنڈر طلب کرلئے گئے ہیں اور اب اس کی شیرینی اور لطافت کے مزے اس شکر کی گرانی میں چار روپے سیر شکر کھانے والے لوٹیں گے۔ اس کے بعد یہ طے پایا کہ اس

زبان کے شعراء کے پنڈوں کو ٹٹول کر دیکھا جائے کہ ان شعراء میں کس کے کاندھے اتنے مضبوط ہیں جن پر رکھ کر سیاسی بندوق چلائی جا سکتی ہے۔ اس لئے اردو کے تمام شعراء کے کاندھے ٹٹولتے ٹٹولتے جب ہماری کانگریس کا ہاتھ مرزا غالب کے کاندھے پر پڑا تو قاتلان اردو کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ صرف مرزا صاحب کے کاندھے اتنے مضبوط ہیں، جن پر سیاست کی بھاری بندوق رکھ کر چلائی جا سکتی ہے۔ اور اردو داں طبقے کا تھوڑا بہت خون جو بچ رہا ہے اُسے بھی چوسا جا سکتا ہے۔ اتفاق سے مرزا صاحب مرے بھی ایسے موقع پر تھے کہ اب کچھ دنوں بعد انہیں مرے پورے سو سال ہو جائیں گے۔ اس نے متفقہ طور پر طے پایا کہ مرزا صاحب کے کاندھے تمام شعراء میں زیادہ جان دار اور مضبوط ہیں، انہیں کو استعمال کیا جائے۔ اس پر مرکزی کانگریس نے کہا: بھائیو! ہم پر اور ہمارے ساتھیوں پر براہ راست اردو کشی کا الزام ہے اور ہم نے اسے شجر ممنوعہ قرار دیا ہے۔ اس لئے ازراہ ہمدردی سب سے پہلے ہمیں مرزا صاحب کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانے کی اجازت دی جائے۔

اس پر قاتلان اردو کی طرف سے لبیک لبیک کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اور مرکزی کانگریس کی طرف سے ایک سنٹرل غالب کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ اور قاتلان اردو کے چودھری کی طرف سے ایسے عہدے دار اس کمیٹی میں مقرر کئے گئے جن میں بیشتر حضرات وہ تھے جنہیں اس کی بھی اطلاع نہ تھی کہ مرزا غالب ابھی حیات ہیں یا اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اس کمیٹی کے سکریٹری نے عہدہ قبول کرنے سے پہلے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ حضرات! عام کانگریسیوں کی طرح یوں تو ہر عہدہ مجھے جان و دل سے قبول ہے مگر میں کیا عرض کروں، تمام مشاعروں میں اگرچہ میں پابندی سے شریک ہوتا رہتا ہوں لیکن عجیب اتفاق ہے کہ مشاعروں میں ہر بڑے سے بڑا شاعر تو دکھائی پڑا، مگر مرزا صاحب آج تک کسی مشاعرے میں نظر نہ آئے۔ اس پر اس کمیٹی کے ایک عہدے دار نے کہا، میاں! وہ بوڑھے آدمی ہیں اور اب اُن کی عمر سو سال کی ہونے کو آئی، اس لئے وہ زیادہ تر گھر ہی پر رہتے ہیں۔ اس پر ایک تیسرے عہدے دار نے کہا، جناب! اس جشن کی تیاریاں تو بڑے زور و شور سے ہو رہی ہیں لیکن کسی نے مرزا صاحب سے بھی اُن کی برسی منانے کی اجازت حاصل کر لی ہے؟ اس لئے میری تجویز ہے کہ سب سے پہلے کیوں نہ مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھ لیا جائے کہ وہ اپنی برسی منانے کو تیار بھی ہیں؟ ایسا نہ ہو کہ جب چندہ وندہ جمع ہو جائے تو عین موقع پر مرزا صاحب اور اُن کی بیوی جھاڑو پنجہ لے کر کھڑی ہو جائیں اور آدھو آدھ کا مطالبہ کریں اور بیگم صاحبہ حق زوجیت کے لئے ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہو جائیں۔ ع

دکھ سہیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں

اس پر ایک نیتا نے گرم ہو کر کہا۔ اگر یہ صورت ہوئی تو چندہ جمع کرنے والوں کا محنتانہ نکال کر سارا چندہ ہندی پرچارک سبھا کو دے دیا جائے گا۔ ایک صاحب بولے کیوں نہ مرزا صاحب کے ڈکوں سے چل کر منظوری حاصل کر لی جائے، اس پر سکریٹری صاحب نے فرمایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ صرف بڑے صاحب زادے کی منظوری حاصل کر لی جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ اپنے باپ کے کانوں تک یہ بات پہنچا دیں کہ انہوں نے صد سالہ برسی کی منظوری دے دی ہے۔ بلکہ اگر ممکن ہو اور مرزا صاحب دستخط کر سکیں تو اُن سے دستخط بھی لے لئے جائیں۔ ورنہ اُن کی بیوی سُنا ہے اتنی بکٹ ہیں کہ مصلّے پر کوس کوس کر سارے چندہ جمع کرنے والوں کو کھا جائیں گی۔ دوسرے صاحب بولے: اسی لئے تو مرزا صاحب کی گھر میں قدم رکھتے جان نکلتی ہے۔ ادھر ڈیوڑھی سے انہوں نے گھر میں قدم رکھا ادھر وہ جھاڑو پنجہ لے کر دوڑی۔

اس پر سکریٹری صاحب سے لکھنؤ کے ایک صاحب نے

آنکھ مار کر کہا کہ حضرت! اگر جان کی امان پاؤں تو ایک بات عرض کروں! ہر طرف سے "ضرور! ضرور!" کی آوازیں بلند ہوئیں۔ فرمایا قبلہ گستاخی معاف! قسم آپ کے سرِ اقدس کی، ایک دن تو جب میں مرزا صاحب سے ملنے گیا ہوں تو میں نے خود مرزا صاحب کی شان میں بیوی کو ناپسندیدہ الفاظ استعمال کرتے سُنا ہے۔ قسم قرآن پاک کی! کیا زبان کی مار دے رہی ہے یہ جلے تن عورت اتنے بڑے شاعر کو۔ اس پر اُن کے ایک ساتھی نے اپنے دوست سے آنکھ مار کر کہا۔ مگر قسم جنابِ امیر کی! مرزا صاحب نے بھی تو بیوی کو تپانے میں کوئی تسمہ باقی نہیں رکھا اور ایک نکھٹی ڈومنی سے عشق کر کے گھر والی کے سینے پر پوری زندگی مونگ دلی ہے۔

اس پر ایک نیتا نے کہا، مگر مسلمانوں میں تو چار شادیاں جائز ہیں۔ پھر اگر انہوں نے ایک ڈومنی ڈال لی تو کون سا بڑا گناہ کیا!

اس پر لکھنؤ والے صاحب بولے حضرت وہ شیعہ مذہب تھے اس لئے انہوں نے ڈومنی کو حلال کرنے کے لئے متعہ ضرور کیا ہوگا۔ اور اگر نہ ڈالتے تو کیا کرتے۔ ترکی النسل تھے۔ کب تک سوالیہ چلّے کا نشان بنے پھرتے، پھر جب گھر والی رُخ ہی نہ ملائے تو شوہر کیا کرے۔ اس پر نیتا جی نے کہا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ نس بندی کرا لیتے تاکہ چیں پیں سے تو نجات ملتی۔ اس پر سکریٹری صاحب بولے —— جناب! ہنسی مذاق برطرف، پہلے اس کی تحقیق تو کر لی جائے کہ اُن کے لڑکوں میں کتنے پاکستان میں ہیں۔ ایسا تو نہیں کہ انہوں نے وہاں کی شہریت اختیار کر لی ہو۔ کیوں کہ اس صورت میں جو لڑکے پاکستانی شہریت اختیار کئے ہوں گے وہ بھارت دشمنی میں کسی قیمت پر یہ تقریب منانے کی منظوری نہ دیں گے۔ اور اگر یہاں باپ کی تقریب منائی گئی تو وہاں پاکستانی حکومت انہیں دھر لے گی۔ ایک صاحب بولے یہ سیاسی گُلّی ڈنڈے کی بھی خوب رہی۔

نشانہ تا کجا دل پر جگر کے پار ہو جانا

بھلا اس سیاسی بھنگے پن کا بھی کوئی علاج ہے؟ وہاں باپ چوری کرے اور بیٹا یہاں پکڑا جائے۔ کرے داڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا۔ اس پر یو۔پی کی غالب کمیٹی کے ایک رُکن بولے۔ صاحب! ان سب سیاسی جھگڑوں سے بچنے کی صورت ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ اُن کی صد سالہ برسی ہندی میں منائی جائے۔ کیوں کہ ہندی کی جدید تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ جتنے اُردو کے بڑے بڑے شاعر گزرے ہیں وہ دراصل ہندی کے شاعر تھے۔ اور جتنی تاریخی عمارتیں مسلمان بادشاہوں کے نام سے منسوب ہیں وہ سب ہندوؤں کی بنوائی ہوئی ہیں۔ اوک صاحب کے کوئی دُور کے رشتہ دار جو ہندی شعرا پر تحقیق کر رہے ہیں۔ اوک صاحب کی طرح اُن کی ذاتی تحقیق یہ ہے کہ اُن کی ساری کویتائیں ہندی میں تھیں لیکن کسی میاں بھائی نے اُن سب کا اُردو میں ترجمہ کر کے انہیں اُردو کا شاعر مشہور کر دیا۔ بلکہ ایک ہندی کے محقق نے تو یہاں تک دریافت کر لیا ہے کہ اُن کا اصلی نام پرشوتم داس لپ لپ تھا اور انہوں نے چار کتابیں ہندی میں لکھی تھیں۔ اوّل "اودے ہندی"، دوسرے "بھوودان کھاتے" تیسرے "شبد بین" اور چوتھے "کہاں تھے بھگوان؟"۔ اُردو والوں نے "عودِ ہندی" کو بجائے "الف" کے "عین" سے بدل دیا ہے۔ بقیہ نام "بُرہانِ قاطع"، "سبدِ چیں" اور "قاطعِ بُرہان" رکھ کر ساری کتابوں کو اپنا لیا۔ اُن کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خالص برہمن تھے۔ چنانچہ اُن کا یہ شعر تو براہِ راست اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ وہ برہمن تھے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اس پر "اِتی سُندر! اِتی سُندر!" کی آوازیں بلند ہوئیں۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔ ان حالات میں ہماری یہ تقریب قومی یکجہتی کی ایک جیتی جاگتی مثال بن جائے گی۔ اور ہم بہت آسانی سے ہندوؤں اور مسلمانوں سے لمبے لمبے چندے

اور ڈونیشن دے سکیں گے۔ ایک صاحب جو ابھی تک خاموشی سے ان تمام باتوں کو سُن رہے تھے، بولے، بھائیو! میں نے مرزا غالب کو جتنا پڑھا ہے، اُتنا آپ حضرات میں سے شاید ہی کسی نے پڑھا ہوگا مگر مجھے کچھ ایسا خیال پڑتا ہے۔ جیسے مرزا غالب مر چکے ہیں۔ اُس پر ایک لکھنؤ والے نے اپنا سینہ پیٹ کر کہا۔ ہے ہے!

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

لے سچ سچ بتایئے: یہ منحوس خبر آپ نے کس اخبار میں پڑھی؟ ابھی پرسوں تو وہ اپنی ڈیوڑھی میں بیٹھے شوربے میں روٹی بھگو کر کھا رہے تھے۔ وہ تو کہیے قسمت میں آخری دیدار لکھا تھا جو ہو گیا، ورنہ میں بالکل خالی الذہن اُن کے دروازے کے پاس سے چلا جا رہا تھا کہ ایک دم کسی کے کھانے کی آواز کانوں میں پڑی۔ مُڑ کر دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب بیٹھے شوربہ بھگا کا کھا رہے تھے۔ بوڑھے آدمی، دانت جوانی ہی میں گر چکے تھے۔ اسی لیے روٹی شوربہ میں بھگو کر کھاتے تھے۔ ایک تیسرے صاحب نے کہا کہ صاحب! جہاں تک اِس منحوس خبر کا تعلق ہے، مجھے بھی اس میں کچھ صداقت معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ سویرے ایک صاحب کہتے جا رہے تھے:

حیف غالب مُرد!

کوئی فارسی داں معلوم پڑتے تھے۔ اس پر کانسٹی ٹیوشن کلب کے ایک رُکن جو غالب سنٹرل کمیٹی میں اس وجہ سے شامل کر لئے گئے تھے کہ وہ ذرا پیسے والے تھے اور اُن سے ڈٹ کر چندہ وصول ہوا تھا، بولے، ابھی گذشتہ ہفتے نہ جانے کہاں مشاعرہ تھا، جس کی صدارت اُنہوں نے فرمائی تھی۔ اِس پر ایک صاحب نے اُن کے بیان کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ جناب! وہ مرزا صاحب نہیں، جوش ملسیانی صاحب تھے۔ جن کی شکل کثرتِ استعمال سے اب غالب جیسی ہو گئی ہے۔ اور وہ ماشاء اللہ ابھی بقیدِ حیات ہیں۔ اتنے میں ایک محترمہ جو ابھی ابھی آئی تھیں غصے میں تمتمے بُھلا کر بولیں۔ آپ حضرات یہ کیا جہالت کی باتیں کر رہے ہیں؟ میں مرزا صاحب کی پڑنواسی ہوں، اُنھیں مرے ننانوے سال ہو چکے ہیں۔

اس پر ہر طرف سے آوازیں بلند ہوئیں، تو پھر عورتوں کی جو کمیٹی زنانخانوں سے چندہ وصول کرنے کے لیے بنی ہے، اُس کا صدر آپ کو بنا دیا جائے۔ آپ کی موجودگی میں چندہ بھی اچھا وصول ہوگا۔ اور مرزا صاحب کی عظمت کا رُعب بھی عورتوں پر اچھا پڑے گا۔

جب غالب کی صد سالہ برسی کی خبریں دُنیا کے گوشے گوشے میں ہندوستان کی گرانی، رشوت ستانی، ذخیرہ اندوزی اور قرض خواہی کی طرح پھیل گئیں تو ہندوستان کی عورتوں اور مَردوں نے اپنی اپنی ولدیت بدل بدل کر اعلان کرنا شروع کر دیا کہ اُن کا سلسلۂ نسب غالب تک گیا ہوا ہے۔ اور عوام نے مرزا صاحب کے کندھے پر اپنی اپنی بندوقیں رکھ کر چھوڑنا شروع کر دیا۔ بازاروں میں غالب بیڑی، غالب سگریٹ، غالب قلفے، غالب قلفیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ریڈی میڈ کپڑے والوں نے غالب لنگوٹ، غالب جمپر، غالب شلوار، غالب شمیز، غالب پتلون، غالب انگوچھا، غالب نکریں سی سی کر دوکانوں پر لٹکائیں۔ کچھ لوگوں نے غالب ریستوران، اور غالب ہوٹل کھول کر وزیروں سے اُن کا افتتاح کروانا شروع کر دیا!

جب نواب احسن صاحب کو عالمِ نزع میں معلوم ہوا کہ ملک میں غالب کا طوطی بول رہا ہے تو اُنہوں نے اپنی لڑکی اور لڑکے کو جنہوں نے ہندی میں بورڈ سے ہائی اسکول اور انٹر میڈیٹ تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ اپنے پاس بُلا کر وصیت کی کہ بیٹا! میں تو دُنیا سے جا ہی رہا ہوں لیکن تم دونوں کو وصیت کرتا ہوں کہ تم دونوں غالب کی زندگی کے کسی پہلو کو لے کر اُس پر تھیسس ضرور لکھنا۔ ورنہ قبر میں میری پیٹھ نہ لگے گی اور

میں میدانِ حشر میں تم دونوں کا دامن گیر ہوں گا۔ اس پر جو لوگ نواب اعظن صاحب کی عیادت کو آئے تھے اُن میں بحث شروع ہوگئی۔ اعظن صاحب کے چچازاد بھائی میرن صاحب کہنے لگے کہ حضت! غالب پر تھیسس لکھنا سر دست زندگی کو خطرے میں ڈالنے سے کم نہیں۔ اس لئے انہوں نے الہ آباد سے آئی ہوئی ایک خبر کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ ہندوستان میں صرف غالب پر ریسرچ کئے ہوئے طلباء کی تعداد اس وقت تک دو ہزار سے اوپر پہنچ چکی ہے، اور اس سلسلے میں بتایا کہ ابھی حال میں الہ آباد یونیورسٹی میں مرزا غالب پر تحقیق اور تدقیق کا جو شعبہ قایم ہوا ہے اُس میں ایک ریسرچ اسکالر کی جگہ خالی ہوئی تھی۔ جن میں تقریباً پانچ سو طلباء کو جو غالب پر پی ایچ ڈی کئے ہوئے تھے، پروفیسر احتشام حسین صدر شعبۂ اُردو نے انٹرویو کے لئے طلب کر لیا۔ انٹرویو والے دِن اُمیدواروں کو جب کیو میں کھڑا کیا گیا تو یونیورسٹی کی سڑک پر ٹریفک جام ہوگئی۔

اس پر پولیس نے اعتراض کیا اور اُمیدواروں کو پہلے تو وارننگ دے کر ہٹانے کی کوشش کی۔ لیکن جب وہ کسی طرح ہٹنے کو تیار نہ ہوئے تو پولیس کو اُن پر ٹیئر گیس چھوڑنا پڑی اس کے بعد بھی جب وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے تو پولیس نے اُن پر لاٹھی چارج کر دیا۔ جھوٹے بڑے تین پی۔ ایچ۔ ڈی۔ زخموں کی تاب نہ لا کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس پر ایک صاحب سینہ پیٹ کر بولے۔ ہائے ہائے! کیسے کیسے جوان کام آئے ہوں گے! قبلہ! میں نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ الہ آباد میں جو حالیہ فساد ہوا ہے وہ اسی کا شاخسانہ تھا۔ ایک تیسرے صاحب بولے جناب! میں تو اب جب کسی کالج کے سامنے طلباء پر لاٹھی چارج کی خبر سُنتا ہوں تو سمجھ لیتا ہوں کہ ہو نہ ہو وہاں کوئی اُردو کی جگہ خالی ہوئی ہو گی اور زخمی ہونے والوں میں کچھ نہیں تو پی۔ ایچ۔ ڈی تو ضرور ہی ہوں گے۔

خیر اس قسم کی چہ می گوئیاں تو ہر مرنے والے پر ہوتی رہیں گی، لیکن ایک دن جب میں مرزا صاحب کی صد سالہ برسی پر ایک مضمون لکھ رہا تھا اور اُن کا اور اُن کے ہم عصر ذوقؔ کا دیوان دیکھ رہا تھا کہ مجھے اُن کے بعض اشعار پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ جس وقت مرزا کا انتقال ہوا ہے اُس وقت کچھ اس پھُرتی سے اُن کی روح جسم سے پرواز کر گئی کہ اُنہیں معلوم ہی نہ ہوا کہ جان کنی کسے کہتے ہیں؟ اور عالمِ سکرات میں کن کن اذیتوں سے انسان کو دوچار ہونا پڑتا ہے اسی لئے وہ اب تک قبر میں لیٹے اِس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ انہیں احاطہ کالے صاحب سے نظام الدین اولیاءؒ محض تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے منتقل کر دیا گیا ہے اور وہ لیٹے لیٹے اپنے موجودہ استعمال پر بدحواس ہو ہو کر یہ خطرہ محسوس کر رہے ہیں کہ کہیں اس صد سالہ برسی کے موقعے پر انہیں قبر سے نکلوا کر حکومت کے سپرد نہ کر دیا جائے اور اُن کا ڈھانچہ جگہ جگہ جلسوں اور سرکاری تقریبوں میں اس طرح استعمال ہونا شروع ہو جائے جس طرح کسی لاوارث کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے میڈیکل کالج کے طلباء کو دے دی جاتی ہے۔

ایک مرتبہ رمضان شریف کا مہینہ ختم ہونے کے بعد مرزا صاحب قلعہ گئے تو بہادر شاہ ظفرؔ نے پوچھا:
"کہئے مرزا صاحب! آپ نے کتنے روزے رکھے؟"
مرزا نوشہ نے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا۔
"پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔"

مرزا غالب جس مکان میں رہتے تھے اس مکان میں دروازے کی چھت پر ایک کمرہ تھا اسی کمرہ کے ایک جانب ایک تنگ و تاریک کوٹھری تھی جس میں ہمیشہ فرش بچھا رہا کرتا تھا گرمیوں کے موسم میں مرزا اکثر دھوپ سے بچنے کے لئے اس کوٹھری میں سہ پہر کے تین چار بجے تک بیٹھتے تھے —— ایک دن اتفاق سے رمضان کے مہینے میں مرزا صاحب اسی کوٹھری میں بیٹھے کسی کے ساتھ شطرنج یا چوسر کھیل رہے تھے کہ مفتی صدرالدین آزردہ دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے چلے آئے۔ مرزا کو اس طرح رمضان کے مہینے میں شطرنج یا چوسر کھیلتے دیکھ کر مفتی صاحب نے کہا کہ:

"—— مرزا صاحب ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید ہوتا ہے مگر آج اس حدیث کی صحت میں کچھ شبہ سا ہو رہا ہے ——"

مرزا نوشہ نے برجستہ جواب دیا۔

"قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے مگر بات یہ ہے کہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری ہے ——"

★

حکیم رضی الدین خاں جو مرزا غالب کے خاص دوستوں میں تھے اور دلی کے ایک نامی گرامی طبیب بھی تھے مگر عجب اتفاق ہے کہ انہیں آم مرغوب نہ تھے —— ایک دن کا ذکر

ہے کہ حکیم صاحب مرزا غالب کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ آموں کا موسم تھا اور گلی میں آموں کے چھلکے پڑے ہوئے تھے ایک گدھے والا ادھر سے اپنے گدھے لئے ہوئے گزر رہا تھا۔ گدھے نے رک کر آم کے چھلکے سونگھے اور آگے بڑھ گیا یہ دیکھ کر حکیم صاحب نے مرزا غالب کو مخاطب کر کے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"—— دیکھو مرزا، تم آموں کی بڑی تعریف کرتے ہو مگر آم ایسی چیز ہے کہ اسے گدھے بھی نہیں کھاتے —"

مرزا غالب نے بھی نہایت سنجیدگی سے فرمایا۔

"جی ہاں، بے شک گدھے آم نہیں کھاتے۔"

★

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کسی صاحب نے مرزا غالب کے سامنے شراب کی بے انتہا مذمت کی —— مرزا صاحب دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہے اور جب نہ رہا گیا تو ان صاحب سے پوچھا کہ:

"آخر شراب میں ایسی کون سی برائی ہے؟"

وہ صاحب بولے۔

"حضرت، پہلی برائی تو یہی ہے کہ شرابی کی دعا قبول نہیں ہوتی۔"

یہ سن کر مرزا صاحب نے ان سے کہا کہ:

"ذرا یہ تو بتاؤ کہ جس کے پاس شراب موجود ہے۔ پھر اس کم بخت کو اور کون سی دعا کی ضرورت ہے۔"

★

ایک مرتبہ جاڑے کے زمانے میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، مرزا غالب کے مکان پر ان سے ملنے کے لئے آ نکلے مرزا غالب شغل مے میں لگے ہوئے تھے —— نواب صاحب کو دیکھ کر ان کی طرف مرزا صاحب نے شراب کا گلاس بڑھا دیا، اور کہا:

"لیجئے نا ——"

نواب شیفتہ خاموشی سے دیکھتے رہے۔

مرزا صاحب نے پھر خود ہی سکوت توڑتے ہوئے کہا:

"کیا حضرت جاڑے میں بھی نہیں پیتے —؟"

★

شام کو اکثر مرزا غالب کے خاص خاص شاگرد اور بے تکلف دوست جمع ہو کر ان کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ مرزا سرور و کیف کے عالم میں بڑی پُر لطف اور دل چسپ باتیں کیا کرتے تھے۔

ایک دن اسی طرح مرزا صاحب پلنگ پر دراز تھے کہ اتنے میں میر مہدی مجروح آ گئے اور بہ کمال محبت مرزا کے پاؤں دابنے لگے —— مرزا صاحب نے لاکھ لاکھ کہا کہ:

"ارے تو سید زادہ ہو کر پاؤں دباتا ہے مجھے کیوں گناہ گار کرتا ہے؟" مگر جوش عقیدت اور خلوص کی فراوانی اتنی تھی کہ یہ کون سنتا ہے میر مہدی مجروح برابر پاؤں دابتے رہے جب مرزا صاحب نے بہت زور دے کر منع کیا تو میر مہدی مجروح بولے۔

"اگر آپ کو ایسا خیال ہے تو پاؤں دابنے کی اجرت دے دیجئے گا۔"

مرزا صاحب نے فرمایا۔

"خیر، یہاں تک کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"

جب میر مہدی پاؤں داب چکے تو بولے۔

"لائیے حضرت میری اجرت دلوائیے۔"

مرزا صاحب نے کہا۔

واہ بھئی واہ۔ اماں اجرت کیسی؟ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمہاری اجرت دابی دونوں برابر ہو گئے۔"

★

مرزا غالب کو بھی غدر کے ہنگامے کے بعد جب پکڑا دھکڑی شروع ہوئی تو بلایا گیا ـــــ یہ کرنل براؤن کے روبرو پیش ہوئے تو وہی کلاہ پپاخ جو یہ پہنا کرتے تھے حسب معمول ان کے سر پر تھی جس کی وجہ سے کچھ عجیب وغریب وضع قطع معلوم ہوتی تھی۔ انہیں دیکھ کر کرنل براؤن نے کہا۔

"ول مرزا صاحب تم مسلمان ہے ؟"

مرزا صاحب نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

"آدھا مسلمان ہوں۔"

کرنل براؤن نے کہا۔

"آدھا مسلمان کیا؟ اس کا مطلب ؟"

مرزا صاحب بولے۔

"آدھا یوں کہ شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا۔"

یہ سن کر کرنل براؤن بہت محظوظ ہوا اور مرزا صاحب کو اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔

★

جب نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور کا انتقال ہو گیا تو مرزا غالب بھی بسلسلۂ تعزیت رام پور تشریف لے گئے۔ انتقال نواب یوسف علی خاں کے بعد نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے ـــــ اتفاقاً ایک دن نواب کلب علی خاں صاحب لفٹننٹ گورنر سے ملنے کے لئے بریلی جا رہے تھے روانگی کے وقت جہاں اور بہت سے لوگ تھے، مرزا غالب بھی موجود تھے۔ مرزا غالب سے رخصت ہوتے ہوئے رسماً نواب کلب علی خاں صاحب نے کہا۔

"اچھا مرزا صاحب، خدا کو سونپا۔"

مرزا صاحب نے کہا۔

"حضور غضب ہے ـــ۔"

نواب صاحب نے پوچھا۔

"کیوں ـــ ؟"

"خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا تھا آپ پھر خدا کے سپرد کئے دیتے ہیں۔" مرزا صاحب نے بڑی متانت سے کہا۔

★

جب مرزا غالب نے "قاطع برہان" لکھی تو مخالفین کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ ہر طرف سے جواب لکھے گئے ان ہی جواب لکھنے والوں میں سے ایک صاحب امین الدین نامی بھی تھے جنہوں نے "قاطع برہان" کے جواب میں "قاطع قاطع" لکھی تھی، چوں کہ "قاطع قاطع" کی بنا صرف بدگوئی اور فحش گوئی پر رکھی گئی تھی لہٰذا مرزا صاحب نے اس کا کوئی جواب بھی نہ دیا اور خاموش بیٹھے رہے ـــــ مرزا صاحب کے ہم نواؤں میں سے کسی نے کہا۔

"مرزا صاحب آپ نے کوئی جواب نہیں دیا ـ ؟"

مرزا صاحب نے فرمایا کہ۔

"حضرت اگر کوئی گدھا آپ کے لات مار دے تو آپ کیا جواب دیں گے ـــ"

★

ایک روز شام کے وقت کہ سورج غروب ہونے کو تھا مرزا صاحب کا کھانا گھر سے آیا۔ کھانے میں صرف شامی کباب تھے۔ مرزا صاحب نے کھانا شروع کر دیا۔ اتفاق سے اس وقت مولانا حالی بھی بیٹھے تھے انھوں نے رومال نکال کر مکھیاں جھلنا شروع کر دیا مرزا صاحب نے انھیں مخاطب کر کے کہا۔

"بھیا تم بے کار تکلیف کرتے ہو میں ان کبابوں میں سے تمہیں کچھ بھی نہ دوں گا۔"

مولانا حالی ہنس پڑے پھر مرزا صاحب نے ایک لطیفہ سنایا کہ نواب عبدالاحد خاں کے دسترخوان پر ان کے مصاحبوں عزیزوں اور دوستوں کے لئے ہر قسم کے کھانے چنے جاتے تھے

مگر صرف نواب صاحب کے لئے ہمیشہ ایک خاص چیز تیار ہوتی تھی وہ صرف اسی کو کھاتے اور دوسرے کھانوں کی طرف توجہ نہ کرتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ان کے لئے مزعفر پکا تھا اور وہی ان کے سامنے لگایا گیا۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم نواب کا بہت مونہہ چڑھا تھا۔ نواب صاحب نے اس کو کھانا دینے کے لئے خالی پلیٹ مانگی۔ پلیٹ کے آنے میں دیر ہوئی۔ نواب صاحب کھانا کھاتے جا رہے تھے اور خالی پلیٹ بھی برابر مانگے جا رہے تھے۔ وہ ڈوم نواب صاحب کے سامنے رومال ہلانے لگا اور بولا ——"حضور اب دوسری پلیٹ منگانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے ——" یہ سن کر نواب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے اور اپنی پلیٹ اس کی طرف سرکا دی۔

★

سید سردار مرزا جو مرزا غالب کے اچھے دوستوں میں تھے ایک بار مرزا صاحب سے ملنے آئے۔ شام کا وقت تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر پھر اٹھ کر جانے لگے تو مرزا صاحب نے شمع دان لیا اور کھسکتے کھسکتے فرش کے کنارے تک آئے تاکہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہنیں ——— سردار مرزا نے کہا۔

"حضرت قبلہ آپ نے کیوں زحمت کی میں خود اپنا جوتا پہن لیتا——"

اس پر مرزا صاحب نے انہیں جواب دیا۔

"حضرت میں آپ کا جوتا دکھانے کے لئے شمع دان لے کر نہیں آیا ہوں بلکہ اپنا جوتا دکھانے کے لئے آیا ہوں کہ وہ محفوظ رہنا چاہئے کہیں آپ اسی کو نہ پہن جائیں۔"

★

مرزا غالب ایک بار اپنا مکان بدلنا چاہتے تھے چناں چہ اس سلسلہ میں کئی مکانات دیکھے جن میں سے ایک کا دیوان خانہ مرزا صاحب کو پسند آیا مگر محل سرا دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ گھر آ کر بیگم صاحبہ کو اس مکان کی محل سرا دیکھنے کے لئے بھیجا جب وہ دیکھ کر آئیں مرزا صاحب نے پوچھا تو بیگم صاحبہ نے بتایا:

"اس مکان میں لوگ بلا بتاتے ہیں——"

مرزا صاحب یہ سن کر بہت ہنسے اور ہنس کر کہا۔

"کیا آپ سے زیادہ بھی کوئی اور بلا ہے——"

★

ایک بار مرزا صاحب گھر میں جانے لگے تو دیکھا کہ بیگم صاحبہ عین صحن میں مصلیٰ بچھائے ہوئے نماز پڑھ رہی ہیں مرزا صاحب یہ دیکھ کر دروازے پر ہی ٹھہر گئے جب وہ نماز پڑھ چکیں تو اپنا جوتا اتار کر سر پر رکھا اور ننگے پاؤں ہچکچاتے ڈرتے آہستہ آہستہ صحن تک آئے بیگم صاحبہ نے یہ حالت دیکھ کر متعجب ہو کر پوچھا۔

"یہ کیا——؟"

مرزا صاحب نے جواب دیا کہ۔

"کچھ نہیں! آپ کے مصلے کی تعظیم و تکریم منظور ہے۔"

بیگم صاحبہ نے وضاحت چاہی تو مرزا صاحب نے فرمایا:

"اب تمام صحن تو مسجد ہو گیا تو پھر اگر کوئی قدم رکھے

تو کہاں رکھے اور کرے تو کیا کرے۔ اس لئے جوتے اتار سر پر رکھ لئے"

★

ایک مرتبہ مغفرت کا کچھ ذکر چلا تو مرزا صاحب کی بیگم نے فرمایا:

"آپ تو کبھی نماز بھی نہیں پڑھتے روزہ تو خیر بڑی چیز ہے—"

مرزا صاحب نے جواب دیا۔

"خیر یہ تو ٹھیک ہے مگر تم سے ہمارا حشر اچھا ہوگا"

بیگم نے کہا۔

"یہ کیوں—؟"

اس پر مرزا صاحب نے فرمایا کہ۔

"آپ تو ان ہی نیلے تہمد والوں کے ساتھ ہوں گی جن کے تہمد کے پلّے میں مسواک بندھی ہوگی، ہاتھ میں ایک ٹونٹی دار بدھنی ہوگی، سر منڈے ہوئے ہوں گے اور ہمارا حشر بڑے بڑے جلیل القدر عالی نسب بادشاہوں کے ساتھ ہوگا جیسے فرعون، نمرود، شدّاد اور ہم مونچھیں چڑھاتے اکڑتے ہوئے چلے جا رہے ہوں گے چار فرشتے ادھر جلو میں ہوں گے، چار اُدھر—"

★

مرزا صاحب کے ایک عاشق مزاج دوست جو پہلے کسی کے حلقۂ گیسو کے اسیر تھے اور اب تائب ہو کر حج بیت اللہ کو جا رہے تھے تو مرزا صاحب سے بھی ملنے آئے اور بتایا کہ:

"سفرِ حج کو جا رہا ہوں—"

مرزا صاحب نے ہنس کر کہا۔

"غرض کوچہ گردی کی عادت نہ گئی اور دشت پیمائی کا چسکا نہ چھٹا جب یوں مارے مارے پھرتے تھے اب یوں پھرو گے—"

★

ایک بار مرزا صاحب کسی کتب فروش کی دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک ایرانی نوجوان آیا اور دوکان دار سے دریافت کیا کہ:

"دیوانِ غالب داری—"

دوکان دار نے جواب دیا۔

"دیوان غالب نہ دارم۔ دیوان ظہوری دارم دیوان نظیری دارم"

ایرانی نوجوان نے پھر کہا۔

"نے نے ایں ہمہ مطلوب نیست۔ دیوان غالب داری — ایں قرم ساق خوب می گوید—"

یہ سن کر دوکان دار نے ایرانی کو جواب دیا کہ۔

"دیوان غالب نہ دارم غالب دارم—"

یہ سن کر ایرانی چونکا اور اب جو اس نے مرزا صاحب کو دیکھا تو بہت شرمندہ ہوا۔ مرزا صاحب اسے خجل دیکھ کر یہ کہتے ہوئے پلٹ گئے کہ:

"شرمانے کی بات نہیں ہے واللہ ساری عمر میں یہی داد آج

ہی ملی ہے ۔۔۔"

★

ایک روز مرزا صاحب فتح الملک بہادر سے ملنے اُن کے یہاں گئے اور جب غلام گردش میں پہنچے تو خدمت گار نے صاحب عالم کو اطلاع دی کہ مرزا نوشہ صاحب آرہے ہیں، وہ کسی کام میں مشغول تھے اس لئے مرزا صاحب کو فوراً نہ بلا سکے ۔۔۔ مرزا صاحب کچھ دیر وہیں ٹہلتے رہے بعد میں صاحب عالم نے پکار کر ملازم سے فرمایا کہ۔

"ارے، مرزا صاحب کہاں ہیں ۔۔۔؟"

مرزا غالب نے یہ سن کر وہیں سے جواب دیا۔

"غلام گردش میں ہے۔"

یہ سن کر صاحب عالم خود باہر تشریف لے آئے اور فوراً مرزا صاحب کو اپنے ساتھ اندر لے گئے۔

★

ایک بار دلّی میں رات گئے کسی مشاعرے یا دعوت سے مرزا صاحب مولانا فیض الحسن فیض سہارن پوری کے ہمراہ واپس آرہے تھے راستے میں ایک تنگ اور تاریک گلی سے گزر رہے تھے کہ آگے وہیں ایک گدھا کھڑا تھا ۔۔۔ مولانا فیض نے یہ دیکھ کر کہا۔

"مرزا صاحب، دلّی میں گدھے بہت ہیں ۔۔۔"

مرزا صاحب نے بے ساختہ کہا۔

"نہیں صاحب باہر سے آجاتے ہیں۔"

مولانا فیض الحسن فیض سہارن پوری جھینپ کر چپ ہو رہے۔

★

ہنگامۂ غدر ۱۸۵۷ء میں جب دہلی میں ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم تھا، مرزا صاحب کی بیگم نے اپنی قیمتی چیزیں اور زیورات زمین میں دفن کر دیئے۔ اتفاق سے فتح مند سپاہیوں کو اس کی خبر لگ گئی اور انہوں نے کھود کر سب کچھ نکال لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب کو تنگ دستی نے آگھیرا اور کپڑے بیچ بیچ کر گزارہ کرنا پڑا۔

اسی زمانے میں مرزا صاحب نے کسی کو خط لکھا تو یوں کہ ۔۔۔ "اس ناداری کے زمانے میں جس قدر کپڑا اور اوڑھنا بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا گیا گویا لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔"

★

ایک بار مرزا صاحب کے کسی شاگرد نے آکر ان سے بڑے فخریہ لہجہ میں کہا کہ:

"حضرت، آج میں حضرت امیر خسرو کی قبر پر گیا تھا مزار پر ایک کھرنی کا درخت ہے اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ بس کھرنیوں کا کھانا تھا کہ گویا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھل گیا۔ دیکھئے تو میں کیسا فصیح و بلیغ ہو گیا ہوں۔"

"مرزا صاحب نے ان سے بڑی متانت سے کہا۔

"ارے میاں تین کوس کیوں گئے۔ میرے پچھواڑے کے پیپل کی پیپلیاں کیوں نہ کھالیں۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے۔"

★

ایک مرتبہ اپنی بہن چھوٹی خانم کی بیماری کو سن کر مرزا صاحب ان کی عیادت کو گئے اور پوچھا۔

"کیا حال ہے ۔۔۔؟"

وہ بولیں۔

"مرتی ہوں، البتہ قرض کی فکر ہے کہ گردن پر لئے جاتی ہوں ۔۔۔"

"بوا، بھلا یہ کیا فکر ہے خدا کے ہاں کیا مفتی صدرالدین خاں بیٹھے ہیں جو ڈگری کر کے پکڑوا لیں گے۔"

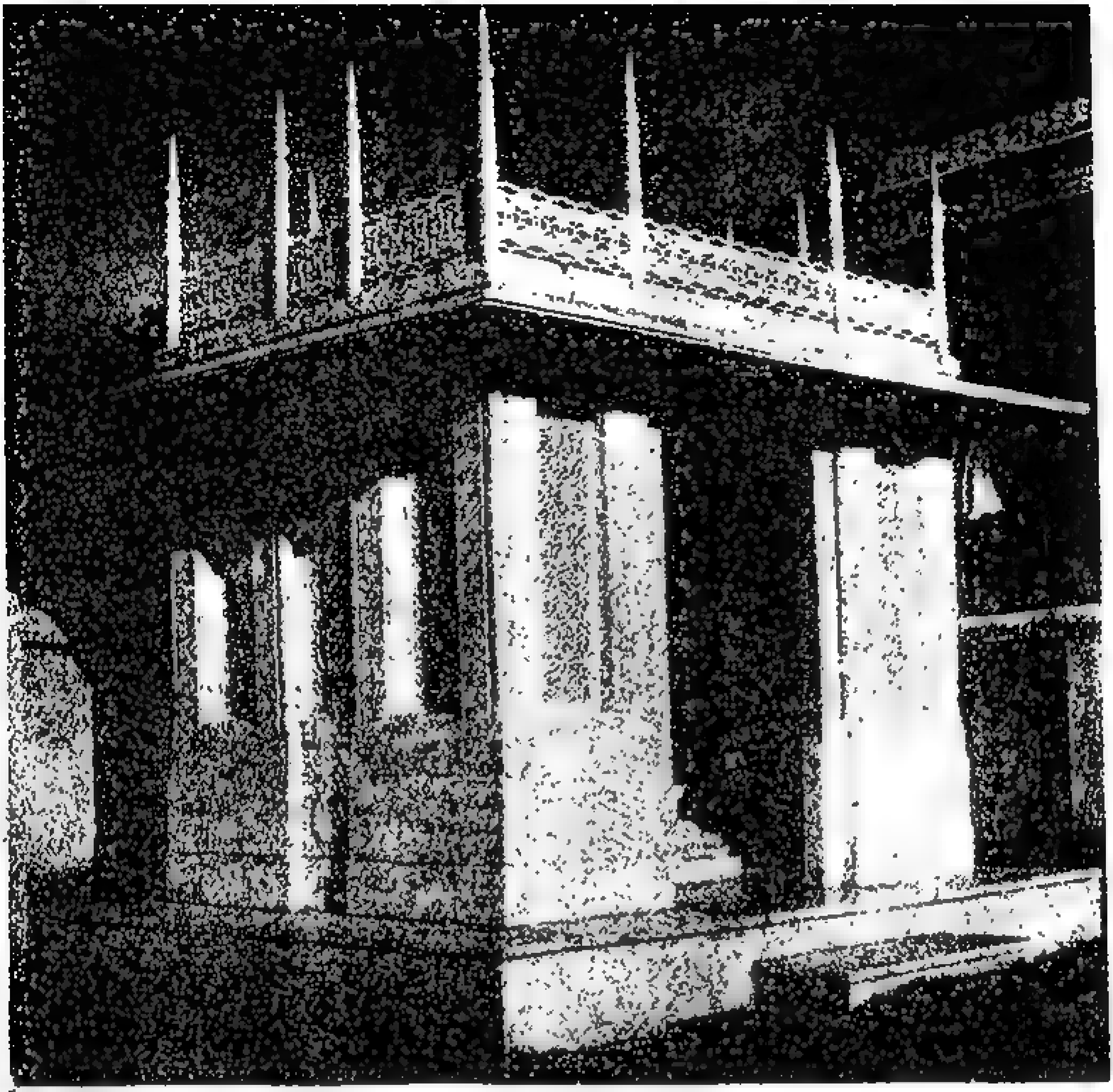

چاندنی رات کا میخوار (نظم جو مدفنِ غالب کے سامنے بیٹھ کر لکھی گئی)

شمیم کرہانی

کعبۂ اہلِ نظر، مدفنِ غالب ہے یہی
محوِ خواب، اک دلِ بیدار اسی خاک میں ہے

ہے اسی قبر میں، گنجینۂ معنی کا طلسم
جنسِ حکمت کا خریدار اسی خاک میں ہے

ہے یہیں دفن، حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
بادۂ غم کا قدح خوار اسی خاک میں ہے

سو رہا ہے یہیں نقاشِ اجنتائے غزل
ادبی تاج کا معمار اسی خاک میں ہے

ابر آلودہ سحر کا ہے شرابی یہیں قید
چاندنی رات کا میخوار اسی خاک میں ہے

یہیں مدفون ہیں خود بینی و نازش کے صنم
ایک بُت خانۂ پندار اسی خاک میں ہے

تھا جو ناکردہ گناہوں کی جزا کا طالب
وہ جواں مرد، گنہ گار اسی خاک میں ہے

معنی و ہیئت و اسلوب کا سرخیلِ سپاہ
فکر کا قافلہ سالار اسی خاک میں ہے

جس کی رعنائیِ افکار پہ عالم کو ہے رشک
ایشیا! وہ ترا فنکار اسی خاک میں ہے

مولانا محمد حسین آزاد

حیاتِ غالب کے چند ورق

نام اسد اللہ تھا۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے۔ جمجمر میں کوئی فرومایہ سا شخص اسد تخلص کرتا تھا۔ ایک دن اس کا مقطع کسی نے پڑھا۔

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب
ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

سنتے ہی اس تخلص سے جی بیزار ہوگیا۔ کیونکہ ان کا ایک یہ بھی قاعدہ تھا کہ عوام الناس کے ساتھ مشترک حال ہونے کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے چنانچہ ۱۲۴۵ھ و ۱۸۲۸ء میں اسد اللہ الغالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا۔ لیکن جن غزلوں میں اسد تخلص تھا۔ انہیں اسی طرح رہنے دیا۔

خاندان کا سلسلہ افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ جب تورانیوں کا چراغ کیانیوں کی ہوائے اقبال سے گل ہوا تو غریب خانہ برباد جنگلوں پہاڑوں میں چلے گئے۔ مگر جوہر کی کشش نے تلوار ہاتھ سے نہ چھوڑی۔ سپاہ گری ہمت کی بدولت روٹی پیدا کرنے لگی۔ سینکڑوں برس کے بعد پھر اقبال ادھر جھکا اور تلوار سے تاج نصیب ہوا۔ چنانچہ سلجوقی خاندان کی بنیاد انہی میں قائم ہوگئی۔ مگر اقبال کا جھکنا جھوکا ہوا کا ہے۔ کئی پشتوں کے بعد اس نے پھر رخ پلٹا۔ اور سمرقند میں جس طرح اور شرفا تھے۔ اس طرح سلجوقی شہزادوں کو بھی گھروں میں بٹھا دیا۔

مرزا صاحب کے دادا گھر چھوڑ کر نکلے۔ شاہ عالم کا زمانہ تھا کہ دہلی میں آئے۔ یہاں بھی سلطنت میں کچھ نہ رہا تھا۔ صرف پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے شاہی دربار میں عزت پائی۔ اور اپنی لیاقت اور خاندان کے نام سے پہاسو کا ایک پرگنہ سیر حاصل ذات اور رسالے کی تنخواہ میں لیا۔ شاہ عالم کے بعد طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم ہوا۔ وہ علاقہ بھی نہ رہا۔ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ مرحوم کے دربار میں پہنچے۔ چند روز بعد حیدر آباد میں جاکر نواب نظام علی خاں بہادر کے سرکار میں ۳۰۰ سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔ کئی برس کے بعد ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں یہ صورت بھی بگڑی۔ وہاں سے گھر آئے اور الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ اس وقت مرزا کی ۵ برس کی عمر تھی۔ نصر اللہ بیگ خاں حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ انہوں نے دُرِّ یتیم کو دامن میں لے لیا۔ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا تو صوبہ داری کمشنری ہوگئی۔ ان کے چچا کو سواروں کی بھرتی کا حکم ہوا اور ۴۰۰ سو سوار کے افسر مقرر ہوئے۔ ۱۷۰۰ روپیہ مہینہ ذات کا۔ اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر۔ سونگ سون کے پرگنہ پر حین حیات مقرر ہوگئی۔

مرزا چچا کے سایہ میں پرورش پاتے تھے۔ مگر اتفاق یہ کہ مرگ ناگہانی میں وہ مر گئے رسالہ برطرف ہوگیا۔ جاگیر ضبط ہوگئی۔ بزرگوں نے لاکھوں روپیہ کی جائیداد چھوڑی تھی۔ قسمت سے کس کا زور چل سکتا ہے۔ وہ امیر زادہ

جو شاہانہ دل و دماغ لے کر آیا تھا۔ اسے ملکِ سخن کی حکومت اور مضامین کی دولت پر قناعت کر کے غریبانہ حال سے زندگی بسر کرنی پڑی۔ بہت تدبیریں اور وسیلے درمیان آئے۔ مگر سب کھیل بن بن کر بگڑ گئے۔ اصل حال یہ ہے کہ جب مرزا نے اپنا دعویٰ کلکتہ میں پیش کیا تو سرکار نے اس کا فیصلہ سر جان مالکم صاحب گورنر بمبئی کو سپرد کیا کیونکہ جب جاگیروں کی سندیں لکھی گئی تھیں تو وہ لارڈ لیک صاحب کمانڈر انچیف ہندوستان کے سکریٹری تھے اور انہیں کے دستخط سے اسناد جاری ہوئے چنانچہ اخیر میں کسی دوست نے انہیں لکھا تھا کہ نظام دکن کے لئے قصیدہ کہہ کر فلاں ذریعہ سے بھیجو۔ اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں۔ "۵ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا۔ ۹ برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میں میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں ۱۰ ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ انہوں نے نہ دیئے مگر تین ہزار روپیہ سال۔ ان میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال فقط۔ میں نے سرکار انگریزی میں غبن ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب بہادر رزیڈنٹ دہلی۔ اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے۔ میرا حق دلانے پر رزیڈنٹ معزول ہو گئے۔ سکرتر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مر گئے۔ بعد ایک زمانہ کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا۔ ان کے ولیعہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ کی سرکار سے بہ صلۂ مدح گستری ۵۰۰ روپیہ سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے یعنے اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی۔ اور تباہی سلطنت دو برس ہی میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ ۷ برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب جو میں والی دکن کی طرف رجوع کروں یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا۔ یا معزول ہو جائے گا۔ اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع جائے گی۔ والی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اگر اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔"

غرض کہ نواب احمد بخش خاں بہادر کی تقسیم سے مرزائے مرحوم نالاں ہو کر ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گئے۔ اور گورنر جنرل سے ملنا چاہا۔ وہاں دفتر دیکھا گیا۔ اس میں سے ایسا کچھ معلوم ہوا کہ اعزاز خاندانی کے ساتھ ملازمت ہو جائے اور ۷ پارچہ خلعت تین رقم جیغہ سرپیچ۔ مالائے مروارید۔ ریاستِ دودمانی کی رعایت سے مقرر ہوا۔

غرض مرزا کلکتہ سے ناکام پھرے۔ اور ایام جوانی ابھی پورے نہ ہوئے تھے کہ بزرگوں کا سرمایہ تمام کر کے دلی میں آئے۔ یہاں اگرچہ گذران کا طریقہ امیرانہ شان سے تھا اور امیروں سے امیرانہ ملاقات تھی۔ مگر اپنے علو حوصلہ اور بلند نظری کے ہاتھوں سے تنگ رہتے تھے۔ پھر بھی طبیعت ایسی شگفتہ پائی تھی کہ ان دقتوں کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے اور ہمیشہ ہنس کھیل کر غم غلط کر دیتے تھے۔ کیا خوب فرمایا ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

جب دلی تباہ ہوئی تو زیادہ تر مصیبت پڑی۔

ادھر قلعہ کی تنخواہ جاتی رہی۔ اُدھر پنشن بند ہو گئی۔ اور انہیں رامپور جانا پڑا۔ نواب صاحب سے ۲۰-۲۵ برس کا تعارف تھا۔ یعنے ۵۵ء میں ان کے شاگرد ہوئے تھے اور ناظم تخلص قرار پایا تھا۔ وہ بھی گاہے گاہے غزل بھیج دیتے تھے۔ یہ اصلاح دے کر بھیج دیتے تھے کبھی کبھی روپیہ بھی آتا تھا۔ اس وقت قلعہ کی تنخواہ جاری سرکاری پنشن کھلی ہوئی تھی۔ ان کی عنایت فتوح غیبی گنی جاتی تھی۔ جب دلی کی صورت بگڑی تو زندگی کا مدار اس پر ہو گیا۔ نواب صاحب نے ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینہ کر دیا اور انہیں بہت تاکید سے بلایا۔ یہ گئے تو تعظیم خاندانی کے ساتھ دوستانہ و شاگردانہ بغلگیر ہو کر ملاقات کی۔ اور جب تک رکھا کمال عزت کے ساتھ رکھا۔ بلکہ سو روپیہ مہینہ ضیافت کا زیادہ کر دیا۔ مرزا کو دلی کے بغیر چین کہاں؟ چند روز کے بعد رخصت ہو کر پھر وہیں چلے آئے۔ چونکہ پنشن سرکاری بھی جاری ہو گئی تھی اس لئے چند سال زندگی بسر کی۔

آخر عمر میں بڑھاپے نے بہت عاجز کر دیا۔ کانوں سے سنائی نہ دیتا تھا۔ نقش تصویر کی طرح لیٹے رہتے تھے کسی کو کچھ کہنا ہوتا تھا تو لکھ کر رکھ دیتا تھا۔ وہ دیکھ کر جواب دیدیتے تھے۔ خوراک دو تین برس پہلے یہ رہ گئی تھی کہ صبح کو پانچ سات بادام کا شیرہ! ۱۲ بجے آب گوشت شام کو ۴ کباب تلے ہوئے۔ آخر ۷۳ برس کی عمر ۱۸۶۹ء ۱۲۸۵ھ میں جہانِ فانی سے انتقال کیا۔ اور بندۂ آثم نے تاریخ لکھی۔ آہ غالب بمرد۔ مرنے سے چند روز پہلے یہ شعر کہا تھا اور اکثر یہی پڑھتے رہتے تھے۔

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

اس میں کچھ شک نہیں کہ مرزا اہلِ ہند میں فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ مگر علوم درسی کی تحصیل طالب علمانہ طور سے نہیں کی اور حق پوچھو تو یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ایک امیرزادہ کے سر سے بچپن میں بزرگوں کی تربیت کا ہاتھ اٹھ جائے۔ اور وہ فقط طبعی ذوق سے اپنے تئیں اس درجہ کمال تک پہنچائے۔ وہ کیسی طبع خداداد لایا ہوگا۔ جس نے اس کے فکر میں یہ بلند پروازی دماغ میں یہ معنی آفرینی۔ خیالات میں ایسا اندازِ لفظوں میں نئی تراش اور ترکیب میں انوکھی روش پیدا کی۔ جابجا خود ان کا قول ہے اور حقیقت میں لطف سے خالی نہیں کہ زبان فارسی سے مجھے مناسبتِ ازلی ہے۔

ہرمزد۔ نام ایک پارسی ژند و پاژند کا عالم تھا اس نے اسلام اختیار کیا اور عبدالصمد اپنا نام رکھا۔ ایام سیاحت میں ہندوستان کی طرف آنکلا۔ اور مرزا سے بھی ملاقات ہوئی۔ اگرچہ ان کی عمر اس وقت ۱۴ برس کی تھی۔ مگر وہی مناسبت ازلی طبیعت میں تھی۔ جس نے اسے کھینچا اور دو برس تک گھر میں مہمان رکھ کر اکتساب کمال کیا۔ اس روشن ضمیر کے فیضانِ صحبت کا انہیں فخر تھا۔ اور حقیقت میں یہ امر فخر کے قابل ہے۔

مرزا غالب اپنا انداز سب سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ لباس اس کا اکثر اہلِ ولایت کا ہوتا تھا۔ سر پر اگرچہ کلاہ پاپاخ نہ تھی۔ مگر لمبی ٹوپی سیاہ پوستین کی ہوتی تھی۔ اور ایسا ضرور چاہئے تھا کیوں کہ وہ فارسی نویسی کو نہ فقط ذوق بلکہ عشق دلی کے ساتھ نبھاتے تھے۔ اور لباس و گفتار کی کچھ خصوصیت نہیں۔ وہ اپنی قدامت کی ہر بات سے محبت رکھتے تھے۔ خصوصاً خاندان کے اعزازوں کو ہمیشہ جانکاہ عرق ریزیوں کے ساتھ بچاتے رہے۔ اس اعزاز پر کہ جوان

کے پاس باقی تھا۔ دو دفعہ آسمانی صدمے پہنچے۔ اول جب کہ چچا کا انتقال ہوا۔ دوسرے جب ۵۷ء میں ناکردہ گناہ بغاوت کے جرم میں پنشن کے ساتھ کرسی دربار اور خلعت بند ہوا۔ اردوئے معلیٰ میں بیسیوں دوستوں کے نام خط ہیں کوئی اس کے ماتم سے خالی نہیں۔ ان کے لفظوں سے اس غم میں خون ٹپکتا ہے۔ اور دل پر جو گزرتی ہوگی وہ تو خدا ہی کو خبر ہے۔ آخر پھر ان کی جگہ اور اپنا حق لیا۔ اور بزرگوں کے نام کو قائم رکھا۔

۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو دہلی کالج کا انتظام از سرِ نو منظور ہوا۔ ٹامسن صاحب جو کئی سال تک اضلاع شمال و مغرب کے لفٹنٹ گورنر بھی رہے۔ اس وقت سکرٹری تھے۔ وہ مدرسین کے امتحان کے لئے دلی آئے۔ اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ مہینے کا ایک مدرس عربی ہے۔ ایسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو۔ لوگوں نے چند کاملوں کے نام بتائے۔ ان میں مرزا کا نام بھی آیا۔ مرزا صاحب حسب الطلب تشریف لائے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی۔ مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے کہ حسب دستور قدیم صاحب سکرٹری استقبال کو تشریف لائیں گے۔ جب کہ نہ وہ ادھر سے آئے۔ نہ یہ ادھر سے گئے۔ اور دیر ہوئی تو صاحب سکرٹری نے جمعدار سے پوچھا۔ وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے۔ انھوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے میں کیوں کر جاتا۔ جمعدار نے جاکر پھر عرض کی۔ صاحب باہر آئے اور کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں بحیثیتِ ریاست تشریف لائیں گے۔ تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی۔ لیکن اس وقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں۔ اس تعظیم کے مستحق نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت باعثِ زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں۔ نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں! صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں۔ مرزا

... میں غالب ...

صاحب رخصت ہو کر چلے آئے۔ صاحبِ موصوف نے مومن خاں صاحب کو بلایا۔ ان سے کتاب پڑھوا کر سنی۔ اور زبانی باتیں کرکے اسی روپیہ تنخواہ قرار دی۔ انھوں نے سو روپیہ سے کم منظور نہ کئے۔ صاحب نے کہا سو روپے لو تو ہمارے ساتھ چلو۔ ان کے دل نے نہ مانا کہ دلی کو اتنا سستا بیچ ڈالیں۔ مرزا کے کھلے ہوئے دل اور کھلے ہوئے ہاتھ نے ہمیشہ مرزا کو تنگ رکھا۔ مگر اس تنگ دستی میں بھی امارت کے تمغے قائم تھے۔ چنانچہ اردوئے معلیٰ کے اکثر خطوط سے یہ حال آئینہ ہے۔ مرزا تفتہ اپنے شاگردِ رشید کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "سو روپیہ کی ہنڈی وصول کرلی۔ ۲۴ روپیہ داروغہ کی معرفت اٹھے تھے وہ دیئے۔ ۵۰ روپیہ محل میں بھیج دیئے۔ ۲۶ باقی رہے وہ بکس میں رکھ لئے۔ کلیان سودا لینے بازار گیا ہے۔ جلد آگیا تو آج ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دوں گا۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے۔ بھائی بری آ بنی ہے۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا"

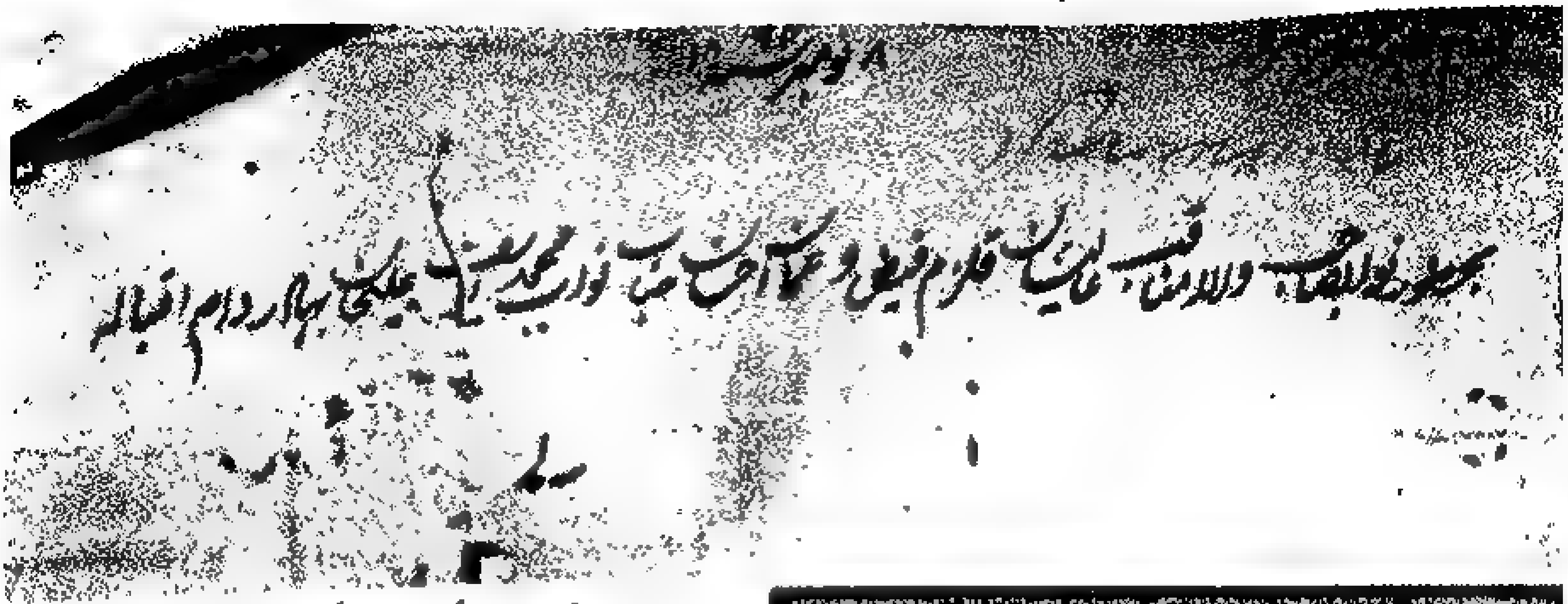

نواب رامپور کے نام غالب کی تحریر

نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رامپور

کدار ناتھ آپ کا دیوان تھا۔ اسی عالم میں ماہ بماہ آ کر چپقا بانٹ دیتا تھا۔ آپ کہیں سفر میں گئے ہیں تو اس کے لئے خطوط میں بار بار احکام بھیجتے ہیں۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "ہنڈوی میں ۱۲ دن کی میعاد تھی ۶ دن گذر گئے تھے ۶ دن باقی تھے۔ مجکو صبر کہاں۔ متی کاٹ کر روپے لے لئے۔ قرض متفرق سب ادا ہوا۔ بہت سبکدوش ہوگیا۔ آج میرے پاس معہ ۱۲ روپے نقد بکس میں ہیں۔ اور ۴ بوتل شراب کی اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانہ میں موجود ہیں، الحمد للہ علی احسانہ۔"

نواب الٰہی بخش خاں مرحوم کی صاحبزادی سے مرزا صاحب کی شادی ہوئی۔ اور اس وقت ۱۳ برس کی عمر تھی۔ باوجودیکہ اوضاع واطوار آزادانہ رکھتے تھے۔ لیکن آخر صاحب خاندان تھے۔ گھرانے کی لاج پر خیال کر کے بی بی کا پاسِ خاطر بہت مدِنظر رکھتے تھے۔ پھر بھی اس قید سے کہ خلاف طبع تھی جب بہت دق ہوتے تھے تو ہنسی میں ٹالتے تھے۔

مرزا صاحب نے فرزندانِ روحانی یعنی پاک خیالات اور عالی مضامین سے ایک انبوہ بے شمار اپنی نسل میں یادگار چھوڑا۔ مگر افسوس کہ جس قدر اُدھر سے خوش نصیب ہوئے

اسی قدر فرزندانِ ظاہری کی طرف سے بے نصیب ہوئے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ "سات بچے ہوئے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔" سات بچّے ہوئے مگر برس برس دن کے پس و پیش میں سب ملکِ عدم کو چلے گئے۔ ان کی بی بی کے بھانجے الٰہی بخش خان مرحوم کے نواسے زین العابدین خاں تھے اور عارف تخلّص کرتے تھے۔ عارف جوان مرگئے اور دو ننھے ننھے بچے یادگار چھوڑے۔ بی بی ان بچّوں کو بہت چاہتی تھیں۔ اس لئے مرزا نے انھیں اپنے بچّوں کی طرح پالا۔ بڑھاپے میں انھیں گلے کے ہار کئے پھرتے تھے۔ جہاں جاتے وہ پالکی میں ساتھ ہوتے تھے۔ ان کے آرام کے لئے آپ بے آرام ہوتے تھے۔ ان کی فرمائشیں پوری کرتے تھے۔ افسوس کہ مرزا کے بعد دونوں جوان مرگئے۔ نواب احمد بخش خاں مرحوم کے رشید فرزند مرزا صاحب کی تکلیف نہ دیکھ سکتے تھے۔ کمال کی دولت اُن سے لیتے تھے۔ دنیا کی ضرورتوں میں انھیں آرام دیتے تھے۔ چنانچہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب شاگرد ہیں۔ نواب امین الدین خاں مرحوم والئی لوہارو بھی آدابِ خوردانہ کے ساتھ خدمت کرتے تھے۔ نواب علاء الدین خاں والئی حال اس وقت ولیعہد تھے۔ بچپن سے شاگرد ہیں۔ چنانچہ مرزا صاحب نواب علاء الدین خاں صاحب کو لکھتے ہیں "میاں! بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈہ گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمہاری پھوپھی کہتی ہیں ہائے دبی، ہائے مری۔ دیوان خانہ کا حال محل سرا سے بھی بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو۔ اور پھر اثنائے مرمت میں میں بیٹھا کس طرح رہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے۔ اپنی پھوپھی کے رہنے کو۔ اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالانِ زیریں جو الٰہی بخش خان مرحوم کا مسکن تھا۔ میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی۔ مرمت ہو جائے گی۔ پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں۔ ایک یہ مروّت کا احسان میرے پایانِ عمر میں اور بھی سہی۔

غالب

مرزا کثیر الاحباب تھے۔ دوستوں سے دوستی کو ایسا نباہتے تھے کہ اپنائیت سے زیادہ اُن کی دوست پرستی، خوش مزاجی کے ساتھ رفیق ہو کر ہر وقت ایک دائرہ شرفا اور رئیس زادوں کا

آگرہ کے اس مکان میں غالب پیدا ہوئے تھے

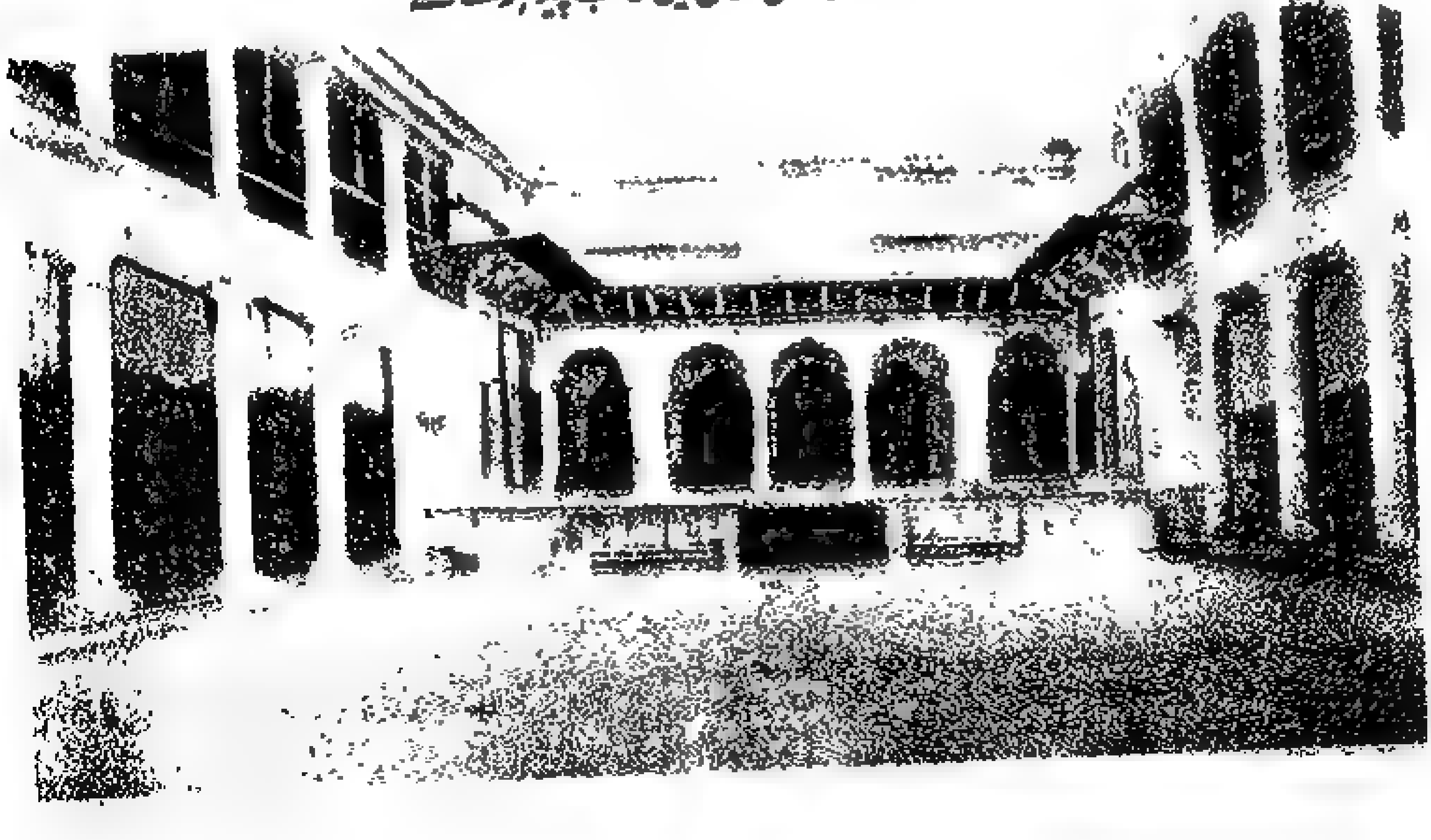

اُن کے گرد دکھائی تھی۔ اُن ہی سے غم غلط ہوتا تھا اور اِسی میں اُن کی زندگی تھی۔ لطف یہ کہ دوستوں کے لڑکوں سے بھی وہی باتیں کرتے تھے جو دوستوں سے۔ اُدھر ہونہار نوجوانوں کا مؤدب بیٹھنا، اِدھر سے بزرگانہ لطیفوں کا پھول برسانا، اُدھر سعادت مندوں کا چپ مسکرانا اور بولنا تو حدِ ادب سے قدم نہ بڑھانا۔ ادھر پھر بھی شوخیٔ طبع سے باز نہ آنا۔ ایک عجیب کیفیت رکھتا تھا۔ بہر حال ان ہی لطافتوں اور ظرافتوں میں زمانے کی مصیبتوں کو ٹالا۔ اور ناگوار کو گوارا کر کے ہنستے کھیلتے چلے گئے۔ چنانچہ میر مہدی، میر سرفراز حسین۔ نواب یوسف مرزا وغیرہ اکثر شریف زادوں کے لئے خطوط اُردوئے معلیٰ میں ہیں۔ جو کہ ان جلسوں کے فوٹو گراف دکھاتے ہیں۔

زمانے کی بے وفائی نے مرزا کو وہ فارغ البالی نصیب نہ کی جو اُن کے خاندان اور کمال کے لئے، وہ اپنے جی کو جلا کر دل تنگ بھی نہ ہوتے تھے بلکہ ہنسی میں اُڑا دیتے تھے۔

مرزا کے تمام خاندان کا اور بزرگوں کا مذہب سُنّت وجماعت تھا مگر اہلِ راز اور تصنیفات سے بھی ثابت ہے کہ اُن کا مذہب شیعہ تھا۔ اور لطف یہ تھا کہ ظہور اس کا جوشِ محبّت میں تھا۔ نہ کہ تبرّا و تکرار میں۔ چنانچہ اکثر لوگ اُنہیں نصیری کہتے تھے۔ اور وہ سُن کر خوش ہوتے تھے۔ ایک جگہ کہتے ہیں

منصور فرقۂ علیؑ اللّٰہیان منم
آوازۂ انا اسد اللہ بر افگنم

تمام اقربا اور حقیقی دوست سُنّت وجماعت تھے لیکن اُن کی اپنائیت میں کسی طرح کی دوئی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ مولانا فخر الدّین کے خاندان کے مُرید بھی تھے۔ دربار اور اہلِ دربار میں کبھی اس معاملے کو نہیں کھولتے تھے۔ اور یہ طریقہ دہلی کے اکثر خاندانوں کا تھا۔ "تصنیفاتِ اُردو" میں تقریباً ۱۸۰۰ شعر کا ایک دیوان انتخابی ہے کہ ۱۸۴۹ء میں مرتب ہو کر چھپا۔ اس میں کچھ تمام اور کچھ ناتمام غزلیں ہیں اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔ غزلوں کے تخمیناً ۱۵۰۰ شعر۔ قصیدوں کے ۱۶۲ شعر۔ مثنوی کے ۲۲ شعر۔ متفرقات قطعوں کے ۱۱۱ شعر، رُباعیاں ۱۶، دو تاریخیں جن کے ۴ شعر جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے۔ اُس سے ہزاروں درجہ عالمِ معنے میں کلام بلند ہے۔ بلکہ اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجۂ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ جب اِن شکایتوں کے چرچے زیادہ ہوئے تو اُس ملکِ بے نیازی کے بادشاہ نے کہ اقلیمِ سخن کا بادشاہ بھی تھا، اپنی غزل کے ایک شعر سے سب کو جواب دے دیا۔

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلہ کی پروا،
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اواخرِ عمر میں اپنا کلام اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ اُردو کی تصنیفات نواب حسین مرزا صاحب کے پاس رہتی تھیں اور وہ ترتیب کرتے جاتے تھے۔ فارسی نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب کو بھیج دیتے تھے کہ انہیں نیر رخشاں تخلّص کر کے اپنا رشید شاگرد اور خلیفۂ اوّل قرار دیا تھا۔ خلیفۂ دوم نواب علاء الدین خاں صاحب تھے۔

اُن کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی انشاء پردازی کے شوق کو بڑی کاوش اور عرق ریزی سے نباہتے تھے۔ اسی واسطے مرنے سے دس پندرہ برس پہلے ان کی تحریریں اُردو میں ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک دوست کے خط میں خود فرماتے ہیں۔

"بندہ نواز! زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارتِ غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے کہ:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ

وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں۔ سب دوستوں کو جن سے کتابت رہتی ہے اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط لکھے اور بھیجے تھے اُن میں سے جو صاحب الی الآن موجود ہیں۔ اُن سے بھی عندالضرورت اسی زبان مروّج میں مکاتیب مراسلات کا اتفاق ہوا کرتا ہے ''

نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جواں بخت اُن کے بیٹے تھے اور بادجودیکہ بہت مرشد زادوں سے چھوٹے تھے۔ مگر بادشاہ اُن ہی کی ولی عہدی کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ جب اُن کی شادی کا موقع آیا تو بڑی دھوم کے سامان ہوئے۔ مرزا نے سہرا کہا جس کا مقطع یہ تھا:

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

مقطع کو سُن کر حضور کو خیال ہوا کہ اس میں ہم پر چشمک ہے۔ گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کہنے والا نہیں۔ ہم نے جو شیخ ابراہیم ذوق کو اُستاد اور ملک الشعراء بنایا ہے۔ یہ سخن فہمی سے بعید ہے۔ بلکہ طرف داری ہے چنانچہ اسی دن اُستاد مرحوم جو حسب معمول حضور میں گئے تو بادشاہ نے وہ سہرا دیا کہ اُستاد اسے دیکھئے۔ اُنہوں نے پڑھا اور حسب عادت کے عرض کی۔ پیر و مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا کہ استاد! تم بھی ایک سہرا کہہ دو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو اور ذرا مقطع پر بھی نظر رکھنا۔ اُستاد مرحوم وہیں بیٹھ گئے اور سہرا کہا جس کا مقطع تھا:

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سُنا دے اُس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

ارباب نشاط حضور میں ملازم تھیں۔ اسی وقت اُنہیں

۰ا۔ شام تک شہر کے گلی کوچہ میں پھیل گیا۔ دوسرے ہی دن اخباروں میں مشتہر ہو گیا۔ مرزا بھی بڑے اداشناس اور سخن فہم تھے۔ سمجھے کہ تھا کچھ اور ہو گیا کچھ اور ایک قطعہ حضور میں گذرا۔

کلکتہ میں بہت سے اہل ایران اور بڑے بڑے علماء و فضلا موجود تھے۔ کلکتہ کا معرکہ مگر افسوس ہے کہ وہاں مرزا کے کمال کے لئے ایسی عظمت نہ ہوئی جیسی کہ اُن کی شان کے لئے شایاں تھی۔ حقیقت میں اُن کی عظمت ہونی چاہیئے تھی، اور ضرور ہوتی۔ مگر ایک اتفاقی پیچ پڑ گیا۔ اُس کی داستان یہ ہے کہ مرزا نے کسی جلسہ میں ایک فارسی کی غزل پڑھی۔ اُس میں ایک لفظ پر بعض اشخاص نے اعتراض کیا۔ اور اعتراض بموجب اُس قاعدے کے تھا جو مرزا قتیلؔ نے اپنے ایک رسالے میں لکھا ہے۔ مرزا نے سُن کر کہا کہ قتیلؔ کون ہوتا ہے؟ اور مجھے قتیل سے کیا کام؟ ایک فریدآباد کا کھتری تھا۔ میں اہل زبان کے سوا کسی کو نہیں سمجھتا۔ وہ لوگ اکثر مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ اس لئے اُنہوں نے مہمان نوازی سے آنکھیں بند کر لیں اور جوش و خروش خاص و عام میں پیدا ہوا۔ مرزا کو تعجب ہوا اور اس خیال سے کہ یہ فتنہ کسی طرح فرو ہو جائے، سلامت روی کا طریقہ اختیار کر کے ایک مثنوی لکھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ داد سخنوری کی دی ہے۔ معرکہ کا سارا ماجرا نہایت خوبی کے ساتھ نظم میں ادا کیا۔ اعتراض کو سند سے دفع کیا۔ اپنی طرف سے انکسار مناسب کے ساتھ معذرت کا حق پورا کیا۔ لیکن زیادہ تر افسوس یہ ہے کہ جب مثنوی حریفوں کے جلسہ میں پڑھی گئی تو بجائے اس کے کہ کمال کو تسلیم کرتے یا مہمان سے اپنی زیادتیوں کا عذر کرتے، ایک نے عمداً کہا کہ اس مثنوی کا نام کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ "بادِ مخالف" دوسرے نے گلستاں کا فقرہ پڑھا "یکے از صلحا را بادِ مخالف در شکم پیچید" اور سب نے ہنس دیا

●●

حمید احمد خاں

غالب کی بہو سے ایک ملاقات

کچھ عرصہ پہلے گلی قاسم جان کے اندر لوہارو والوں کی حویلی میں ایک سن رسیدہ بی بی موجود تھیں جنہوں نے غالب کی زندگی کا آخری دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ بی بی عارف جان کی پڑپوتی، غالب کے دوست نواب ضیاء الدین نیر رخشاں کی بیٹی اور مرزا زین العابدین خاں عارف کی بہو نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم تھیں۔ مجھے جولائی ۱۹۲۸ء میں اپنے کرم فرما اور محترم دوست حکیم محمد کامل خاں صاحب دہلوی کی معرفت بگا بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تھا۔ بگا بیگم صاحبہ اپنی حویلی کے ایک دالان میں پردے کے پیچھے تشریف لے آئیں۔ پردے کے دوسری طرف ایک تخت پر میں اور حکیم صاحب بیٹھ گئے۔ میں نے مرزا غالب اور ان کی بیگم صاحبہ کے متعلق کئی سوالات کئے جن کا جواب بگا بیگم صاحبہ مجھے تفصیل سے دیتی رہیں۔ ان کی عمر اس وقت لگ بھگ نوے برس کی تھی۔ مگر آواز میں بڑھاپے کی کمزوری کا کوئی خفیف سا اثر بھی میں نے محسوس نہیں کیا۔ برجستہ اور بے تکان بات کرتی تھیں۔ گفتگو کی ہر منزل پر مجھے ان کے ذہن کی بیداری اور احساس ظرافت کی موجودگی کے ثبوت ملے ہیں۔ ان کے ہر جواب کی یادداشتیں قلم بند کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن بار بار میں نے محسوس کیا کہ میرا قلم ان کی شستہ تقریر کی روانی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

جو کچھ میں نے ان سے سنا، اس کی کیفیت یہاں لکھنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ غالب کی خانگی زندگی سے متعلق بگا بیگم صاحبہ کو کیا خصوصیت حاصل تھی جس کی بنا پہ ان کی دی ہوئی معلومات ہمارے لئے قابل قدر ہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ غالب کی اولاد میں سے کسی بچے نے بھی برس سوا برس سے زیادہ کی عمر نہ پائی۔ ان کی بیگم صاحبہ نے اولاد سے مایوس ہو کر آخر اپنے بھانجے (قاسم جان کے بڑے پوتے) زین العابدین خاں عارف کو منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ مرزا غالب بھی عارف سے حقیقی اولاد کی سی محبت کرتے تھے جس کا اظہار مرزا غالب کے اردو و فارسی کلام دونوں میں موجود ہے۔ جب عارف کا انتقال ہو گیا تو غالب ان کے دونوں بیٹوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو اپنے پاس لے آئے اور انہیں اسی لاڈ و پیار سے رکھا جیسے اپنی اولاد کو رکھتے۔ بڑے لڑکے باقر علی خاں کی شادی غالب نے خود اپنی زندگی میں کی۔ اس طریقے سے جو بہو غالب کے گھر میں آئی وہ یہی بگا بیگم صاحبہ تھیں۔ بگا بیگم صاحبہ کے پھوپھی زاد بھائی فخر مرزا مرحوم مجھ سے بیان فرماتے تھے: "میں نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے کہ حسین علی خاں مرزا غالب سے شوخیاں کرتے اور کبھی ان کی چھاتی پر چڑھ بیٹھتے تھے۔ پڑھائی کے معاملے میں بھی ان کی بہت ناز برداری ہوئی۔ مرزا صاحب نے کہا: "ارے حسین علی آکر پڑھ لے۔" انہوں نے جواب دیا "دادا جان آتا ہوں" اور دوسری طرف نکل گئے۔ کھیل تماشے کا تو انہیں لپکا تھا۔ کٹھ پتلیوں کے تماشے پر ایک دفعہ بیس روپے خرچ کر دیئے اور پھر مرزا صاحب کے پاس منہ بسورتے ہوئے آئے کہ دادا جان بیس روپے دلوایئے۔ مرزا صاحب نے کلو کو بلا کر کہا "بھئی انہوں نے ایک پتھر اور مارا۔ دے دو بیس روپے۔"

فخر مرحوم نے اپنے بچپن کے دنوں کا ایک اور واقعہ مجھے اس طرح سنایا: "ایک دن میں چلا جاتا تھا۔ بھائی حسین علی خاں بھی گلی میں سے جا رہے تھے۔ مرزا صاحب نے ہمیں دیکھا اور آواز

دی" ابے لمڈو یہاں آؤ!" ہم پہنچے تو مرزا صاحب نے ہمارے لیے مٹھی بھر بادام طشتری میں ڈال دیئے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو مرزا صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "ابے یہ کیا۔ منہ سے کھا۔ میرے مرغی کے بچے یوں ہی چگا کرتے ہیں۔"

اس میں شک نہیں کہ بگا بیگم صاحبہ نے غالب کا صرف آخری زمانہ دیکھا۔ لیکن چونکہ وہ رات دن گھر میں رہتی تھیں اس لیے اُن کے بیان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ جہاں کہیں کہیں انہوں نے قیافے سے بات کی، اُن کا بیان درست نہیں (مثلاً غالب کی عمر سے متعلق) مگر جو باتیں اُن کی دیکھی ہوئی تھیں۔ اُن کی صحت میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ مثلاً جب میں نے پوچھا کہ مرزا صاحب کے چلنے کا انداز کیا تھا۔ تو فوراً بولیں "ہچ ہچ چلتے تھے بڈھے تھے۔ اسّی برس کی عمر تھی۔" ظاہر ہے کہ اس قول کا صرف پہلا حصہ بالکل درست اور دوسرا تخمیناً درست ہے۔ لیکن ہم کتنے ہی صحت پسند ہوں۔ ہمارا یہ تقاضا مروّت سے زیادہ سخت ہوگا کہ بگا بیگم صاحبہ کے کسی تخمینے میں بھی کوئی فرق نہ نکلے۔

اتنا تو سب جانتے ہیں کہ جس قدر مرزا غالب طبیعت کے لحاظ سے آزاد رو تھے، اسی قدر اُن کی بیگم صاحبہ اپنے باپ مرزا الٰہی بخش خاں کی طرح پرہیزگار اور نماز روزے کی پابند تھیں۔ اس وجہ سے اکثر میاں بیوی کے درمیان نوک جھونک ہوتی تھی۔ چنانچہ غالب بیوی کو "حضرت موسیٰ کی بہن" کہتے تھے۔ اور اگر زیادہ بگڑتے تو یہاں تک کہہ دیتے کہ "میرا تو ناک میں دم کر دیا ہے۔" مگر یہ جھگڑا محض زندہ و زہد کے اختلاف تک محدود نہ تھا۔ جو کچھ میں نے سنا اُس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اختلافِ مزاج کو بھی گھر کی چپقلش میں خاصا دخل تھا۔ چنانچہ خود بگا بیگم صاحبہ کی موجودگی میں میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی۔ امراؤ بیگم خفا ہوتی تھیں مگر خاموش ہو جاتی تھیں۔ اُن سے کہتی تھیں "بیبی تو تو بچہ ہے۔ بڈھے کی باتوں کا خیال نہ کیا کر۔ بڈھا تو دیوانہ ہو گیا ہے۔"

اس قسم کا ایک واقعہ بگا بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سنایا کہ (مرزا صاحب) پچھلے پہر ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔ ایک روز عصر کے بعد واپس آئے۔ میں اور میری ساس عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ بھی اس تخت کے کنارے پر ہو بیٹھے۔ جب ہم نے سلام پھیرا تو کہنے لگے "واہ واہ خوب بہو کو بھی اپنا سا کر لیا۔ کمہاری بوندٹ کا کیڑا اپنے گھر لے جاتی ہے۔ تو چالیس دن میں اسے بھی اپنا سا کر کے نکال دیتی ہے۔"

ایک اور لطیفہ بگا بیگم صاحبہ نے مجھے سنایا کہ برسات کے دن تھے۔ مینہ بہت برسنے لگا۔ دونوں (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) نے کھانا کھایا اور چلے گئے۔ نیاز علی (ملازم) بھی چلا گیا۔ مرزا صاحب بیٹھے بیوی سے باتیں کرتے تھے۔ میں یوں بیٹھی تھی گاؤ تکیے کے کونے سے لگی ہوئی۔ کہنے لگے "ایک بیوی دو میں تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا ہو، میں اور میری بیوی بیٹھے ہیں۔ تم کیوں بیٹھی ہو؟" اس پر میری ساس بولیں "ارے توبہ توبہ بڈھا دیوانہ ہے۔ اسے تو ٹھٹھے کے لیے کوئی چاہیے۔ اب بہو ہی مل گئی۔" بگا اتنے میں اٹھ کر کونے میں جا بیٹھی۔ اب انہیں یہ فکر کہ برسات

کا موسم اور کپڑے پہننے کا عالم۔ مجھے ڈھونڈتے پھریں اور کہتے جائیں: "مجھے کیا خبر تھی، بہو اس بات کو اتنا بُرا مانے گی۔"

میں نے نوکروں اور بچوں کے متعلق پوچھا کہ غالب اُن سے کس طرح پیش آتے تھے۔ حسین علی خاں کے متعلق بتایا کہ "چھوٹے پوتے کو دھمکایا کرتے تھے۔" نوکروں میں کلو کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا "کلو داروغہ کو مرے ہوئے پندرہ برس ہو گئے۔ لوگ اُن کی زیارت کو بہت آتے تھے۔ یہ چودہ برس کی عمر میں مرزا صاحب کے پاس آکر رہے۔ کلو داروغہ کا یہ حال تھا کہ پاؤں کی آہٹ سے پہچان لیتے تھے کہ لڑکیاں ہیں، بہوئیں ہیں یا بوڑھیاں۔ ایک اور ذکر مدار خاں تھا۔ ان دونوں کا بیان انہوں نے خود کیا۔ یہ مجھ سے پہلے کا ذکر ہے۔ میں نے سُنا ہے مدار خاں کے لڑکے کا نام نیاز علی تھا۔ یہ مرزا صاحب نے لے لیا۔ مدار خاں کی بیٹی آبادی کو کلو نے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔"

کھانا ایک وقت کھاتے تھے۔ دوسرے وقت کباب تلے ہوئے، دال، مُربّہ، پسے ہوئے بادام اور حلوہ سوہن۔ جب کھانا خراب ہوتا تو پکانے والے کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ پکانے والا کون تھا؟ دو ماتھیں۔ مرزا صاحب پان نہیں کھاتے تھے۔ میں نے اُنہیں کبھی کھاتے نہیں دیکھا۔ چنے کی دال، بیسن کی پھلکیاں اور کڑھی بہت کھاتے تھے۔ چنے کی دال ہر سالن میں ایک ایک چمچہ ضرور پڑتی تھی۔ میرے بیاہ کے بعد کی بات ہے کہ چنے کی دال سالن میں پڑی ہوئی میرے سامنے بھی آئی۔ مجھے پسند نہیں تھی۔ مغلانی نے میری ساس سے شکایت کی کہ بہو نہیں کھاتی۔ چنے کی دال۔ مرزا صاحب یہ بات سُن رہے تھے۔ کہنے لگے "او ہو۔ خدا سے بھی بڑھ گئی بہو۔ توبہ توبہ!" پھر میری ساس سے کہنے لگے "بیوی سلو!" وہ بولیں "میں نہیں سنتی۔" اس پر مجھ سے کہا "بیٹی! بُرا نہ مانو۔ ایک بات سُناتا ہوں۔ خدا کے آگے چنا گیا اور فریاد کی کہ باری تعالیٰ یہ کیا بات ہے کہ مجھ کو لوگ طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں۔ بھونتے ہیں، تلتے ہیں، اُبالتے ہیں، پیستے ہیں، آخر میرا کیا گناہ ہے" خدا نے چنے کی طرف دیکھا اور کہا "دور ہو، نہیں میں تجھے کھا جاؤں گا" یہ بات سُناتے ہوئے خود بھی ہنستے رہے۔

میں نے پوچھا "مرزا صاحب کی یادگار کوئی چیز آپ کے پاس ہے؟" کہنے لگیں "مجھے کیا خبر تھی کہ لوگ اُن کی چیزوں کو اس قدر ڈھونڈیں گے۔ میرے پاس تو کوئی چیز نہیں، ہاں معظم میاں (نواب معظم علی خاں) کے پاس اُن کا پیالہ اب تک ہے۔ وہ اُس کو اپنے ساتھ بھوپال لے گئے تھے۔" جب میں نے غالب کے مذہب کے متعلق سوال کیا تو بولیں "اُن کے مذہب کا کیا ٹھکانا۔ جہاں بیٹھے اُسی مذہب میں ہو گئے۔" میں نے پوچھا کہ مرزا صاحب کس عمر میں اونچا سُننے لگے تھے؟ جواب دیا "میں نے تو اُنہیں بہرا ہی دیکھا۔ جب میرا بیاہ ہوا تو بہرے ہی تھے۔"

غالب کے بھائی مرزا یوسف کی وفات کے متعلق دریافت کیا تو کہا "ترس کی گلی میں مارے گئے تھے۔ مسجد تہور خاں میں دفن ہوئے۔" میں نے غالب کے متعلق بھی پوچھا کہ کس جگہ انتقال کیا تو جواب دیا "دیوان خانے میں۔ جہاں حمید خاں نے اصطبل بنایا ہے اُس وقت حکیم محمود خاں، حکیم غلام مرتضیٰ اور حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ سب موجود تھے۔"

اس سوال کے جواب میں کہ مرزا نے کس مرض میں انتقال کیا بگا بیگم صاحبہ نے کہا "وہ کچھ بیمار تو ہوئے نہیں۔ بس مر ہی گئے۔ ہوا یہ کہ کھانا کھانے آئے۔ چندو بیگم کو بہت چاہتے تھے۔ پوچھا۔ جیون بیگ کہاں ہیں؟ بلاؤ۔ احمد بیگ اُن کے خادم تھے۔ اُنہیں بھیجا۔ مرزا صاحب کہنے لگے "اچھا جب وہ آئیں گی تو کھانا کھاؤں گا۔" یہ کہہ کر لیٹ گئے۔ کروٹ لے کر لیٹے ہی تھے کہ بے ہوش ہو گئے۔ اسی حالت میں اُن کا دم نکلا۔

اُمراؤ بیگم کے متعلق بگا بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا "جب میں بیاہی گئی تو وہ اچھوڑ کی پھانک تھیں۔ جا نماز پہ بیٹھ کر کہا کرتیں "ہائے

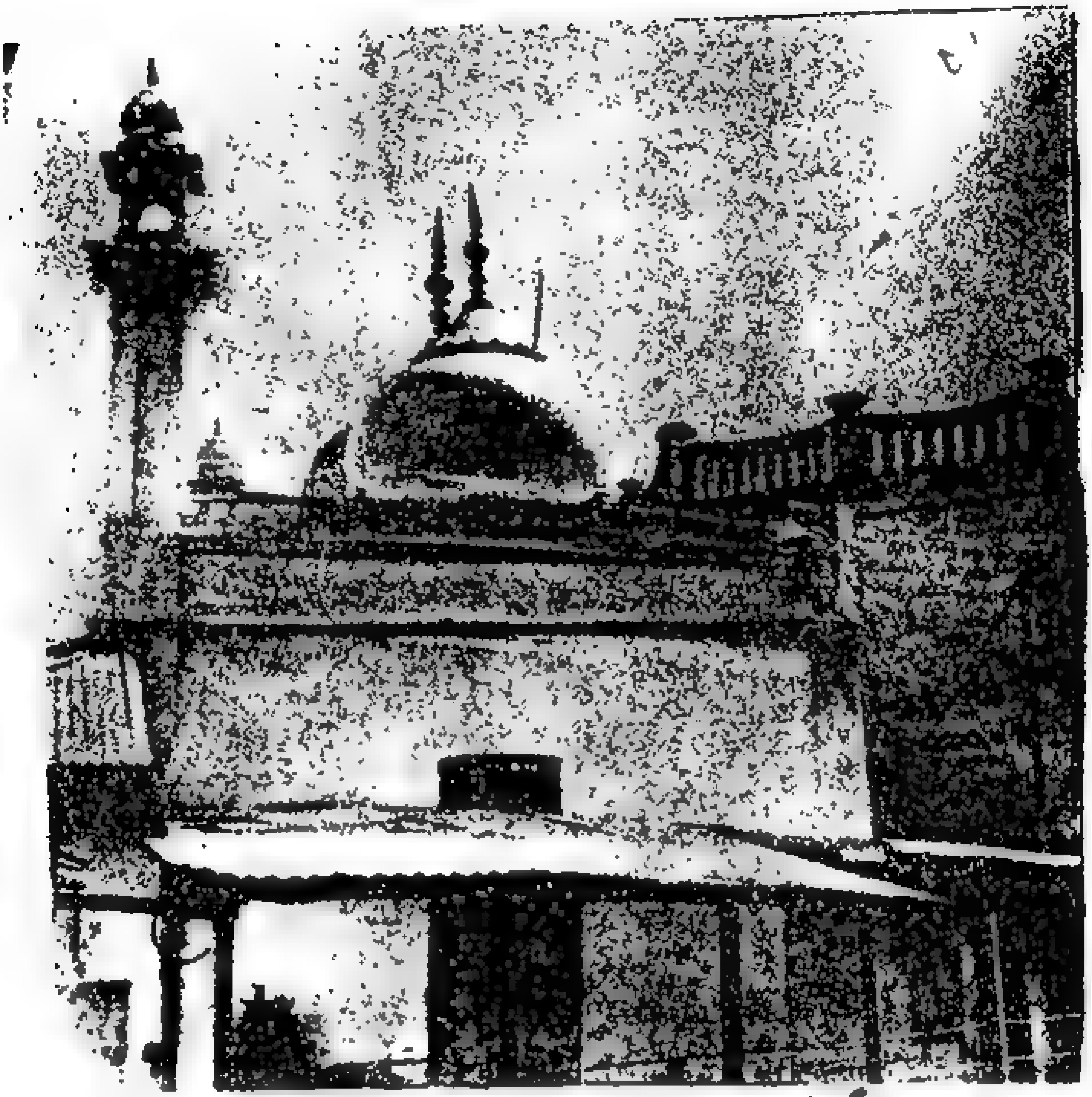

گلی قاسم جان میں مسجد کے قریب وہ مکان جہاں غالب رہتے تھے۔

ؔ مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے۔

اللہ تو کب بُلائے گا!" ایک روز میں نے پوچھا: "پھوپھی جان آپ کو قبر سے ڈر نہیں لگتا؟" کہنے لگیں: "تھکا بیل سرا کو دیکھتا ہے۔"

یہ ہے اُن معلومات کا بڑا حصہ جو مجھے بگا بیگم صاحبہ سے حاصل ہوئیں۔ یہیں اس تحریر کو ختم ہونا چاہیئے تھا لیکن آخر میں مجھے ذاتی حیثیت کی ایک چھوٹی سی بات کا بھی ذکر کرنا ہے۔ جس دن مجھے بگا بیگم صاحبہ سے باتیں سُننے کا موقعہ ملا، اُسی شام میں نے اپنی والدہ مرحومہ کو (جو اس وقت زندہ تھیں) معمول کے مُطابق ایک خط لکھا۔ یہ خط محفوظ ہے اور اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس میں مجھے یہ عبارت نظر آتی ہے۔

آج صبح ہوٹل سے نکل کر میں پھر حکیم صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ مجھے بگا بیگم صاحبہ (معظم زمانی بیگم) دختر نواب ضیاء الدین نیر رخشاں کے پاس لے گئے۔ یہ عارف کی بہو ہیں۔ نوّے برس کی عمر ہے۔ گھر کی باتیں بتاتی رہیں۔ بہت مہربانی سے پیش آئیں۔ بار بار اصرار سے پان دینا چاہتی تھیں۔ مگر حکیم صاحب (جنہیں علم تھا کہ میں پان نہیں کھاتا) روک دیتے تھے۔ اُنہیں بار بار یہی خیال ہوتا تھا کہ اتنی دُور سے آئے ہیں۔ اُن کی تواضع ضرور ہونی چاہیئے۔"

میں اب بھی پان نہیں کھاتا ہوں۔ لیکن جب اس عبارت کو پڑھتا ہوں تو یہ افسوس ضرور ہوتا ہے کہ میں اُس دن ایک تبرک سے محروم رہا۔

●●

غالبؔ کی

شہرت کا راز

علیم اختر مظفر نگری

اُردو ادب نے غالبؔ جیسا خوش بخت اور صاحب نصیب شاعر پیدا نہیں کیا۔ ذرا غور کیجئے بادشاہِ وقت کا مصاحب ہی نہیں اُستادِ شاہ بھی ہے۔ اپنے وقت کا بہت بڑا خطاب "نجم الدولہ، دبیر الملک" اُسے حاصل ہے۔ معتقدوں، شاگردوں اور دوستوں کا حلقہ انتہائی وسیع جس میں ہر طبقہ اور مذہب کے لوگ شامل ہیں۔ اور یہ سب صاحب حیثیت اور ذی عزت لوگ ہیں۔ منشی نول کشور، بال مکند بے صبر، شیو نارائن آرام، منشی جواہر سنگھ، لالہ بھج مل رائے، امیر سنگھ، منشی ہرگوپال تفتہ، مفتی صدر الدین آزردہ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولانا فضل حق خیر آبادی، شاہی طبیب حکیم احسن اللہ خاں خواجہ الطاف حسین حالی، سر سید احمد خاں وغیرہ تو خیر اپنے تھے، ولیم فریزر، ریگن، اسٹرلنگ اور الیگزینڈر ہیڈرے جیسے غیر ملکی اور صاحبانِ اقتدار بھی دوستانہ مراسم رکھتے تھے۔

سسرال ملی تو ایسے گھرانے میں جو جاہ و ثروت کے لحاظ سے دلی کے ممتاز ترین خاندانوں میں تھا۔ فخر الدولہ نواب احمد بخش آف لوہارو کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش معروف کی صاحب زادی امراؤ بیگم جیسی صابر و شاکر بی بی شریکِ حیات ملی۔ اور یہ نیک بی بی مرزا کے لئے ہزار آسانیوں اور برکتوں کا باعث بنی۔

معاشی اعتبار سے بھی حالت بُری نہیں تھی۔ خاندانی پنشن، قلعۂ دلی اور رام پور کی امداد، احباب کے تحائف۔ مل ملا کر متوسط درجے کے انسان کے لئے اچھی خاصی نوابی تھی۔ یاد رہے یہ بات کہ مرزا اپنی شاہ خرچی کے باعث ہمیشہ ذہنی انتشار میں مبتلا رہے۔

غالبؔ کی آفاقیت مُسلّم، غیر معمولی قابلیت و استعداد بلند فطرتی، ذہنی اُپج اور اوجِ تخیّل اپنی جگہ ——— شوخی، بذلہ سنجی اور ظرافتِ طبع ایک طرف، وہ اپنا زمانہ آپ ہی لیکن شخصیتوں کو اُبھارنے اور صفات کو اُجاگر کرنے کے لئے ضرورت ہوتی ہے کچھ خارجی عناصر اور محرکات کی۔ ورنہ "میری" بھی دھری رہ جاتی ہے۔

شیفتہ، آزاد اور حالی سے لے کر آج تک ہمارے اہلِ قلم کی کثیر تعداد نے مختلف زاویوں اور مختلف ادبی رجحانات کے تحت غالبؔ پر اس کثرت سے لکھا ہے کہ میرؔ جیسے آفاقی شاعر اور "خدائے سخن" کو یہ بات نصیب نہ ہو سکی۔ اگرچہ خود غالبؔ کہتے ہیں ———

"سُنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا"

یا انتہائی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ———

"آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں"

یہ تو میر صاحب کے متعلق غالبؔ کا نیاز مندانہ عقیدت تھا، اب خود غالبؔ کے متعلق خدائے سخن حضرت میرؔ کے ریمارکس کا واقعہ ملاحظہ کیجئے:

> غالبؔ صغر سنی میں ہی اچھا شعر کہنے لگے تھے۔ نواب حسام الدین حیدر خاں صاحب نے اُن کا کلام لے جا کر اپنے اُستاد میر تقی میرؔ کو لکھنؤ میں دکھایا تھا۔ جس پر میر صاحب نے فرمایا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اُس نے اُس کو سیدھے راستے

پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ
مہمل بکنے لگے گا۔"

غالب سے محبت کرنے والوں میں صرف دُنیادار ہی نہیں صاحبانِ حال و قال لوگ بھی نظر آتے ہیں۔ سلسلۂ قادریہ کے مشہور بزرگ حضرت سید غوث علی شاہ قلندر جہانیاں جہاں گرد لوگ تھے۔ گھومتے پھرتے دلی پہونچے۔ زینت المساجد دریا گنج دلی میں قیام فرمایا۔ سید صاحب پہلی مرتبہ خود ہی مرزا صاحب سے ملنے گئے پھر بعد میں چھ ماہ تک مرزا صاحب وقتاً فوقتاً سید صاحب سے ملنے زینت المساجد جاتے رہے۔ سید صاحب نے اپنے ملفوظات میں دو مقام پر مرزا غالب کا ذکر کیا ہے اور مرزا کے اکثر اشعار بھی نقل فرمائے ہیں۔ غالب کے اخلاق و عادات کی تصویر جس انداز سے کھینچی ہے، اُن سے خود سید صاحب کے اعلیٰ اخلاق پر روشنی پڑتی ہے۔ ورنہ کہاں ایک اہلِ دل بزرگ، ور کہاں ایک رندِ مشرب آدمی۔

غالب کی دلفریب شخصیت، شاعرانہ عظمت اور صفات کو اُجاگر کرنے، اُن کی شہرت میں چار چاند لگانے والوں میں اوّلیت کا سہرا خواجہ الطاف حسین حالی کے سر باندھا جائے گا۔ حالی جیسا صاحب طرز ادیب یادگارِ غالب لکھتا ہے تو شاگردی کا پورا پورا حق ادا کر دیتا ہے۔ نہ صرف مرزا کی زندگی اخلاق و عادات اور خیالات سے روشناس کراتا ہے بلکہ اُن کے کلام پر بھرپور تبصرہ بھی کر دیتا ہے۔ مرزا کے انتقال پر مرثیہ لکھتا ہے تو ایسا کہ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ اس ترکیب بند میں مرزا کی زندگی، دلفریب شخصیت شاعرانہ عظمت اور صفات کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسداللہ خان غالب مُرد
بُلبلِ ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس
پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
اُس کے مرنے سے مر گئی دِلّی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

★

قدسی و صائب و اسیر و کلیم
لوگ جو چاہیں اُن کو ٹھیرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں،
غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

★

خاکساروں سے خاکساری تھی
سربلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلہ
دِل میں اعداء سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے
زہد اُس کا اگر شعار نہ تھا

اگرچہ ابتدائے عمری سے مختلف تذکروں میں غالب کا ذکر ہونے لگا تھا لیکن جس تفصیل کے ساتھ سرسید نے اپنی مشہور تصنیف آثار الصنادید میں غالب کے حالات لکھے ہیں۔ اس تفصیل کے ساتھ اب تک کسی نے نہیں لکھے تھے اور اُس کا سبب یہ تھا کہ سرسید کو غالب کے ساتھ خاندانی اور ذاتی روابط کی وجہ سے بے انتہا قربت تھی۔ سرسید کے پیش نظر

غالب کی تمام مطبوعہ تصانیف تو تھیں ہی قربت اور تعلق کی وجہ سے وہ غیر مطبوعہ تصانیف بھی مطالعہ میں آ گئی تھیں، جن تک دوسروں کی رسائی ناممکن تھی۔ غالب نے آثار الصنادید پر تقریظ لکھی۔ اس کی اشاعت میں دل چسپی لی۔ کچھ نسخے خرید کر دوستوں کو بہ طور تحفہ بھی دیئے۔

سر سید احمد خاں نے غالب کو "چچا" کہا اور علی گڑھ والوں نے دستور اور روایت کے مطابق سر سید کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو ہندوستان گیر بنا دیا۔ یہ سمجھئے غالب اب "جگت چچا" ہو گئے۔ غالب نوازی کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ غالب پر کام کرنے والوں کی کثیر تعداد علیگ برادری ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے اولڈ بوائے عزت مآب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدر جمہوریہ ہند نے ۱۹۲۵ء میں دوران تعلیم جرمنی مطبع شرکت کاویانی برلن سے غالب کے اردو کلام کا بہت ہی خوب صورت ایڈیشن نسخ ٹائپ میں شائع کرایا تھا۔ اس نسخہ میں غالب کی جو تصویر ہے وہ ڈاکٹر صاحب کی تخیلی تصویر ہے جو کسی آرٹسٹ سے وہیں برلن میں بنوائی گئی تھی۔

علی گڑھ کے مشہور اولڈ بوائے، ہندوستان کے نامور مسلم رہنما مولانا محمد علی مرحوم نے سب سے پہلے اپنے مشہور اخبارات کامریڈ اور ہمدرد میں اپیل کی تھی کہ غالب کے مزار کو شکست و ریخت اور دست و برد زمانہ سے بچانے کے لئے غالب کے شایانِ شان ایک یادگار کی شکل میں منتقل کی جائے۔

کلام غالب کی اہمیت اور عظمت کو نقد و نظر اور اصولِ تنقید کے جدید طریقوں سے پرکھنے کا کام علی گڑھ کالج کے دو نامور فرزندوں ڈاکٹر سید محمود اور ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری نے کیا۔ یہ مقالات گنجائش اختلاف کے باوجود قابلِ قدر ہیں۔

بھوپال سے کلامِ غالب پر مشتمل نسخہ حمیدیہ بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا۔ جسے مفتی انوار الحق صاحب نے شائع کیا۔ اس نسخہ میں "محاسنِ کلام غالب" کے نام سے عبد الرحمٰن صاحب بجنوری کا مشہور مقدمہ شامل ہے جس میں بجنوری مرحوم نے انتہائی عقیدت کے ساتھ لکھا:

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، ایک وید مقدس اور دوسرا دیوانِ غالب"

ابھی پندرہ سولہ برس پہلے ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ (علیگ) نے مضامین کا ایک مجموعہ "احوالِ غالب" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اس مجموعہ میں یوں تو ہر مضمون قابلِ قدر ہے لیکن خود ڈاکٹر صاحب کا مضمون "مرزا غالب کی تصویریں" اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت اچھا اور انتہائی کدوکاوش کا آئینہ دار ہے۔

غالب پر کام کرنے والوں میں پرتھوی چند دہلوی "مرقع غالب" والے، مولانا امتیاز علی عرشی اور مالک رام صاحب بہت پیش پیش ہیں۔ مالک رام صاحب نے بڑی محنت اور جاں فشانی کے ساتھ "تلامذہ غالب" ترتیب دی ہے۔ اور اردو داں طبقہ کو غالب کے شاگردوں سے متعارف کرایا ہے ——— "دیوانِ غالب" مرتبہ مالک رام صاحب بھی بڑا کارنامہ ہے۔ اس سلسلہ میں ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر گیان چند ایم۔ اے۔ ڈی فل حمیدیہ کالج بھوپال کا ایک مضمون "غالب اور بھوپال" دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے تحقیقی رسالہ "اردوئے معلیٰ" مرتبہ خواجہ احمد صاحب فاروقی میں شائع ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"مالک رام صاحب کے مرتبہ دیوانِ غالب میں ایک نئی غزل شامل ہے جس کا مقطع چونکا دینے والا ہے۔

پیرانہ سال غالب پیکش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

بھوپال میں غالب کی آمد کا کوئی ثبوت نہیں۔ میں نے جناب مالک رام کو لکھا کہ یہ غزل الحاقی ہے لیکن وہ اپنے نو دریافت مایۂ عزیز کو گنوا دینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اُن کا اصرار تھا کہ یہ غزل غالب ہی کی ہے۔

حال میں اِس غزل کا رازِ سربستہ وا ہو گیا۔ یہ غزل سب سے پہلے ماڈل اسکول بھوپال کے رسالہ "گوہرِ تعلیم" بابت اپریل ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ اِس "مذاق" کے مصنّف اسکول کے ہیڈ مولوی جناب محمد ابراہیم خلیل تھے۔ اپریل فول کا عنوان دے کر نیچے نوٹ دیا تھا:

"ماخوذ از کتب خانہ یار محمد خاں، بوسیدہ اوراق میں غالب کی یہ غیر مطبوعہ غزل ملی ہے جسے آخری تبرکات کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے"

وہاں سے لے کر اوائل ۱۹۲۸ء میں رسالہ ہمایوں نے اُسے شائع کر دیا اور ہمایوں سے لے کر خواجہ حسن نظامی نے اپنے اخبار منادی کی زینت بڑھائی۔ اس طرح اس مذاق نے بڑے بڑے ادیبوں کو اپریل فول بنا دیا۔

آج کل خلیل صاحب ممبر مسلم وقف بورڈ ہیں۔ متشرع بزرگ ہیں اور علماء میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ اُن کے صاحب زادے ایم اے اُردو میں میرے شاگرد ہیں، اُن کی زبانی یہ تفصیلات معلوم ہوئیں۔ ان صاحب زادے کے نکاح میں شرکت کے لیے موقع بجھ بھوپال میں جانا پڑا۔ وہاں خلیل صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں نے اِس واقعہ کی تصدیق چاہی۔ مسکرا کر اعتراف کر لیا۔ اور فرمایا کہ دیوانِ غالب میں اس غزل کو شامل دیکھ کر میں نے مالک رام کی خدمت میں تمام پوست کندہ حقیقت لکھ کر روانہ کر دی تھی۔ مالک رام نے سکوت ہی میں اپنی عافیت سمجھی

چوں کہ ایک اہلِ دین بزرگوار خانۂ خدا میں اس غزل کی تصنیف کا اقرار کر چکے ہیں، اس لئے اس واقعہ کی صحت میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔"

محترم قاضی عبدالودود صاحب بھی غالبیات پر ایک اتھارٹی مانے جاتے ہیں۔ قاضی صاحب موصوف نے اپنے ایک مضمون "برزخ عبدالصمد" میں دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ عبدالصمد جس کے متعلق غالب نے صریحاً لکھا ہے کہ میں نے "آئینِ معنیٰ آفریں" عبدالصمد سے سیکھے ہیں۔ غالب کے بحرِ تخیل کی ایک موج سے زیادہ نہیں ہے اور عبدالصمد غالب کا زائیدۂ طبع ہے۔ علامہ اقبال جب غالب کی موت پر مرثیہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو ایسی لاثانی نظم کہہ جاتے ہیں جو بالکل قصیدہ معلوم ہوتی ہے۔ صرف ایک شعر سنئے ــــــ

شاہدِ مضموں تصدّق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گُلِ شیراز پر

یہ ہیں وہ خارجی عناصر و محرکات، جنہوں نے غالب کو غالب بنا دیا اور جن کے مطالعے نے ایک عام اور معمولی ذہن کے آدمی کو بھی یہ سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ وہ خود بھی غالب کو پڑھے اور اپنی فہم و فراست کے مطابق اُس کے کلام سے استفادہ حاصل کرے۔

حمیدہ سلطان

غالب کی محبوبہ

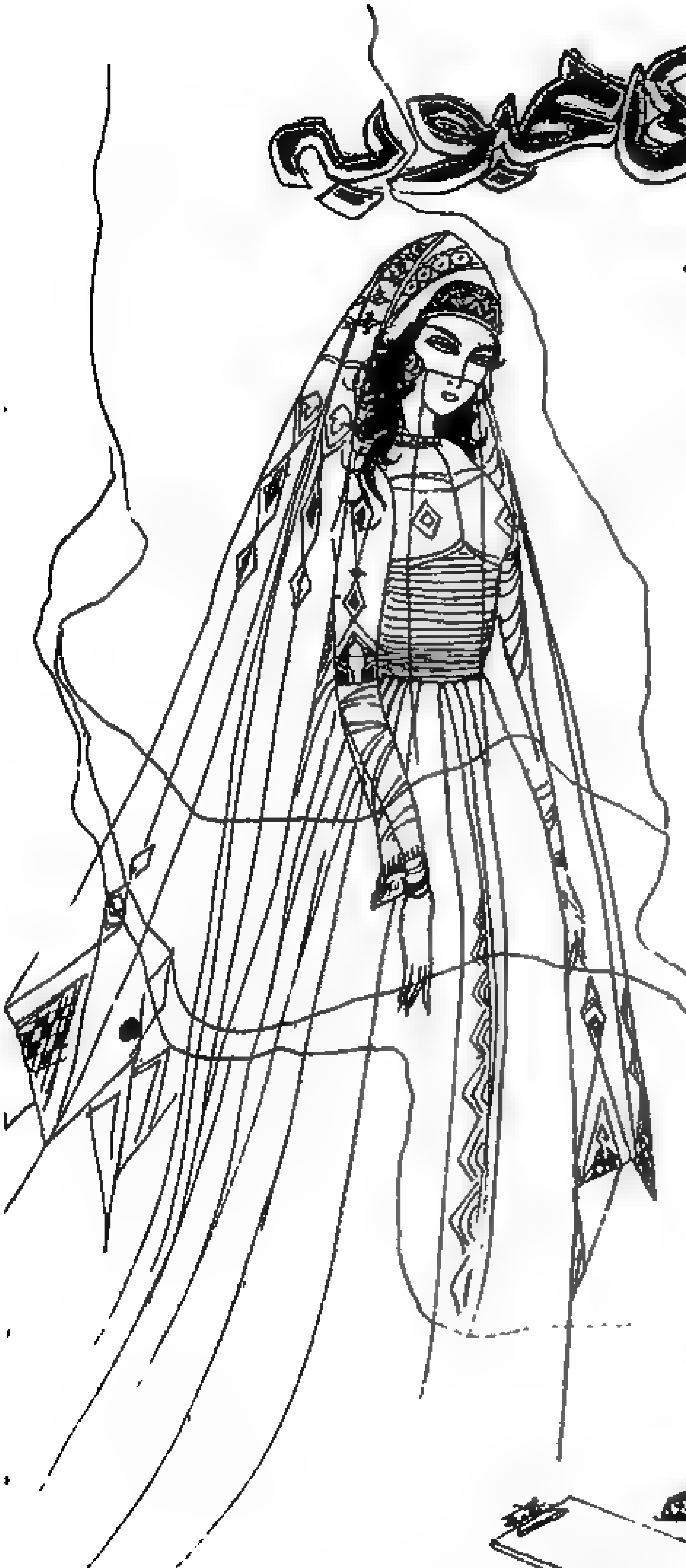

اسد اللہ خاں غالب نے آگرے کے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جو نصف صدی پہلے سمر قند سے آیا تھا۔ اپنے شجاعانہ بانکپن اور بے مثل دلیری سے ہندوستان میں بھی اس کو عزت واعزاز مل گیا۔ اسی بناپر غالب نے ذوق پر طنزیہ چوٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ع

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

باپ کا سایہ بچپن میں غالب کے سر سے اٹھ گیا۔ ننہیال امیر تھی۔ اس لئے لڑکپن ہاتھوں چھاؤں گزرا اور اوائل شباب اللّوں تللّوں میں تعلیم بھی باقاعدہ نہ ہوسکی، ہاں، اتنا ضرور پڑھ لیا تھا جتنا اس زمانہ میں شرفاء کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔
تیرہ سال کی بالی عمر میں نواب الٰہی بخش خاں معروف کی

چھوٹی صاحب زادی، امراؤ بیگم سے شادی ہوئی اور میرا یہ کہنا تعلّی نہیں حقیقت ہے، اس شادی نے جس کو خوش طبعی سے مرزا صاحب عمر بھر "حبس دوام اور پاؤں کی بیڑی" کہتے رہے، ان کے ذوقِ شعری کو بلند کیا، کردار کو پاکیزگی بخشی۔ آگرے والی بے راہ روی اور رنگ رلیاں دلّی کے مستقل قیام کے بعد غالب میں باقی نہیں رہیں۔ ان کے خُسر دلی کے ایک بہت اونچے خاندان کے جو نہ صرف اِمارت، بلکہ علم و فضل کے لحاظ سے بھی اونچا تھا ایک فرد تھے اور بڑے پایہ کے شاعر بھی اور اس وقت کے اہلِ علم نواب صاحب کے پاس اکثر جمع رہتے۔

نوجوان اور ذہین شاعر پر اس علمی اور ادبی ماحول کا اثر بہت اچھا ہوا، ان کا اندازِ فکر بدلا اور شاعری نے نئی تازگی پائی ــــ!

غالب کا فن، ان کی وجیہہ شخصیت کا عکسِ جمیل ہے، وہ تورانی النسل تھے، عالی خاندان تھے، اس لئے چوڑا چکلا ہاڑ تھا، بیضوی انداز کا بارُعب چہرہ، سرخی مائل چمپئی رنگ، بڑی بڑی غلافی مخمور آنکھیں، چڑھی ہوئی مونچھیں، صفاچٹ داڑھی، سر پر کلاہ پپاخ، گلے میں شبنم کا کرتا اس پر تین سکھ یا جامدانی کی سینہ کشا "جیسے پھولوں کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہو"، اس سج دھج سے مرزا صاحب جب مشاعرے میں جاتے تو ہر ایک ان کی وجیہہ شخصیت سے مرعوب ہو جاتا۔ پھر ان کے اشعار بھی انسانی جذبات و احساسات کا ایک موجیں مارتا ہوا سمندر ہیں اور ہر مصرع زندگی کی مونہہ بولتی تصویر ــــ فطرت کے لامحدود پہلو جس طرح جذبۂ محبت کے تحت بنتے اور سنورتے ہیں، اس کو بیان کرنے میں مرزا کو کمال حاصل ہے۔ اُردو غزل کے روایتی معشوق کو غالب نے بالکل رخصت کر دیا، وہ تو اس دنیا کی عورت کو حورانِ خلد پر ترجیح دیتے ہیں۔

مثنوی "چراغ دیر" میں جس پُرجوش اور البیلے انداز سے انھوں نے نازنینانِ بنارس کے دل رُبا حسن کی تصویر کشی کی ہے، وہ ان کے فن کو بہت بلند کر دیتی ہے۔ غالب فرسودہ انداز سے محبوبہ کے سامنے بھیگی بلّی بنے کبھی نظر نہیں آتے بلکہ ان کی فطری انا ہر موقع پر ان کے آڑے آتی ہے اور اپنی شوخ طبعی کی بدولت محبوبہ پر کبھی کبھی وہ پھبتی بھی کس دیتے ہیں:

پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حسن
دست مرہونِ حنا رخسار رہن غازہ تھا

لیکن اس میں شک نہیں کہ اس شعلہ خو حسینہ سے مرزا بہت مرعوب

بھی تھے جوان کو اکثر نگاہِ گرم سے تعلیم ضبط دیتی رہتی تھی، غالب کی محبوبہ شوخ و شنگ، فتنہ طراز تو ہے لیکن اُردو شاعری کی روایتی درندگی کے خصائل اس میں بالکل نہیں اور یہ بھی بڑی دل چسپ بات ہے کہ غالب کا تصورِ شعری ساکت نہیں ہے، وہ اکثر اپنی محبوبہ کو چلتے پھرتے ہی دیکھتے ہیں:

مع موجِ خرامِ ناز بھی کیا گل کتر گئی
لرزے ہے موج سے تری رفتار دیکھ کر

مع لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ

مع جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

ع آ، اے بہارِ ناز کہ تیرے خرام سے
دستار گردِ شاخِ گلِ نقشِ پا کروں

غالب کی ساری شاعری پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجاز کے پردے میں حقائق بھی کچھ نہ کچھ موجود ہیں۔ مرزا صاحب کا یہ پاکیزہ اندازِ فکر اور دل آویز بیان کسی "ستم پیشہ" ڈومنی کے لئے ہی صرف نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ یوں ممکن ہے "حسنِ لب بام" سے ان کو کچھ دلچسپی رہی ہو اور ان کی حسین اور رنگین جوانی مشاغلِ عیش و طرب امیرانہ ماحول سے یہ بعید بھی نہیں کہ کوئی ڈومنی بھی ان کی منظورِ نظر رہی ہو مگر یہ سمجھ لینا مرزا پر بہت بڑا ظلم ہے کہ ان کی پوری شاعری کا مرکز ایک ڈومنی ہو سکتی ہے غالب کی شاعری کا بے مثل حسن، انفرادی بانکپن جس نگہ ناز کا عطیہ ہے ان کے فکر کو جس دل کش خیال نے یہ دل آویزی بخشی وہ کوئی ان کی ہی ہم مذاق اور عالی خاندان ناظورۂ جمال تھی جس کے حسنِ صورت پری نہیں، حسنِ سیرت و ذہانت کے بھی وہ گرویدہ تھے، جس کی اشارت و عبارت مرزا کے لئے بلائے جاں تھی اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتے تھے۔

ع قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لئے ہوتے

لیکن ایک شریف، پردہ نشین خاتون کا نام بھلا مرزا صاحب کی زبان پر کیسے آسکتا تھا۔ اس لئے کبھی اپنے دل کے درد کو بذلہ سنجیوں میں چھپاتے اور کبھی "ستم پیشہ ڈومنی" کا ذکر کرکے لوگوں کو ٹال دیتے۔ اس طرح وہ حسین وجود دنیا کی نظروں سے پنہاں ہی رہا جو دراصل مرزا کی شاعری کو رنگین و دل آویز بنا گیا۔

میں نے اپنی نانی اماں، معظم زمانی بیگم باقر علی خاں سے سنا ہے جو عارف کی بہو اور نیر رخشاں کی بیٹی تھیں اور جن کو بہت جاہ و حشم اور بڑے چاؤ کے ساتھ غالب بیاہ کر اپنے گھر لائے تھے اور جو کئی سال تک ان کے گھر میں بہو کی حیثیت سے رہیں کہ مرزا غالب کی ایک شاگرد ترکی نژاد خاتون شاعرہ بھی تھیں، ان کو ترک کا تخلص مرزا صاحب ہی نے دیا تھا۔ میں نے اپنی نانی اماں سے سوال کیا آپ نے ان بیگم کو دیکھا تھا؟ انہوں نے جواب دیا "نہیں اماں! میں ان کو کہاں سے دیکھتی وہ بے چاری تو غدر کے زمانے میں ہی مرگئی تھیں۔ مرزا صاحب سے ہی میں نے دو تین مرتبہ ان کا نام سنا تھا۔ کہتے تھے افسوس! ترک کی عمر نے وفا نہ کی، اگر جیتی رہتی تو بڑے پائے کی شاعرہ ہوتی"!

ترک کے متعلق مجھے نانی اماں سے اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ ان کے آبا و اجداد بخارا سے آئے اور وہ نو عمری میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ پڑھی لکھی اور باذوق خاتون تھیں، اس لئے شوہر کی دائمی جدائی کے بعد شعر کہنے لگیں۔ نانی اماں فرماتی تھیں کہ پھپھی اماں (بیگم غالب) سے میں نے سنا کہ ترک کی ماما روزانہ ان کا کلام مرزا صاحب کے پاس اصلاح کرانے کے لئے لاتی تھی۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء تک رہا، اس خونی ہنگامے میں ترک کو بھی دلی چھوڑنی پڑی۔ بادیہ پیمائی اور صعوباتِ سفر کی تاب ترک کا نازک جسم نہ لا سکا اور وہ گھر سے نکلنے کے چند مہینے بعد فوت ہو گئیں۔

اس کہانی کو سننے کے بعد میں نے اندازہ لگا لیا کہ غالب کے ہر شعر میں جو دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ وہ اغلباً ترک کا عطیہ ہے۔ یہ عالی دماغ اور سلجھے ہوئے خیالات والی خاتون ذہنی مناسبت اور ذوق کی ہم آہنگی کی وجہ سے یقیناً مرزا صاحب کے خیالوں میں بس گئی ہوگی، غالب کے اندازِ فکر میں جو خلوص کی آنچ ہے اور دن بدن اس کی دل آویزی کو زیادہ سے زیادہ جس طرح محسوس کیا جا رہا ہے، اور اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ان کے اشعار کی ملنا پر کیف ہے، یہ اسی کا پرتو ہے اور مرزا کے بعض اشعار سے بھی اس محبوب دل فریب کی تصویر سامنے

آجاتی ہے:

ع کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گل چیں ہے

ع تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ بہ اندازِ گل آغوش کشا ہے

ع سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دل کش سے جو گلزار میں آوے

ع نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

ع دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مرزا کی ۱۸۴۰ء کے قریب لکھی ہوئی ایک مسلسل فارسی غزل ان کی دلی کیفیت کی غماز بھی ہے اور ایک نقشِ تابناک کی حیثیت بھی رکھتی ہے اور اس سے ایک غمگین حسینہ کا عکس بھی سامنے آتا ہے۔ پہلا مصرع ہے:

ع "گریہ از بس نازکی رخ ماندہ برخاکش نگر"

اس پردہ نشین کی ایک جھلک دیکھنے پر ہی مرزا بے اختیار جھوم اٹھے تھے۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

کبھی اس محبوبۂ دل نواز کی دل فریبیٔ تحریر پر جاں نذر کرنے کی تمنا ان کے دل میں پیدا ہوتی تھی کبھی اس کی بے نیازی پر دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیتے تھے۔

بے نیازی تری عادت ہی سہی

ایک مرتبہ یہ شعلہ خو حسینہ نہ جانے کس بات پر مرزا صاحب سے روٹھ بھی گئی اور ان کے نامۂ شوق کا جواب نہیں دیا۔ مرزا صاحب بے چین تو بہت ہوئے لیکن اپنی شان مرزائی کو مجروح کے سامنے بھی برقرار رکھنا تھا اس لئے جب دل نہ مانا تو یہ لکھ کر بھیج دیا:

ع سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ آخر سر گراں کیوں ہو

اس حقیقت سے تو سب ہی واقف ہیں کہ جیسا کسی انسان کا خیال ہوتا ہے۔ ایسا ہی اس کا فن ہوتا ہے۔ کسی بھی خلاق کا کمال اس کے تصورِ عشق میں بھی نمودار ہوتا ہے۔ غالب نے عشق کو "رونقِ ہستی" کہا ہے:

ع رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

غالب کا تصورِ عشق توانا اور حقیقت کے قریب ہے' فرسودہ خیالات اور یاوہ گوئی کا ڈھیر نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ غالب نے ایک حسین خیال کو چاہا اور چاہے گئے۔ انہوں نے جھوٹ کا طومار نہیں باندھا۔ اپنی کیفیاتِ قلبی کو شعروں میں پیش کیا اور جس طرح جو بھی محسوس کیا' لوح و قلم کے حوالے کر دیا جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اپنے اس اخلاص کی بدولت وہ جس مقام پر ہیں آج بھی تنہا کھڑے ہیں۔ کوئی ان کا حریف نہ بن سکا:

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

میرے خیال کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ غالب پر تنقید کرتے ہوئے اکثر نقادوں نے لکھا ہے کہ غالب نے ایک نہیں کئی مرتبہ عشق کیا ہے۔ یوں تو وہ "حسنِ لبِ بام" کے بھی شیدا ہوئے اور ایک "ستم پیشہ ڈومنی" کو بھی انہوں نے مار رکھا، مگر وہ اس محبوبہ کو کبھی بھی نہ پا سکے جس سے ان کو واقعی عشق تھا۔ اسی لئے انہوں نے اپنے داغِ ناتمامی کو اس شمع سے تشبیہ دی ہے۔ جیسے کسی نے بجھا دیا ہو:

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

غالب کی سب سے زیادہ شاعرانہ خصوصیت

ان کا وہ اندازِ بیان ہے جو ان کے ہر شعر میں پایا جاتا ہے سوال یہ ہے کہ ان کے اندازِ بیان میں یہ ندرت کیسے آئی؟ غالب کے عہد میں حالات بہت کچھ بدل چکے تھے تھے تاریخی حیثیت سے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ایک شاعر کو آزادی سے کچھ کہنے کے لئے مواقع مل سکتے تھے ۔

انہوں نے ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ ملک میں عام طور پر صاف وسادہ شعر پسند کئے جاتے ہیں۔ میر و سودا کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی مگر انہوں نے طبائع کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے طرز بیدل میں شعر کہنا شروع کر دیا گویا اپنے عہد کے خلاف اعلان جنگ چنانچہ غالب کی شدت سے مخالفت کی گئی کچھ تو اس وجہ سے کہ ان کی آواز نئی آواز تھی دوسرے یہ کہ طرز بیدل میں کہتے ہوئے شعر نہایت پیچیدہ ہوتے تھے سننے والوں کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ غالب نے بھی اپنی جگہ محسوس کیا جس کا اعتراف خود اس طرح کیا۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

اس لئے وہ طرزِ بیدل کو چھوڑ کر صاف وسادہ شعر کہنے کی کوشش کرنے لگے چونکہ ایک عرصہ تک مشکل راہوں میں چلنے کی وجہ سے طبیعت میں ایک خاص قوت ایجاد پیدا ہوگئی تھی اس لئے اب جو کچھ کہا گیا وہ اردو زبان ہی میں بے نظیر نہیں بلکہ بعض اشعار اتنے اعلیٰ درجہ کے ہیں کہ فارسی میں بھی ان کی نظیر نہیں ملتی ۔

حقیقتاً یہ طرزِ بیدل میں مشق کرنے کا نتیجہ تھا کہ غالب کے اندازِ بیان میں انوکھا پن پیدا ہوگیا۔ اس لئے ان کی یہ کوشش بے کار نہیں گئی اس کی وجہ سے طبیعت کے لئے نئی نئی راہیں کھل گئیں وہ اشعار جو ان کی عمر اخیر کا سرمایہ ہیں باوجود صاف وسادہ ہونے کے طرزِ بیان کے لحاظ سے نہایت بلیغ و پرکار ہیں۔ اگر طرز بیدل کی پیروی کا بوجھ غالب کی طبیعت پر نہ پڑتا تو ان کی طبیعت سے وہ چشمے نہ اُبلتے جو آج اُردو زبان کے باغ کی آبیاری کر رہے ہیں اور جن کی بدولت اُردو، نظم و نثر میں ایک غیر معمولی استعداد پیدا ہوگئی ہے، اس کے علاوہ اُن کے اندازِ بیان کی انفرادیت کا ایک اور بھی سبب ہے کہ انہوں نے فارسی زبان کے شعرائے متاخرین، قاآنی نظیری اور عرفی کے کلام کو بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا تھا اُن کے اندازِ بیان کا اثر بھی غالب کی شاعری پر ہے، یہی اسباب خاص ہیں جن کی وجہ سے اُن کے اندازِ بیان کا رُخ اور شعرائے اُردو کے عام رجحان سے مختلف رہا یہی باتیں جو دوسروں کے یہاں صرف حسنِ بیان کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہیں ان کے یہاں انوکھے اندازِ بیان کی وجہ سے مضمون آفرینی اور تخیل کی بلند پروازی کا فلک

بوس مرتبہ حاصل کر لیتی ہیں مثلاً یہ ایک عام مضمون ہے کہ اگر معشوق امتحانِ عشق کے لئے تیار ہو تو یہ عاشق کی بڑی خوش نصیبی ہے کیونکہ اس صورت میں اس کی آرزوئے قتل پوری ہو جاتی ہے اور اظہارِ وفا کا اچھا موقع ہاتھ آجاتا ہے لیکن اگر وہ آمادۂ امتحان نہیں ہوتا تو عاشق کی اس سے بڑھ کر اور کوئی بدنصیبی نہیں ہو سکتی۔ مومن خاں نے اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے۔

کرتے وفا امیدِ وفا پر تمام عمر
پر کیا کریں کہ اس کو سزا امتحان نہیں

اس شعر میں خیال مذکورہ نہایت خوبی سے بندھا ہے مگر غالبؔ نے طرزِ ادا کی جدت سے کام لے کر اور اس میں ایک اور پہلو پیدا کیا ان کا شعر یہ ہے

مجھ پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

اس مضمون کے سلسلے میں معشوق کا امتحان لینا یا نہ لینا ہی عام طور پر بیان کیا گیا ہے اور اسی مفہوم کو نئے نئے انداز سے اردو شعراء نے باندھا ہے مگر غالبؔ نے نئی بات پیدا کی کہ وہ امتحان امتحان کی غرض سے نہیں لے رہے ہیں بلکہ محض دل لگی اور چھیڑنے کے طور پر لینا کر رہے ہیں اس تصرف سے عاشق کی بدنصیبی اور مایوسی کی داستان اور زیادہ درد انگیز ہو جاتی ہے کیونکہ اس صورت میں اظہارِ وفا کا کوئی موقع ہی نہیں رہتا کہ کب اور کس طرح وفا کا ثبوت دے۔ مومن کا ایک شعر ہے۔

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا، کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

یہ شعر مومن کے اعلیٰ درجے کے شعروں میں سے ایک ہے اور ان کے خاص رنگِ تغزل کا بہترین نمونہ ہے "کوچۂ رقیب" میں معشوق کے قدم پر سجدہ تو کر لیا لیکن اس کے بعد دفعتاً یہ خیال کہ سجدہ کہاں کیا گیا ہے عاشق کے لئے ایک خفیف بے چینی کا باعث بن جاتا ہے جس کو "کیا کیا ذلیل" موثر ٹکڑے کے ذریعہ ادا کیا گیا ہے دوسرے مصرع میں جو مجبوری عاشق کی تشریح کی گئی وہ بے پناہ تاثیر لئے ہوئے ہے دوسرے مصرع کی تعریف نہیں ہو سکتی اب غالبؔ کے انداز بیان کا تصرف ملاحظہ کیجئے ارشاد ہوتا ہے۔

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

دونوں شعراء اپنے اپنے انداز میں بہت بلند ہیں۔ کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی مگر غالبؔ کے اس تصرف کی داد کون نہیں دے سکتا کہ خودداری عشق کا احساس اس بے خودی میں بھی موجود ہے جب کہ وہ بار بار کوچۂ رقیب سے گزر رہا ہے اس کا رشک کسی طرح اس کو برداشت نہیں کرتا کہ معشوق کا گھر ایسی جگہ ہو جہاں اس کو رقیب کے کوچے سے گزرنا پڑے غالبؔ نے اپنے تغزل میں ایسے ایسے نکات فطرت اور نفسیاتی مسائل حل کر دیئے ہیں جو بڑے بڑے ماہرینِ حیات کے مفصل کارناموں میں نہیں پائے جاتے غالبؔ نے حیاتِ انسانی کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے گو وہ نظیر اکبر آبادی کی طرح عوام کے ساتھ گھومتے نہیں لیکن انہوں نے زندگی کا اتنا گہرا مشاہدہ کیا کہ نبضِ گیتی کی دھڑکتی ہوئی رفتار ان کی نظروں کے سامنے اچھلنے لگی۔ تعجب صرف یہ ہے کہ انہوں نے صرف دہلی کی ایک حویلی کے دیوان خانے کی محدود فضاء میں رہ کر زندگی کا اتنا عمیق مشاہدہ کیسے کر لیا۔؟

فکر تونسوی غالب کے شعر کی شرح کرتے ہیں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

اللہ اور غالب کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ احباب میری غالب کے اشعار کی تشریح پر یوں جھوم اُٹھے، جیسے کوئی کسی دیانت دار کانگریسی کو دیکھ کر جھوم اُٹھتا ہے۔ میں ناشرین کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اُمید ہے، وہ اُسے رسمی شکریہ سمجھ کر میری روح کو تکلیف نہیں دیں گے۔

آج غالب کا ایک اور شعر تشریح کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ پہلے سُن لیجئے ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

اس شعر میں دو کردار ہیں۔ ایک عاشق اور ایک معشوق۔ اُردو کے شعر میں ہمیشہ یہی دو کردار ہوتے ہیں اور ان دونوں کے تصادم سے ایک شاعر جنم لیتا ہے۔ غالب کے اس شعر میں بھی یہ تصادم موجود ہے۔ اس شعر کا عاشق کافی بے وقوف آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اور معشوق کافی ہوشیار، عیّار، زمانہ ساز ہے۔ یعنی یہ ایک بے وقوف اور سادہ لوح آدمی کی ایک عیّار اور چالاک انسان سے ٹکراؤ کی کہانی ہے۔ نہ جانے خدا نے عشق کے نصیب میں بے وقوفی کیوں لکھ رکھی ہے۔

شعر کی کہانی یوں چلتی ہے کہ عاشق صاحب نے ایک معشوق صاحبہ سے عشق کا آغاز کیا۔ اور پہلی ملاقات پر ہی اعلان کر دیا کہ جانِ من! میں تمہاری خاطر اپنا تن، من، دھن تک قربان کر دوں گا —— عشق کے آغاز میں ہر عاشق کے مُنہ سے یہ فقرہ نکل جاتا ہے۔ چنانچہ غالب کے مُنہ سے بھی نکل گیا ہوگا یہ شعر پڑھ کر ظاہر ہوتا ہے کہ اب غالب صاحب سخت پچھتا رہے ہیں کہ میں نے یہ فقرہ زبان سے کیوں نکالا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ فقرہ رسمی نہیں تھا بلکہ حقیقی تھا۔ اور مجھے واقعی اپنا دھن دولت لٹا دینا پڑے گا' تو...... تو...... (شائد میں عشق ہی نہ کرتا بلکہ بزازی کی دُکان کھول لیتا)۔

یہ شعر عشق کے آغاز کی ایک میٹھی یاد کو تازہ کرتا ہے، جواب ایک تلخ یاد بن گئی ہے۔ عاشق صاحب مالی طور پر قریب قریب برباد ہو چکے ہیں۔ یعنی آبائی مکان نیلام ہو چکا ہے، گہنا پاتا گروی رکھا جا چکا ہے، تن پہ کپڑا نہیں رہا، کپڑوں کا آخری جوڑا ڈرائی کلینرز کے پاس پڑا ہے اور دھلائی کی اُجرت ادا نہ کر سکنے کے باعث لایا نہیں جا سکا۔ عاشق صاحب تندور یا ڈھابے پر جا کر کھانا کھاتے ہیں، اور کئی بار ڈھابے کے مالک کے ہاتھوں دُھتکارے بھی جاتے ہیں۔

یعنی یہ دردناک صورت حالات ہے، جب کہ یہ شعر کہا گیا۔ یہ شعر عشق کی اُس منزل پہ کہا گیا، جو عشق کا آغاز نہیں ہے بلکہ انجام ہے۔ اور آغاز اور انجام کے درمیان عاشق اور معشوق کے تعلقات کی ایک لمبی داستان ہے۔ اور ظاہر ہے یہ داستان حُسن اور عشق کی نہیں، پیار اور ایثار کی نہیں، بلکہ عاشق اور معشوق کے درمیان خالص اقتصادی تعلقات کی داستان ہے کہ عاشق صاحب تو عشق کے دوران میں اپنا پیسہ دھیلا بڑی فراخ دلی سے لٹاتے رہے اور معشوق صاحب اُس سے اِس بنا پر محبت جتاتے

رہے کہ عاشق کافی موٹی مرغی ہے۔ جب تک اُس کے پاس مال و دولت ہے، عشق کرتے رہو۔ اور جوں ہی عاشق صاحب پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے ایک کیلا تک نہ خرید سکیں۔ اُس وقت اُسے دھتا بتا دو۔

اور ادھر عاشق صاحب یہی سمجھتے رہے کہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے کہ اصل چیز محبت ہے۔ سچی اور پاک محبت۔ لہٰذا تن، من، دھن لُٹا دینا چاہیئے۔ تاکہ معشوق صاحب کے دل پہ یہ خیال نہ جم جائے کہ یہ بنیا ہے، کنجوس ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ اِس شہر میں معشوق عاشق کو دھتا بتا دیتا ہے، کیوں کہ معشوق جب دیکھتا ہے کہ عاشق صاحب تو شہر میں اب دھکے کھاتے پھرتے ہیں کوئی اُسے نوکری نہیں دیتا' کوئی کھانا نہیں کھلاتا' کوئی بزاز اُسے اُدھار کپڑا بھی نہیں دیتا، تو معشوق سوچتا ہے کہ ایسے بے ننگ و نام آدمی سے عشق کرنا مفت کی رُسوائی ہے۔ یہ معشوق کے خاندانی وقار کی توہین ہے کہ وہ اُس کا عاشق کہلاتا پھرے۔ "میرے پاس کار ہے، اُس کے پاس بس کا کرایہ تک نہیں ہے۔ میرے پاس کوٹھی ہے، اُس کے پاس کرایہ کا کوارٹر تک نہیں ہے، بلکہ دھرم شالہ میں پڑا رہتا ہے۔" چنانچہ ایک دن معشوق صاحب کو کسی اڑوس پڑوس والے نے طعنہ دیا کہ جناب! سُنا ہے آپ غالب نامی آدمی سے عشق فرماتے ہیں۔ تو معشوق نے حقارت سے کہا: "ہُنھ! یہ مونہہ اور مسور کی دال! بھلا ایسا بے ننگ و نام آدمی بھی میرے عشق کا اہل ہو سکتا ہے؟"

چنانچہ معشوق کے منہ سے جوں ہی یہ فقرہ نکلا آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گیا کہ معشوق تو غالب کو بے ننگ و نام کہتا پھرتا ہے اور غالب ہے کہ اپنی ہمہ نا داری و بد حالی ہر جگہ اینڈ اینڈ کر کہتا پھرتا ہے کہ وہ ہم سے اور ہم اُس سے عشق فرماتے ہیں۔ غالب نے یہ افواہ سُنی۔ کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ کیوں کہ غالب ایک آدرش وادی عاشق تھا۔ وہ عشق کو غلہ نہیں سمجھتا تھا کہ جیب میں پیسے ہوئے تو غلہ خرید لیا۔ ورنہ سرد آہ بھر کر چپکے سو رہے۔ نہیں! اُسے عشقِ صادق پر یقین تھا۔ اُسے اقتصادیات زدہ عشق سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اِس لئے اُسے اپنے معشوق پر بھی پختہ اعتماد تھا کہ چاہے ساری دنیا مجھے بے ننگ و نام کہے' میرے عشق کا مذاق اڑائے' لیکن میرا معشوق (ہائے میرا معشوق!) کبھی ایسے الفاظ مُنہ سے نہیں نکال سکتا۔ کیوں کہ معشوق تو میرے ساتھ ہی بھوکوں مرے گا' میرے ساتھ ہی ناپسند گمی کھائے گا، میرے ساتھ ہی دکان کے پٹڑوں پر کروٹیں بدلے گا۔

یہ تھی مثالی معشوق کی تصویر، جو غالب کے ذہن میں تھی۔

ظاہر ہے، غالب نے معشوق کے پاس جا کر اس کی تصدیق کی۔ معشوق نے افسرانہ شان سے کہہ دیا کہ ہاں ہاں، میں نے تمہیں بے ننگ و نام کہا ہے۔ جاؤ، جا کر تھانہ میں رپورٹ کر دو۔ بس اِسی مرحلے پر غالب کے مُنہ سے یہ شعر نکل گیا کہ ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں!

یعنی غالب پہ پہلی بار عشق اور اقتصادیات کی حقیقت کھلی اور اُسے پہلی بار پچھتاوا ہوا کہ کاش! اگر انجامِ عشق یہی ہونا تھا تو کم از کم میں اپنی پراپرٹی تو بچا کر رکھتا اور صرف زبانی جمع خرچ سے ہی کام چلا لیتا۔

دراصل یہ شعر دنیا بھر کے عاشقوں کے لئے ایک "ایڈوائس" ہے کہ حضرات! عشق کرنا ہے تو گانٹھ کے پکے رہو اور میرے تجربے سے سبق حاصل کرو۔

لیکن کیا عاشق حضرات اِس نصیحت پر عمل کریں گے؟ میرا خیال ہے کہ کریں گے، کیوں کہ عاشق کے نصیب میں ازل سے بے وقوفی لکھی ہے اور وہ "اکاؤنٹ بک" سامنے رکھ کر عشق نہیں کر سکتے۔

(ظفر تونسوی)

وہاب حیدر

غالب کے اشعار

کارٹونسٹ کی نظر میں

کارٹون بنانا آسان ہے لیکن شعر کی پسلی سے کارٹون کی تخلیق کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ مسٹر وہاب حیدر نے غالب کے اشعار کو بنیاد بنا کر کچھ کارٹون بنائے ہیں، کارٹون کیا بنائے ہیں غالب کے شعروں پر شوشہ لگایا ہے۔ اُنہوں نے غالب کے اشعار سے نمک دان کا کام لے کر موجودہ انسانی زندگی کے زخموں پر نمک چھڑکا ہے۔ ان کارٹونوں میں سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں غالب کے احترام و وقار کو بھی باقی رکھا گیا ہے۔ ان کارٹونوں میں آپ کو غالب کے دل کی خلش بھی ملے گی اور ان کا درد بھی ــــ!

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

★

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

★

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا ؟

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

★

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں

★

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

★

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

★

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں؟

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں!
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں

میر مہدی مجروح

کو آنسو

مجروح، میر حسین فگار کے بیٹے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ انہیں غالب کی شاگردی پر فخر تھا، اور غالب بھی ان کو اپنا محبوب شاگرد سمجھتے تھے۔ آخر میں رامپور چلے گئے تھے۔ ۱۵، مئی ۱۹۰۲ کو حالت نابینائی میں وفات پائی۔

کیوں نہ ویران ہو دیارِ سخن ۔۔۔ مر گیا آج تاجدارِ سخن
بلبلِ خوش ترانۂ معنی ۔۔۔ گلِ رنگیں و شاخسارِ سخن
نخل بندِ حدیقۂ مضموں ۔۔۔ تازگی بخشِ لالہ زارِ سخن
عرصۂ نظم کیوں نہ ہو ویراں ۔۔۔ ہے عناں کش وہ شہسوارِ سخن
کیوں نہ حرفوں کا ہو لباس سیاہ ۔۔۔ ہے غمِ مرگِ شہریارِ سخن
ساتھ ان کے گئی سخن سنجی ۔۔۔ ان کا مرقد ہی ہے مزارِ سخن
آبیاری تھی جس سے وہ نہ رہا ۔۔۔ اب خزاں ہو گئی بہارِ سخن
نغمہ پیرائیاں کہاں ویسی ۔۔۔ اب یہ ہے نالہ ہائے زارِ سخن

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

شہد گویا بھرا دہاں میں تھا ۔۔۔ کیا مزا آپ کے بیاں میں تھا
وصف اس کا بیاں سے باہر ہے ۔۔۔ لطف جو طبعِ نکتہ داں میں تھا
ہند میں رہ کے رشکِ ایراں ہو ۔۔۔ وصف حضرت کی جو زباں میں تھا

ہم تو خدمت میں آپ کی خوش تھے — چرخ پر فکرِ امتحان میں تھا
سر پہ سایہ یونہی رہے گا سدا — دلِ ناداں اسی دھیان میں تھا
قدر انداز چرخ نے چھوڑا — جاں ستاں تیر جو کمان میں تھا
وہی گلچینِ مرگ نے توڑا — پھول یکتا جو گلستان میں تھا
اُن کی روزِ وفات دہلی میں — یہی مذکور دوستاں میں تھا

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

تھے نظامی سے نظم میں ہمسر — فوق تھا نثر میں ظہوری پر
اُس کا ثانی نہ اُس کا نظیر — ایک سے ایک ہے غرض بہتر
کون تسکین فرمائے خاطر ہو — سخت بے چین ہے دلِ مضطر
یار کرتے ہیں صبر کی تلقین — ظلم ہے جانِ ناشکیبا پر
آپ کے پاؤں تو نہ چلتے تھے — طے یہ راہِ دراز کی کیوں کر
آتشِ غم کی ہے بھڑک ویسی — کام آتے نہ اپنے دیدۂ تر
اب تو دیدار کو دکھا دیجے — میرے نالوں سے ہے بپا محشر
کون سنتا ہے اب کسی کی بات — آج کل تو یہ شور ہے گھر گھر

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

اہلِ دہلی کی تھی بری تقدیر — جو اٹھا یاں سے ایسا با توقیر
ایسے پھر صاحبِ کمال کہاں — ہے یہ فضل و ہنر کا دورِ اخیر
نظم اردو سے ٹپکتی پڑتی ہے — وہ جو ہے طرزِ خاص حضرتِ میر
اور دیوان فارسی اُن کا — فلکِ نظم کا ہے ماہِ منیر
غزلِ فارسی میں ہے جو شعر — ہے نظیری کی فکر کا وہ نظیر
اُن کی دوری میں دیکھ لے مجھ کو — جس نے دیکھی نہ غم کی ہو تصویر
اضطرابِ مدام بد ہے مگر — دل پہ قابو نہ ہو تو کیا تدبیر
باغ فضل و ہنر کو خالی دیکھ — نالہ زن یوں ہے بلبلِ دلگیر

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

اُن کی شفقت جو یاد آتی ہے   چشم دریائے خوں بہاتی ہے
کل نہ تھی جس جگہ کہ بے جاتے   وہی جا اب تو کاٹے کھاتی ہے
یوں تو سنسان ہے مکاں سارا   آہ پر شور و غل مچاتی ہے
بے قراری کا زور مت پوچھو   صبر کی دھجیاں اُڑاتی ہے
کون آتا ہے بہرِ پرسشِ حال   ہاں غشی غم سے آتی جاتی ہے
ان کی دوری میں ہے یہ بدمزگی   کہ نہیں زیست اپنی بھاتی ہے
یہ انہیں کا مزار ہے شاید   یاں سے کچھ بوئے اُلفت آتی ہے
کان دھر کر جدھر سے سنتے ہیں   یہ ندا آکے غم بڑھاتی ہے

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

ایک جاں اور لاکھ کاہشِ غم   ایک دل اور ہزار رنج و الم
ہاں دل ٹوٹا ہو چشم طوفاں ریز   آنسو آنے لگے ہیں کیوں تھم تھم
ہے ہر ایک شہر اور قریہ میں   اس عدیم النظیر کا ماتم
روتے شادی کبھی نہ دیکھیں گے   اپنے حرمانِ جاوداں کی قسم
جس پہ گزرے وہی یہ جانتا ہے   غمِ ہجراں ہے کس غضب کا ستم
کہیں اس درد کا نہیں درماں   کہیں اس زخم کا نہیں مرہم
بد ہے دوری اگرچہ ہو دم بھر   زہر ہے زہر بیش ہو یا کم
مجھ سے پرساں ہے اس مصیبت کا   تجھ کو معلوم کیا نہیں ہمدم

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

جبکہ آنکھوں سے وہ نہاں ہو جائے   کیوں کہ دم سینہ میں سناں ہو جائے
چونک اٹھیں خوابِ مرگ سے حضرت   اس قدر شور اے فغاں ہو جائے
بلبلِ باغ فضل ہے خاموش   چپ نہ کیوں مرغِ صبح خواں ہو جائے
مہرِ معنی ہے خاک میں پنہاں   کیوں نہ تاریک سب جہاں ہو جائے
جوش میں خونِ دل ہے ہاں اے غم   ریزشِ چشم خوں فشاں ہو جائے
لب پہ رہتی ہے آہِ چرخ شکن   کہیں ٹکڑے نہ آسماں ہو جائے
نالہ ہو یا کہ آہ یا گریہ   آج ان سب کا امتحاں ہو جائے

یوں تو چپ بیٹھنا نہیں اچھا ‏ دل پہ درد کچھ بیاں ہو جائے

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد

اسد اللہ خان غالب مرد

کون دیتا ہے یاں کسی کی داد ‏ تم گئے جاؤ نالہ و فریاد
کیا سخن فہموں کی قدر ہو اس کو ‏ آسماں جبکہ خود ہو سفلہ نہاد
اُس کو ہے اپنی کجروی سے کام ‏ کوئی برباد ہو کہ ہو آباد
کوئی اُستادِ فن مرے تو مرے ‏ ہے یہ جور و ستم میں خود اُستاد
انتقالِ جنابِ غالب نے ‏ کر دیا خانۂ ادب برباد
ہائے جنگل میں اُس کی قبر بنی ‏ کاخِ معنی کی جو کہ تھا بنیاد
اس کو خضرِ رہِ سخن سمجھو ‏ ہے جو اُن کی زبان کا ارشاد
پوچھا یہ سانحہ جو یاروں نے ‏ بولا مجروح بادلِ ناشاد

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد

اسد اللہ خان غالب مرد

تھی جو اُن کے مزاج میں تہذیب ‏ وہ جہاں میں نہیں کسی کو نصیب
اُن سے دیکھا کبھی نہ فعلِ عبث ‏ اس سے آگاہ ہیں سب بعید و قریب
صلحِ کل کا رکھا تھا وہ برتاؤ ‏ تھے وہ دشمن کی بھی نظر میں حبیب
تھی نہ اک بات لطف سے خالی ‏ یہ بھی اک بات تھی عجیب و غریب
گفتگو میں عجب فصاحت تھی ‏ ہوتے تھے محو جس کو سن کے ادیب
تھا ہر اک بات کا نیا انداز ‏ ہر سخن کی تھی اک نئی ترکیب
خوش ہی جاتا تھا واں سے ہر غمگیں ‏ تھے مگر آپ خوش دلی کے طبیب
اُن کا تابوت دیکھ باحسرت ‏ یہی کہتا تھا ہر امیر و غریب

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد

اسد اللہ خان غالب مرد

اُن سا پیدا کہاں ہو گر سو بار ‏ کھائے چکر یہ چرخِ کج رفتار
تھی یہ مضموں کی دُرر ریزی ‏ سلکِ گوہر تھی کلکِ جادو کار
اُن کی رنگینیٔ عبارت سے ‏ صفحہ کاغذ کا ہے یہ از گلزار
اُس کلامِ بلیغ کو دیکھو ‏ لفظ اندک میں معنیٔ بسیار

علم طبع سلیم میں وہ تھا — چیونٹی کو نہ جس سے تھا آزار
غسل دیتے ہیں آؤ مشتاقو — دیکھو حضرت کا آخری دیدار
گرد تابوت تھا ہجوم کثیر — اہلِ ماتم میں تھی یہی گفتار
جو کہ جاتے تھے ہمرہِ تابوت — یہی کہتے تھے وہ پکار پکار

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

قطعہ تاریخ انتقال مرزا غالب

کل حسرت و افسوس میں با دلِ محزوں — تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح — ہاتف نے کہا گنجِ معانی ہے تہِ خاک

۱۲۸۵ھ

غالب کے خطوط

مرزا قربان علی بیگ خاں صاحب سالک کے نام

میری جان!

کن اوہام میں گرفتار ہے؟ جہاں باپ کو بیٹھ چکا، اب چچا کو بھی بیٹھ۔ تجھ کو خدا جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورت وقوع دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی ہوگیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں۔ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے "جنت آرامگاہ" و "عرش نشیمن" خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا، "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادر" ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔" اجی حضرت نواب صاحب۔ نواب صاحب کیسے! اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو" بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لے جاتا تھا، یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔

میر سرفراز حسین کے نام

سنو میاں سرفراز حسین! ہزار برس میں تم نے مجھ کو ایک خط لکھا، وہ بھی اس طرح کہ جیسا جلال اسیر کہتا ہے ؎

بغیر در شکر آب است رو بما دارد

پڑھتا ہوں اس خط کو اور ڈھونڈتا ہوں کہ میرے واسطے کون

مرزا ہرگوپال تفتہ

سی بات ہے۔ مجھ کو کیا پیام ہے۔ کچھ نہیں، شاید دوسرے سو میں کچھ ہو۔ ادھر خاتمہ بالخیر ہے۔ یارب سرنامہ میرے نام کا، آغاز تحریر میں القاب میرا، پھر سارے خط میں میرن صاحب کا جھگڑا۔ یہ کیا سیر ہے؟ میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں؟ میری بلا لکھے۔ اب جو تم خط لکھو گے اور اس میں اپنے بھائی کی خیر و عافیت رقم نہ کرو گے اور میرن صاحب کا نام اور ان کے لئے سلام تک بھی اس میں نہ ہوگا تو میں اس کا جواب آنکھوں سے لکھوں گا اور ہاں میاں پھر تم نے میر اشرف علی کو کیا لکھا کہ ہم نے سُنا ہے کہ چچا نے اس کا مرنا سُنا ہوگا۔ اس غریب کا قول یہ ہے کہ میری دو دونوں بہنیں اور پانچ بھانجیاں پانی پت میں ہیں۔ کیا چچا کو نہ معلوم ہوگا کہ کون سی لڑکی مری؟ کاش اس کے باپ کا نام لکھتے تاکہ میں جانتا کہ کون سی بھانجی مری ہے؟ اب کس کا نام لے کر روؤں اور کس کی فاتحہ دلواؤں؟ اس امر میں حق بجانب اس مظلوم کے ہے۔ توضیح بقید نام لکھو۔

منشی ہرگوپال تفتہ کے نام

بھائی!

ریمیا و سیمیا خرافات ہے۔ اگر ان کی کچھ اصل ہوتی تو ارسطو اور افلاطون اور بوعلی یہ بھی کچھ اس باب میں لکھتے۔ کیمیا اور سیمیا دو علم شریف ہیں۔ جو اشیاء کی تاثیر سے تعلق رکھے وہ کیمیا اور جو اسماء سے متعلق ہو وہ سیمیا۔

جاں غم سیمیا نخورد مجھے
دل سوئے کیمیا نیاوردم

شعر بامعنی ہوگیا۔ یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق نہیں پیدا ہوتے تھے؟ زمان و زمانہ کو میں پاگل ہوں جو غلط کہوں گا؟ ہزار جگہ میں نے نظم و نثر میں زمان و زمانہ لکھا ہوگا۔

مرزا تفتہ

حضرت اس قصیدہ کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ کیا کیا شعر نکلے ہیں لیکن افسوس کہ بے محل اور بے جا ہے۔ اس مدح اور اس ممدوح کا بعینہٖ وہ حال ہے کہ ایک مزبلہ پر سیب کا یا بہی کا درخت اُگ جائے

خدا تم کو سلامت رکھے، دوکان بے رونق کے خریدار ہو۔

مرزا تفتہ

لاحول ولا قوۃ! کس ملعون نے بسبب ذوقِ شعر اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔ اگر میں شعر سے بیزار ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بطریق قہرِ درویش بجان درویش لکھا تھا۔ جیسے اچھی جورو برے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔

میر احمد حسین میکش کے نام

بھائی میکش!

آفریں، ہزار آفریں۔ تاریخ نے مزا دیا۔ خدا جانے وہ خرمے کس مزے کے ہوں گے جن کی تاریخ ایسی ہے۔ دیکھو صاحب ع

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

تاریخ دیکھی، اس کی تعریف کے خرمے کھائیں گے۔ کہیں یہ تمہارے خیال میں نہ آوے کہ یہ حسن طلب ہے کہ ناحق تم دین محمد غریب کو دوبارہ تکلیف دو۔ ابھی رقعہ لے کر آیا ہے۔ ابھی خرمے لے کر آوے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اگر بفرضِ محال تم یوں ہی عمل میں لاؤ گے اور میاں دین محمد صاحب کے ہاتھ خرمے بھیجواؤ گے تو ہم بھی کہیں گے تازہ شے بہتر، بارہ سے بہتر۔ ۱۸۵۶ء

علاء الدین احمد خاں علائی کے نام

میری جان!

سن، پنجشنبہ جمعہ، پنجشنبہ آٹھ، جمعہ نو، ہفتہ دس اتوار گیارہ بہ یک مژدہ برہم زدن میسر نہیں تھا۔ اس وقت بھی شدت سے برس رہا ہے۔ انگیٹھی میں کوئلے دہکا کر پاس رکھ لئے ہیں، دو سطریں لکھیں اور کاغذ کو آگ سے سینک لیا۔ کیا کروں؟

—— میر احمد حسین میکش

تمہارے خط کا جواب ضرور، لو سنتے جاؤ۔ مرزا شمشاد علی بیگ کو تمہارا خط پڑھوا دیا۔ انہوں نے کہا کہ غلام حسن خاں کی معیت پر کیا موقوف ہے مجھے آج سواری مل جائے، کل چل نکلوں۔ اب میں کہتا ہوں کہ اونٹ ٹٹو کا موسم نہیں، گاڑی کی تدبیر ہو جائے، بس!

پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ ہے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ ہے ؎

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کرکے غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلّو کے۔

بھائی صاحب کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ اِدھر متھرا داس سے قرض لیا اُدھر درباری مل کو مارا، اِدھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود، شہد لگاؤ، چاٹو، نہ مُول نہ سُود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ پھوپھی کے سر۔ بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں نے آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے، قرض دینے والا ایک میرا مختار کار۔ وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے، مُول میں قسط اس کو دینی پڑے، انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، مُول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ، تنگ آگیا، گزارا مشکل ہوگیا، روز مرّہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہرِ درویش بجانِ درویش، صبح کو تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کو شراب و گلاب موقوف، بیس بائیس روپیہ مہینہ بچا روز مرّہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینہ پورا نہیں گزرا تھا کہ رام پور سے وجہ مقرری اور روپیہ آگیا۔ قرض مقسط ادا ہوگیا۔ متفرق رہا، خیر رہو، صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہوگئی، گوشت پورا آنے لگا۔

چونکہ بھائی صاحب نے وجہ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی۔ ان کو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا ؏

اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدامِ ما

دیکھا، ہم کو یوں پلاتے ہیں، دریبہ کے بنیوں اور لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائلِ حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدتِ وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحدِ خالص اور مومنِ کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ اللعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلعِ امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسنؑ ثم حسینؑ اسی طرح تا مہدی علیہ السلام

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ دوزخ کا ایندھن بنا ہوگا اور میں دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تاکہ مشرکین اور منکرینِ نبوتِ مصطفویؐ و امامتِ مرتضویؑ اس میں جلیں۔ سنو مولوی صاحب! اگر ہٹ دھرمی نہ کروگے اور کتمانِ حق کو گناہ جانوگے تو البتہ تم کو یاد ہوگا اور کہوگے کہ ہاں یاد ہے جن روزوں میں تم علاء الدین خاں کو گلستاں بوستاں پڑھاتے ہو اور تم نے ایک دن غریب

کو دو تین طمانچے مارے ہیں، نواب امین الدین خاں ان دنوں میں لوہارو ہیں، علاء الدین خاں کی والدہ نے تم کو ڈیوڑھی پر سے اٹھا دیا۔ تم با چشمِ پُر آب میرے پاس آئے میں نے تم سے کہا کہ بھائی شریف زادوں کو اور سردار زادوں کو چشم نمائی سے پڑھاتے ہیں، مارتے نہیں، تم نے بے جا کیا، آئندہ یہ حرکت نہ کرنا۔ تم نادم ہوئے۔ اب وہ مکتب نشین طفل سے گزر کر پیرِ ہفتاد سالہ کے واعظ بنے۔ تم نے کئی فاقوں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا ہے:

چوں پیر شدی حافظ ..... الخ اور پھر پڑھتے ہو اس کے سامنے کہ اس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند سہ چند ہے۔ مجموعۂ نثر جُدا گانہ اور یہ لحاظ بھی نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اس کے مخالف ہیں ؎

صوفی بیا کہ آئینہ صاف است جام را
تا بنگری صفائے مئے لعل فام را

شرابِ ناب خورد و روئے مہ جبیناں بیں
خلافِ مذہب آناں جمالِ ایناں بیں

ترسم کہ صرفہ نبرد روزِ باز خواست
نانِ حلال شیخ ز آبِ حرام ما

ساقی بنگر وظیفۂ حافظ زیادہ دار
کآشفتہ گشت طرۂ دستارِ مولوی

میاں! میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں، پاخانہ ڈھ گیا، چھتیں ٹپک رہی ہیں، تمہاری پھوپھی کہتی ہیں: ہائے دبی، ہائے مری ــــ دیوان خانہ کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدانِ راحت سے گھبراتا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں میں بیٹھا کس طرح رہوں؟ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیریں جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی، مرمت ہو جائے گی، پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں ایک مرمت کا احسان میرے پایانِ عمر میں اور بھی سہی۔

غالب

صبح یکشنبہ، ۲۸ جولائی ۱۸۶۲ء

(نوٹ) اس خط کے مضمون سے ظاہر ہے کہ حمزہ خان نے نواب علاء الدین خاں کے خط میں مرزا غالب کو لکھوایا ہو گا کہ اب بوڑھے ہو گئے ہو شراب چھوڑ دو۔ ساتھ حافظ کا یہ شعر درج کر دیا ہو گا ؎

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شد
رندی و ہوسناکی در عہدِ شباب اولیٰ

غالب نے جواب میں اسی پر طنز کی ہے۔

میر مہدی مجروح نے پانی پت سے مرزا غالب سے دلی کی وبا کے بارے میں کچھ احوال دریافت کیا ــــ مرزا صاحب نے جواب دیا: "ــــ وبا کہاں تھی جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ۔ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد اور ایک چونسٹھ برس کی عورت ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی۔ تف بریں وبا ــــ"

خراجِ عقیدت

جگر مرادآبادی

لاریب کہ اِس رمز سے واقف تھی تری ذات | افسانہ ہمہ رنگ، و حقیقت ہمہ بے رنگ
اے وہ کہ تری ذاتِ گرامی، بہ ہمہ رنگ | قدرت کی جو ہم راز، تو فطرت کی ہم آہنگ
اے وہ کہ تری فکر، بہ ہر طرز، و بہ ہر صنف | ہم شعلہ، و ہم شبنم، و ہم شیشہ، و ہم سنگ
اے وہ کہ ہر اک نغمہ ترا، نغمۂ فطرت | اے وہ کہ ہر اک نقش ترا، روکشِ ارژنگ
اے وہ کہ ترے معجزۂ جنبشِ لب سے | اک جنّتِ شاداب ہر ایک غنچۂ دل تنگ
ہر پھول ترے باغ کا، فردوس بہ دامن | ہر خار ترے دشت کا، انگشتِ شفق رنگ
اقلیمِ سخن ہے، ترے اعجازِ نفس سے | ہم نغمہ، و ہم شیشہ، و ہم نکہت و ہم رنگ
اک گوشۂ دامن میں ترے، دجلہ و جیحوں | اک موجِ نفس میں تری رقصاں جمن و گنگ
تھے مُلکِ سخن میں ترے ہم عصر ہزاروں | تنہا تھی تری ذات، مگر صاحب اورنگ
تو نظم میں بھی، نثر میں بھی مجتہد العصر | لیکن، وہ ہے معذور کہ جس کی ہے نظر تنگ
تو نے، اسے گنجائشِ کونین عطا کی | ہر چند، بہت تھا، کبھی دامانِ غزل تنگ
عرفی، و نظیری، و ظہوری، و فغانی | تیرا کوئی ہم سر، نہ تیرا کوئی ہم آہنگ
لاریب، کہ اس رمز سے، واقف تھی تری ذات | افسانہ ہمہ رنگ، و حقیقت ہمہ بے رنگ

الحق، کہ تری وسعتِ تخییل کے آگے
صحرا، کفِ خاکستر، و گلشن، قفسِ رنگ

دیوانِ غالب

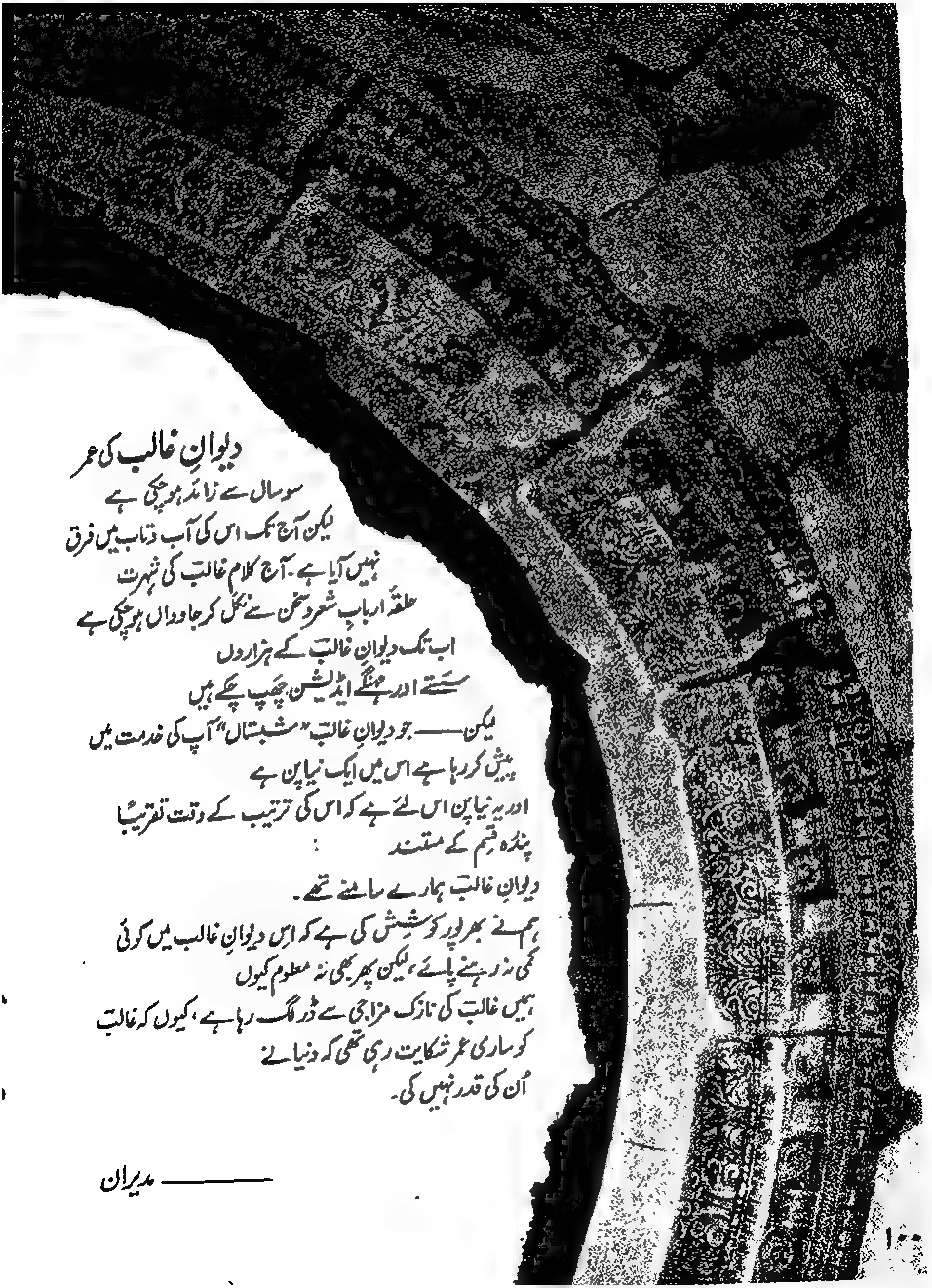

دیوانِ غالب کی عمر

سو سال سے زائد ہو چکی ہے
لیکن آج تک اس کی آب و تاب میں فرق
نہیں آیا ہے۔ آج کلامِ غالب کی شہرت
حلقۂ اربابِ شعر و سخن سے نکل کر جاوداں ہو چکی ہے
اب تک دیوانِ غالب کے ہزاروں
سستے اور مہنگے ایڈیشن چھپ چکے ہیں
لیکن —— جو دیوانِ غالب "شبستاں" آپ کی خدمت میں
پیش کر رہا ہے اس میں ایک نیا پن ہے
اور یہ نیا پن اس لئے ہے کہ اس کی ترتیب کے وقت تقریباً
پندرہ قسم کے مستند
دیوانِ غالب ہمارے سامنے تھے۔
ہم نے بھرپور کوشش کی ہے کہ اس دیوانِ غالب میں کوئی
کمی نہ رہنے پائے، لیکن پھر بھی نہ معلوم کیوں
ہمیں غالب کی نازک مزاجی سے ڈر لگ رہا ہے، کیوں کہ غالب
کو ساری عمر شکایت رہی تھی کہ دنیا نے
اُن کی قدر نہیں کی۔

—— مدیران

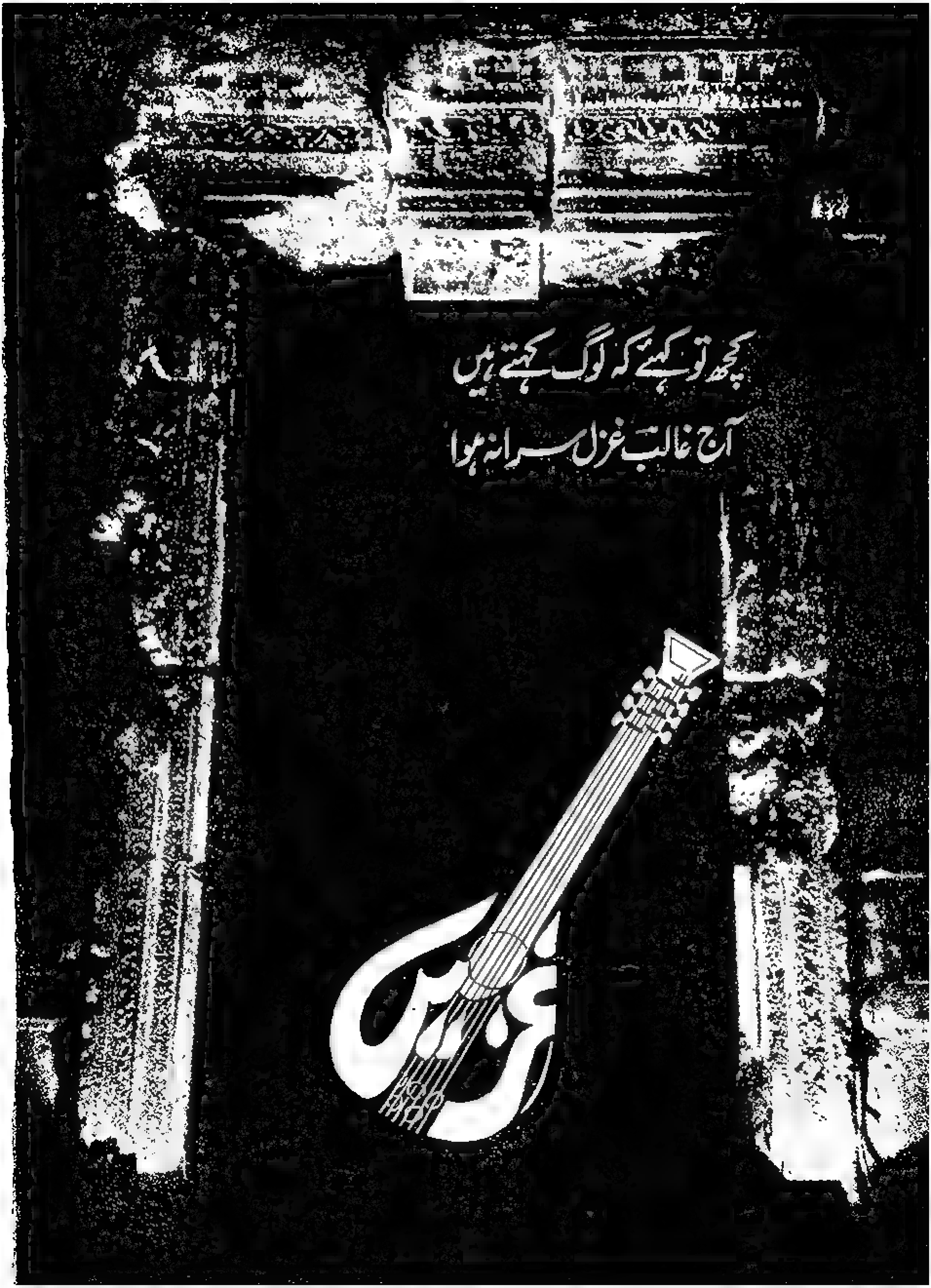
کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

★

نقش فریادی ہے، کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن، ہر پیکرِ تصویر کا
کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے، دم شمشیر کا
آگہی، دامِ شنیدن، جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
بس کہ ہوں غالب! اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ، ہے حلقہ مری زنجیر کا

★

دل مرا، سوزِ نہاں سے، بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک، باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی، کہ جو تھا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں، ورنہ غافل! بارہا
میری آہِ آتشیں سے، بالِ عنقا جل گیا
عرض کیجے، جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں؟
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا، کہ صحرا جل گیا
دل نہیں، تجھ کو دکھاتا ورنہ، داغوں کی بہار
اس چراغاں کا، کروں کیا، کارفرما جل گیا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب! کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

★

جُز قیس اور کوئی نہ آیا، بروئے کار ۔۔۔ صحرا، مگر، بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست ۔۔۔ ظاہر ہوا، کہ داغ کا سرمایہ دُود تھا

تھا خواب میں، خیال کو تجھ سے معاملہ ۔۔۔ جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز ۔۔۔ لیکن یہی کہ "رفت" گیا اور "بُود" تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی ۔۔۔ میں، ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجُود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسُوم و قیود تھا

★

کہتے ہو "نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا"
دِل کہاں، کہ گم کیجے؟ ہم نے مدّعا پایا
عِشق سے، طبیعت نے، زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا
دوست دارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم!
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا
سادگی و پُرکاری، بے خودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں، جرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا
حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر، یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا

★

دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ، طلب گارِ مرد تھا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دل تا جگر، کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی!
دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال، بیاباں نورد تھا

یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا

★

شوق ہر رنگ، رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی، یا رب!
تیر بھی سینۂ بسمل سے پَر افشاں نکلا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ، تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا، بقدرِ لب و دنداں نکلا

ہے نو آموزِ فنا، ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے، کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں، پھر گریے نے ایک شور اٹھایا غالب!
آہ! جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

★

شمارِ سبحہ، مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردنِ صد دل، پسند آیا

بہ فیضِ بے دلی، نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

★

دہر میں ، نقشِ وفا ، وجہِ تسلّی نہ ہوا　　ہے یہ وہ لفظ ، کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ، ترا کاکلِ سرکش نہ دبا　　یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں　　وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دِل گذرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی　　گر نفَس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی　　گوش منت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے　　ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسٰی نہ ہوا

★

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے ، پردا ہے ساز کا
رنگِ شکستہ ، صبحِ بہارِ نظارہ ہے　　یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا
تُو اور سُوئے غیر نظر ہائے تیز تیز　　میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا ، وگرنہ میں　　طعمہ ہوں ، ایک ہی نفَسِ جاں گداز کا
ہیں ، بسکہ جوشِ بادہ سے ، شیشے اُچھل رہے　　ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا
کاوش کا دِل کرے ہے تقاضا ، کہ ہے ہنوز　　ناخن پہ قرض ، اِس گرہِ نیم باز کا

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا ، اسدؔ
سینہ ، کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

★

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا
بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر یک قطرۂ خوں، دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا
نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع، میرے نالوں کا
لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل، اک تخم ہے سروِ چراغاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوہ نے
کرے، جو پرتوِ خورشید، عالم شبنمستاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا، ہے خونِ گرم دہقاں کا
اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مدار، اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
خموشی میں نہاں، خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں، میں بے زباں، گورِ غریباں کا
ہنوز، اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا، حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا
بغل میں غیر کی، آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ
سبب کیا، خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا
نہیں معلوم، کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا!
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب! یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

شب ہوئی، پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے، کہ گویا بت کدہ کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں، گو نہ پاؤں اُس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے، کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیالِ حُسن میں، حُسنِ عمل کا سا خیال
خُلد کا اِک در ہے، میری گور کے اندر کھلا

مونہہ نہ کھُلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر، نقاب اُس شوخ کے مونہہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نزول!
آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

کیا رہوں غربت میں خوش؟ جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اُس کی اُمت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند؟
واسطے جس شہ کے غالبؔ! گنبدِ بے در کھلا

شب، خمارِ شوقِ ساقی، رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے، درسِ دفترِ امکاں کھُلا
جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا، شیرازہ تھا

مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے؟
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن
دست مرہونِ حنا، رُخسار رہنِ غازہ تھا

نالۂ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ، اِک دیوانِ بے شیرازہ تھا

نالۂ دل میں شب، اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر، گو بے تاب تھا

مقدم سیلاب سے، دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق، مگر، سازِ صدائے آب تھا

نازشِ ایّامِ خاکستر نشینی کیا کہوں!
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

کچھ نہ کی، اپنے جنونِ نارسا نے، ورنہ یاں
ذرّہ ذرّہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

آج کیوں پروا نہیں، اپنے اسیروں کی تجھے؟
کل تلک، تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن، کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں، اِک دیدۂ بے خواب تھا

میں نے روکا رات غالبؔ کو، وگرنہ دیکھتے
اُس کے سیلِ گریہ میں، گردوں کفِ سیلاب تھا

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر، ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ، تمثال دار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرّہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر اب
دیکھا، تو کم ہوئے پہ، غمِ روزگار تھا

★

شب، کہ برقِ سوزِ دل سے، زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوّالہ، ہر یک حلقۂ گرداب تھا
واں کرم کو، عذرِ بارش، عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں، پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا
واں، خود آرائی کو، تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں، تارِ نگہ نایاب تھا
جلوۂ گل نے کیا تھا، واں چراغاں آبِ جو
یاں، رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
یاں، سرِ پُر شور بے خوابی سے تھا دیوارِ جو
واں، وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا
یاں، نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بے خودی
جلوۂ گل، واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرش سے تا عرش، واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا
ناگہاں، اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل، کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

★

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا
ترے وعدہ پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا، کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا، وہ لہو، کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، وہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے؟ شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا؟
ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی، تو کہیں دوچار ہوتا
یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی — در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
واے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو — آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے — جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا، مت پوچھ — عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط — تُو ہو اور آپ بہ صد رنگِ گلستاں ہونا
عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنا کھانا — لذتِ ریشِ جگر، غرقِ نمک داں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ — ہائے! اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف! اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ!
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

دوست غم خواری میں میری سعی فرماویں گے کیا؟
زخم کے بھرتے تلک، ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا؟
بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرماویں گے "کیا؟"
حضرتِ ناصح گر آویں، دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو، کہ سمجھاویں گے کیا؟
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا
گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا! یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟
خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبرائیں گے کیا!
ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفت اسدؔ!
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں، کھاویں گے کیا؟

★

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا؟
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا؟
کہاں تک، اے سراپا ناز، "کیا، کیا؟"

نوازش ہائے بے جا، دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا؟

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا؟

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا؟

نفس، موجِ محیطِ بے خودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا؟

دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا؟

دلِ ہر قطرہ، ہے سازِ انا البحر
ہم اُس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا؟

محابا کیا ہے، میں ضامن، اِدھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا؟

سُن، اے غارت گرِ جنسِ وفا! سُن،
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا؟

کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ؟
شکیبِ خاطرِ عاشق، بھلا کیا؟

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں؟
یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا؟

بلائے جاں ہے، غالب! اُس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا!

★

درخورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے، کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی، وہ آزادہ و خودبیں ہیں، کہ ہم
اُلٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
رُوبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

کم نہیں، نازشِ ہم نامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار، بُرا کیا ہے، گر اچھا نہ ہوا

سینہ کا داغ، ہے وہ نالہ، کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

کام کا میرے، ہے وہ دُکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے، ہے وہ فتنہ، کہ برپا نہ ہوا

ہر بُنِ مُو سے، دمِ ذکر، نہ ٹپکے خونناب
حمزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم، کہ غالب کے اُڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

★

پئے نذرِ کرم تحفہ، ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

نہ ہو حسنِ تماشا دوست، رسوا بے وفائی کا
بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

زکاتِ حسن دے، اے جلوۂ بینش! کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو، کاسہ گدائی کا

نہ مارا، جان کر بے جرم، غافل! تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ، حق آشنائی کا

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا، شکوۂ بے دست و پائی کا

وہی اک بات ہے، جو یاں نفس، واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے، مری رنگیں نوائی کا

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو، زنجیرِ رسوائی
عدم تک بے وفا! چرچا ہے تیری بے وفائی کا

نہ دے نامے کو اتنا طول، غالب! مختصر لکھ دے
کہ "حسرت سنج ہوں، عرضِ ستم ہائے جدائی کا"

★

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلّف داغِ مہ، مُہرِ دہاں ہو جائے گا
زہرہ گر ایسا ہی، شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب، سیلِ خانماں ہو جائے گا
لے تو لوں، سوتے میں اس کے پانوں کا بوسہ، مگر
ایسی باتوں سے، وہ کافر بدگماں ہو جائے گا
دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے، کیا معلوم تھا
یعنی، یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا
سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا
گر نگاہِ گرم فرماتی رہی، تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں، جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا
باغ میں مجھ کو نہ لے جا، ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا
وائے! اگر میرا ترا انصاف، محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے، کہ واں ہو جائے گا
فائدہ کیا؟ سوچ، آخر تو بھی دانا ہے، اسدؔ!
دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائے گا

★

جب بہ تقریبِ سفر، یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرّہ پہ اک دل باندھا
اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا
یاس و امید نے، یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمّت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا
نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں غالبؔ!
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

★

میں، اور بزمِ مے سے، یوں تشنہ کام آؤں!
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا
ہے ایک تیر، جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے، کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا
درماندگی میں غالبؔ! کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

★

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی، تو ویراں ہوتا
بحر، گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا
تنگیِ دل کا گلا کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا، تو پریشاں ہوتا
بعدِ یک عمرِ ورع، بار تو دیتا بارے
کاش! رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

★

گلا ہے شوق کو، دل میں بھی تنگیِ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں، کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر، ستم زدہ ہوں، ذوقِ خامہ فرسا کا

حنائے پائے خزاں ہے، بہار اگر ہے یہی
دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

غمِ فراق میں، تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

ہنوز محرمیِ حُسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مُو کام چشمِ بینا کا

دل اس کو، پہلے ہی ناز و ادا سے، دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں، حُسن کے تقاضا کا!

نہ کہہ، کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

فلک کو دیکھ کے، کرتا ہوں اُس کو یاد اسدؔ
جفا میں اُس کی ہے انداز کار فرما کا

★

یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار، باغ کا
یاں جادہ بھی، فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خط ایاغ کا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں، خندہ ہائے گُل
کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیِ قدیم ہوں دُودِ چراغ کا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں، کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار
یہ مے کدہ خراب ہے، مے کے سراغ کا

باغِ شگفتہ تیرا، بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار، خُم کدہ کس کے دماغ کا؟

★

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟
ایک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں؟
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب، کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی، گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یوں ہے، کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما
کام گر رک گیا، روا نہ ہوا

رہزنی ہے، کہ دل ستانی ہے؟
لے کے دل، دل ستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے، کہ لوگ کہتے ہیں
"آج غالب غزل سرا نہ ہوا"

★

نہ تھا کچھ، تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!

ہوا جب غم سے یُوں بے حس، تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت، کہ غالب مر گیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا، کہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟"

★

وہ مری چینِ جبیں سے، غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا
یک الف بیش نہیں، صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں، جب سے کہ گریباں سمجھا
شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل، کہ میں زنداں سمجھا
بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام
رُخ پہ ہر قطرہ عرق، دیدۂ حیراں سمجھا
عجز سے اپنے یہ جانا، کہ وہ بدخو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا
سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا
تھا گریزاں مژۂ یار سے دل، تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا، اس قدر آساں سمجھا
دل دیا جان کے کیوں اُس کو وفادار، اسدؔ!
غلطی کی، کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

★

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گِلا
اُس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلادوں!
کبھی فتراک میں تیرے، کوئی نخچیر بھی تھا؟
قید میں، ہے ترے وحشی کو، وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے، تو کیا!
بات کرتے، کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
یوسف اُس کو کہوں، اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئی!
گر بگڑ بیٹھے، تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
دیکھ کر غیر کو، ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا، ولے طالبِ تاثیر بھی تھا
پیشہ میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں، وہ جواں میر بھی تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا، نہ سہی
آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر، ناحق
آدمی کوئی ہمارا، دمِ تحریر بھی تھا؟
ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب!
کہتے ہیں، اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

★

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل، جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا، یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

عذرِ واماندگی، اے حسرتِ دل!
نالہ کرتا تھا، جگر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی!
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ، مگر، یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا، کہ سر یاد آیا

★

تو دوست کسی کا بھی، ستمگر! نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم، کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح، دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

توفیق باندازۂ ہمت، ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا، قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

میں سادہ دل، آزردگیِ یار سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوقِ مکرر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی، تنک آبی سے، ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی، ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی اسدؔ! داغِ جگر سے مری تحصیل
آتش کدہ، جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

★

رشک کہتا ہے، کہ "اس کا غیر سے اِخلاص، حیف"
عقل کہتی ہے، کہ "وہ بے مہر کس کا آشنا؟"
ذرہ ذرہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں، بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا
شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا
میں، اور اک آفت کا ٹکڑا، وہ دلِ وحشی، کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہیے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا
کوہ کن، نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا، اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

★

غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے، ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا
بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ، کہ رنگ
صیدِ ز دام جستہ ہے، اس دام گاہ کا
رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں، کہ ہے
پُر گُل، خیالِ زخم سے، دامن نگاہ کا
جاں در ہوائے یک نگہِ گرم ہے اسد
پروانہ ہے وکیل، ترے داد خواہ کا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل، اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

بر روئے شش جہت، درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

وا کر دیئے ہیں شوق نے، بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ، اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی، کہ واں
حاصل، سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا، مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب، آخر، تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے، بزمِ غیر میں؟ یارب
آج ہی ہوا منظور، ان کو امتحاں اپنا

منظر اک بلندی پر، اور ہم بنا سکتے
عرش سے اِدھر ہوتا، کاش کہ مکاں اپنا

دے وہ جس قدر ذلّت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا، اُن کا پاسباں اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک؟ جاؤں اُن کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا

گھستے گھستے مٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے، سنگِ آستاں اپنا

تا کرے نہ غمّازی، کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں، ہم نے ہم زباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے! کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہُوا غالب! دشمن آسماں اپنا

★

جور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا کہتے ہیں "ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا"
رات دن، گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا
لاگ ہو، تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی، تو دھوکا کھائیں کیا
ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ یا رب، اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا
موجِ خوں، سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا
عمر بھر دیکھا کیا، مرنے کی راہ مر گئے پر، دیکھیے، دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ، کہ "غالب کون ہے؟"
کوئی بتلاؤ، کہ ہم بتلائیں کیا

★

رہا گر کوئی تا قیامت، سلامت پھر اک روز مرنا ہے، حضرت سلامت
جگر کو مرے عشقِ خوں نابہ مشرب لکھے ہے "خداوندِ نعمت سلامت"
علی الرغمِ دشمن، شہیدِ وفا ہوں مبارک مبارک، سلامت سلامت

نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت، سلامت

★

شب، کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا رشتۂ ہر شمع، خارِ کسوتِ فانوس تھا
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا کس قدر، یا رب! ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا
حاصلِ اُلفت نہ دیکھا، جز شکستِ آرزو دل بہ دل پیوستہ، گویا یک لبِ افسوس تھا

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل، بے منتِ کیموس تھا

پھر ہوا وقت، کہ ہو بال کُشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب
پوچھ مت، وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا، موجِ شراب
جو ہوا غرقۂ مے، بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما، موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم، کہ عجب کیا ہے، اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا، موجِ شراب
چار موج اُٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سُو
موجِ گُل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب
جس قدر رُوح بناتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب
بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے بال کُشا، موجِ شراب
موجۂ گُل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
ہے تصور میں زبس، جلوہ نما موجِ شراب
نشّہ کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ
بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب
ایک عالم پہ ہیں، طوفانیِ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب
شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے، زہے موسمِ گُل!
رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے، خوشا موجِ شراب
ہوش اُڑتے ہیں مرے، جلوۂ گُل دیکھ، اسد
پھر ہوا وقت، کہ ہو بال کُشا موجِ شراب

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دودِ شمعِ کشتہ تھا، شاید خطِ رُخسارِ دوست
اے دلِ ناعاقبت اندیش! ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست؟
خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست
عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر، گرچہ تھا بیمارِ دوست
چشمِ مارو شن! کہ اس بے درد کا دل شاد ہے
دیدۂ پُرخوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست
غیر یوں کرتا ہے میری پُرسش اُس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غم خوارِ دوست
تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے، پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست
جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زُلفِ عنبر بارِ دوست
چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے، اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست
مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیاں کیجیے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست
یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں، غالب! زبس تکرارِ دوست

افسوس، کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی، درخورِ عقدِ گہر، انگشت
کافی ہے نشانی تری، چھلّے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے، بہ وقتِ سفر، انگشت
لکھتا ہوں، اسدؔ! سوزشِ دل سے، سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر، ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در، ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس، کمندِ شکارِ اثر، ہے آج
اے عافیت! کنارہ کر، اے انتظام! چل
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در، ہے آج

عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا، ہے دوا ہو جانا
تجھ سے، قسمت میں مری، صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا، بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا وا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
ضعف سے، گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا، گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ہے مجھے، ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس
کیوں ہے، گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا
بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا، غالبؔ
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

★

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ
کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ
برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ
تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار، اے دل!
کیا ہے کس نے اشارہ، کہ نازِ بستر کھینچ
تری طرف ہے بہ حسرت، نظارۂ نرگس
بکوریِ دل و چشمِ رقیب، ساغر کھینچ
بہ نیم غمزہ ادا کر، حقِ ودیعتِ ناز
نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ
مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
بروئے سفرہ، کبابِ دلِ سمندر کھینچ

★

حسن، غمزے کی کشاکش سے چھٹا، میرے بعد
بارے، آرام سے ہیں اہلِ جفا، میرے بعد
منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا، میرے بعد
شمع بجھتی ہے، تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا، میرے بعد
خون ہے دل خاک میں، احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا، میرے بعد
درخورِ عرض نہیں، جوہرِ بیداد کو، جا
نگہِ ناز ہے سرمہ سے خفا، میرے بعد
ہے جنوں، اہلِ جنوں کے لئے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد
"کون ہوتا ہے حریفِ مےِ مرد افگنِ عشق؟"
ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا، میرے بعد
غم سے مرتا ہوں، کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا، میرے بعد
آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا، غالبؔ!
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد؟

★

بلا سے ہیں، جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں، بال و پر در و دیوار

وفورِ اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار

نہیں ہے سایہ، کہ سُن کر نویدِ مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر، در و دیوار

ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مے جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار، تو آ
کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے؟
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

وہ آ رہا مرے ہم سایہ میں، تو سائے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر، در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہے بِن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم، دیکھ کر در و دیوار

نہ پوچھ بے خودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے، سر بسر در و دیوار

نہ کہہ کسی سے، کہ غالب نہیں زمانہ میں
حریفِ رازِ محبت، مگر در و دیوار

★

گھر جب بنا لیا ترے در پر، کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
"جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر"

کام اس سے آ پڑا ہے، کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے، وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اُس بتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں، کام
چلتا نہیں ہے، دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند، ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے، بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں، تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات، مکرر کہے بغیر

غالب! نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

★

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں، اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرم نالہائے شرر بار دیکھ کر
کیا آبروئے عشق، جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
آتا ہے میرے قتل کو، پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
ثابت ہوا ہے، گردنِ مینا پہ، خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
وا حسرتا! کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر
بک جاتے ہیں ہم آپ، متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن، عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
زنّار باندھ، سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر
ان آبلوں سے پاؤں کے، گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر
کیا بدگماں ہے مجھ سے، کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے، زنگار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
سر پھوڑنا وہ، غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر

★

لرزتا ہے مرا دل، زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم، کہ ہو خارِ بیاباں پر
نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یہاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
فنا تعلیمِ درسِ بے خودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
فراغت کس قدر رہتی مجھے، تشویشِ مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر
نہیں اقلیمِ اُلفت میں، کوئی طومارِ ناز ایسا
کہ پُشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مہر عنواں پر
مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ، یاد آیا
کہ فرقت میں تری، آتش برستی تھی گلستاں پر
بجز پروازِ شوقِ ناز، کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے، خاکِ شہیداں پر
نہ لڑ ناصح سے، غالب! کیا ہوا، گر اس نے شدت کی؟
ہمارا بھی تو، آخر، زور چلتا ہے گریباں پر

★

کیوں کر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز — کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے — ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

★

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا، کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو "قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلکِ پیر! جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
تم کون سے تھے ایسے کھرے، داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

★

جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہو نہ عُریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر
برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بے تابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر
فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض، رہزن پر
ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر
فنا کو سونپ، گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر
اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے
کہ "مشقِ نازکر، خونِ دو عالم میری گردن پر"

★

ہے بسکہ، ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت، تو گزرتا ہے گماں اور
یارب، وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور
ابرو سے ہے کیا، اس نگہِ ناز کو، پیوند؟
ہے تیر مقرّر، مگر اس کی ہے کماں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم؟ جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر، دل و جاں اور
ہر چند سبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور
ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ، ہر چند سر اڑ جائے
جلّاد کو لیکن، وہ کہے جائیں، کہ ہاں اور
لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا، کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور
پاتے نہیں جب راہ، تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری نہ بہر حال یہ مدّت خوش و ناخوش
کرنا تھا، جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے، مرنے کی تمنّا کوئی دن اور

★

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو کہ اس ستم گر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سر بسر انداز

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

★

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود
ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں
کہ دیجیے آئینۂ انتظار کو پرداز

ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں، غالب
جہاں، یہ کاسۂ گردوں، ہے ایک خاک انداز

★

مژدہ، اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی، قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
جگرِ تشنۂ آزار، تسلی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس
مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں، ہے ہے!
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا، جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا، مرے غم خوار کے پاس
دہنِ شیر میں جا بیٹھیے، لیکن اے دل!
نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس
دیکھ کر تجھ کو، چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس
مر گیا پھوڑ کے سر، غالبِ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اُس کا وہ، آ کر تری دیوار کے پاس

★

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر
ہے داغِ عشق، زینتِ جیبِ کفن ہنوز
ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز
مے خانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے بتِ بے دادِ فن ہنوز

★

رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع
ہوئی ہے آتشِ گل، آبِ زندگانیِ شمع
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگِ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع
کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام
بہ طرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع
غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ!
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع
ترے خیال سے رُوح اہتزاز کرتی ہے
بہ جلوہ ریزیِ باد و بہ پر فشانیِ شمع
نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار، نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیِ شمع
جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے، داغِ بدگمانیِ شمع

★

زخم پر چھڑکیں کہاں، طفلانِ بے پروا، نمک
کیا مزا ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار، ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

مجھ کو ارزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد، اور خندۂ گل کا نمک

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا، کہ آج
گردِ ساحل ہے، بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی، واہ، واہ!
یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جا نمک

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم، اور مانگے ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا، پئے توفیرِ درد
زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک

یاد ہیں، غالب! تجھے وہ دن، کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا، تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

★

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن، شمعِ ماتم خانہ ہم

محفلیں برہم کرے ہے، گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بت خانہ ہم

باوجودِ یک جہاں، ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

ضعف سے ہے، نے قناعت سے، یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں، اسدؔ!
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو "اندوہ رُبا" کہتے ہیں

دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالہ کو رسا کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے، اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

پائے افگار پہ، جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

اک شرر دل میں ہے اُس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

دیکھیے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ!
اُس کی ہر بات پہ ہم "نامِ خدا" کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
"مرگیا غالبِ آشفتہ نوا" کہتے ہیں

★

عشق تاثیر سے نومید نہیں — جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے — جامِ مے، خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلی تری سامانِ وجود — ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے — ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے — غمِ محرومیِ جاوید نہیں
کہتے ہیں، جیتے ہیں اُمید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

★

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے، چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں، طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے؟
بات کچھ سر تو نہیں ہے، کہ اُٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو، ستم گر! ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی، کہ کھا بھی نہ سکوں؟

★

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں
دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے — سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
ترے سروِ قامت سے، اک قدِ آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
سُراغِ تفِ نالہ لے، داغِ دل سے — کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس، غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

★

ذکر میرا، بہ بدی بھی، اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے، تو کچھ دُور نہیں
وعدۂ سیرِ گلستاں ہے، خوشا طالعِ شوق!
مژدۂ قتل مقدّر ہے، جو مذکور نہیں
شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے، عالم
لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا، لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں
حسرت! اے ذوقِ خرابی، کہ وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں
میں جو کہتا ہوں، کہ "ہم لیں گے قیامت میں تمہیں"
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں، کہ "ہم حور نہیں"
ظلم کر ظلم! اگر لُطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں
صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں، ہم لوگ
وائے! وہ بادہ، کہ افشردۂ انگور نہیں
ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجّت ہے، کہ مشہور نہیں

★

حیراں ہوں، دل کو روؤں، کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو، تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے، کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں، کہ "جاؤں کدھر کو میں؟"
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش! جانتا نہ تری رہ گزر کو میں
ہے کیا، جو کس کے باندھیے؟ میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں، تمہاری کمر کو میں
لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ بے ننگ و نام ہے"
یہ جانتا اگر، تو لُٹاتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دُور، ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی، راہبر کو میں
خواہش کو، احمقوں نے، پرستش دیا قرار
کیا پُوجتا ہوں اُس بتِ بیداد گر کو میں؟
پھر بے خودی میں بھول گیا، راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس، اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دل پذیر، متاعِ ہنر کو میں
غالب! خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

★

آبرو کیا خاک اُس گُل کی، کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن، جو دامن میں نہیں

ضعف سے اے گریہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اُڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع، اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے، اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم، جس کے روزن میں نہیں

رونقِ ہستی، ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے، گر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے، مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے، کہ لذّت زخمِ سوزن میں نہیں

بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گُل کے سوا، گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ، اِک ہیولیٰ ہے، نئے ناسُور کا
خوں بھی، ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت، قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود؟
قد کے جھکنے کی بھی گنجایش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالب! کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلّف، ہوں وہ مشتِ خس، کہ گلخن میں نہیں

★

ہم سے کھُل جاؤ، بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

غرّۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی، اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا، یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب! پیش دستی ایک دن

★

عہدے سے مدحِ ناز کے، باہر نہ آسکا
گر اک ادا ہو، تو اُسے اپنی قضا کہوں
حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں
میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں
ظالم! مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے، ہے! خدا نکردہ، تجھے بے وفا کہوں

★

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل
بُلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل
آزادیِ نسیم مبارک، کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گُل
جو تھا، سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے! نالۂ لبِ خونیں نوائے گُل
خوش حال اُس حریفِ سیہ مست کا، کہ جو
رکھتا ہو، مثلِ سایۂ گُل، سر بہ پائے گُل
ایجاد کرتی ہے، اُسے تیرے لئے بہار
میرا رقیب ہے، نفسِ عطر سائے گُل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گُل
سطوت سے تیرے جلوۂ حُسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گُل
تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا، کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گُل در قفائے گُل
غالب! مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گُلِ جیبِ قبائے گُل

★

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے — ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا — شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ ایک شخص کے تصور سے — اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا — دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق — واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں — میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ، غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

★

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے، حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ کو گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم — میں بھی ہوں، ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں، فرصتِ ہستی غافل — گرمیِ بزم ہے، ایک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا، اسد! کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

★

ہم پر، جفا سے، ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے، وگرنہ مُراد امتحاں نہیں
کس مُنہ سے شکر کیجئے، اس لطفِ خاص کا
پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
ہم کو ستم عزیز، ستم گر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں
بوسہ نہیں، نہ دیجئے، دُشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم، گر دہاں نہیں
ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے
ہر چند پشتِ گرمیِ تاب و تواں نہیں
جاں مطربِ ترانۂ ہَل مِن مَزید ہے
لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں
خنجر سے چیر سینہ، دل نہ ہو دو نیم
دل میں چُھری چبھو، مژہ گر خونچکاں نہیں
ہے ننگِ سینہ، دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل، نفس اگر آذر فشاں نہیں
نقصاں نہیں جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں
کہتے ہو "کیا لکھا ہے تری سر نوشت میں؟"
گویا جبیں پہ سجدۂ بُت کا نشاں نہیں
پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
رُوح القدس اگرچہ، مرا ہم زباں نہیں
جاں ہے بہائے بوسہ، ولے کیوں کہے، ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے، کہ وہ نیم جاں نہیں

★

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں
حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا، جُز دمِ شمشیر نہیں
رنجِ نومیدیِ جاوید! گوارہ رہیو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں
سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھّا ہو جائے
لذّتِ سنگ بہ اندازۂ تقریر نہیں
جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں
غالبؔ! اپنا یہ عقیدہ ہے، بقولِ ناسخؔ
"آپ بے بہرہ ہے، جو معتقدِ میرؔ نہیں"

ملتی ہے خوئے یار سے نار، اِلتہاب میں
کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر،
آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے، خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب، اُن کی بزم میں، آتا تھا دورِ جام!
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں!
جو منکرِ وفا ہو، فریب اُس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے، دشمن کے باب میں
میں مضطرب ہوں وصل میں، خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے، کس پیچ و تاب میں!
مَیں اور حظِّ وصل، خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا، اضطراب میں
ہے تیوری چڑھی ہوئی، اندر نقاب کے
ہے اِک شکن پڑی ہوئی، طرفِ نقاب میں
لاکھوں لگاؤ، ایک چُرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں
وہ نالہ، دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے!
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر، مدعا طلبی میں نہ کام آئے!
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں
غالب! چُھٹی شراب، پر اب بھی، کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

★

دونو جہان دے کے، وہ سمجھے، یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم، کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے، ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں، تو ناچار کیا کریں؟
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم؟
ہو غم ہی جاں گداز، تو غم خوار کیا کریں

★

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سُوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے، دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے، تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں
اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہُوں پیچ و تاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب، کہ ہیں یوں حجاب میں
آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں
ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں
غالب ندیمِ دوست سے، آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں، بندگیِ بُوتراب میں

★

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور، مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا، خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے، برنگِ پنبہ روزن میں

ودیعت خانۂ بے دادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں تن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو، جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

ہوئے اُس مہر وش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پَر افشاں جوہر آئینے میں، مثلِ ذرہ روزن میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ہزاروں دل دیے، جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

اسدؔ زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

★

دیوانگی سے، دوش پہ زُنّار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے، کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یہاں
طاقت بہ قدرِ لذّتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں، اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار، یک طرف
یاں دل میں، ضعف سے، ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے، خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے، تو ہشیار بھی نہیں

★

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا، کہ یُوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں

پُرسشِ طرزِ دلبری، کیجیے کیا، کہ بِن کہے
اُس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یُوں

رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا، کہ یُوں

”غیر سے رات کیا بنی“ یہ جو کہا، تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا، اور یہ دیکھنا کہ یُوں

بزم میں اُس کے رُوبرو، کیوں نہ خموش بیٹھیے
اُس کی تو خامشی میں بھی، ہے یہی مدّعا کہ یُوں

میں نے کہا کہ ”بزمِ ناز چاہیے غیر سے، تہی“
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا، کہ ”یُوں؟“

مجھ سے کہا جو یار نے ”جاتے ہیں ہوش کس طرح؟“
دیکھ کے میری بے خودی، چلنے لگی ہوا، کہ ”یُوں“

کب مجھے کوئے یار میں، رہنے کی وضع یاد تھی!
آئینہ دار بن گئی، حیرتِ نقشِ پا، کہ ”یُوں“

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال؟
موجِ محیطِ آب میں، مارے ہے دست و پا، کہ ”یُوں“

جو یہ کہے، کہ ”ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی؟“
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا، کہ ”یُوں“

★

کعبہ میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں
بھُولا ہوں حقِّ صحبتِ اہلِ کنشت کو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو، کوئی لے کر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں، رہ و رسمِ ثواب سے؟
ٹیڑھا لگا ہے قط، قلمِ سرنوشت کو

غالب! کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کِشت کو

★

حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ، شاید، کثرتِ نظارہ سے وَا ہو

بہ قدرِ حسرتِ دل، چاہیے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن، گر آبِ ہفت دریا ہو

اگر وہ سرو قد، گرمِ خرامِ ناز آ جاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

★

سب کہاں! کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں، ہم کو بھی، رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعشِ گردوں، دن کو پردے میں نہاں
شب کو اُن کے جی میں کیا آئی، کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوبؑ نے لی، گو، نہ یوسفؑ کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش، کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو، کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا، کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے، یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں، جس کے بازو پر، پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سُن کر مرے نالے، غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں، یارب! دل کے پار؟
جو مری کوتاہیِ قسمت سے، مژگاں ہو گئیں

بس کہ روکا میں نے، اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں، تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں، صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی، کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب، تو اے اہلِ جہاں!
دیکھنا اِن بستیوں کو تم، کہ ویراں ہو گئیں

★

مزے جہاں کے اپنی نظر میں خاک نہیں — سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں
مگر غبار ہوئے پر، ہوا اُڑا لے جائے — وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں
یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے؟ — کہ غیرِ جلوۂ گل رہ گزر میں خاک نہیں
بھلا اُسے نہ سہی، کچھ مجھی کو رحم آتا — اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں
خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش — شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں
ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ — سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ!
کھلا، کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں ★

دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟
دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں؟
جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں؟
دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونو ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
حسن اور اس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں؟
واں وہ غرورِ عز و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بُلائے کیوں؟
ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں؟
غالبِ خستہ کے بغیر، کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا؟ کیجئے، ہائے ہائے کیوں؟

★

نالہ جُز حسنِ طلب ، اے ستم ایجاد! نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکونامیِ فرہاد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش، کہ گھر یاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج، کم از سیلیِ اُستاد نہیں
وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا!
جانتا ہے، کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے؟
گر چراغانِ سرِ رہ گزرِ باد نہیں
سَبَدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ، اے مرغ! کہ گلزار میں صیاد نہیں
نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد "نہیں"
کم نہیں، جلوہ گری میں، ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے، ولے اس قدر آباد نہیں
کرتے کس منہ سے ہو، غربت کی شکایت غالب!
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں؟

★

یہ ہم جو ہجر میں، دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو، کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئے گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے!
کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں، اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں؟
ترے جواہرِ طرفِ کُلہ کو کیا دیکھیں!
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

★

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے، روزِ جزا زیاد نہیں
کوئی کہے، کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے
بلا سے، آج اگر دن کو ابر و باد نہیں
جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو، تو خیر باد نہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں، تو کہتے ہیں
کہ "آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں"
علاوہ عید کے ملتی ہے، اور دن بھی، شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں
جہاں میں ہو غم و شادی بہم، ہمیں کیا کام؟
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل، کہ شاد نہیں
تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب
یہ کیا؟ کہ تم کہو، اور وہ کہیں کہ "یاد نہیں"

★

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں — ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے! — ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر! — برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی، معلوم — اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں
نشّۂ رنگ سے ہے، واشدِ گل — مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ — لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں! — آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پُرکار ہیں خوباں، غالب!
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

★

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ، کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مُدام سے گھبرا نہ جائے دل؟
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں، عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟
لعل و زمرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟
رُتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے؟
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟
غالب! وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دُعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"

★

وارستہ اس سے ہیں، کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار، نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے، کہتے ہیں، ہر درد کی دوا
یوں ہو، تو چارۂ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں، خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود، اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے، انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے، عبرت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اُس فتنہ خُو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ!
اِس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے، نوا سنجانِ گلشن کو!
نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے؟
نہ دی ہوتی، خدایا! آرزوئے دوست دشمن کو
نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو، اُس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خوں چکاں، مژگانِ سوزن کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو، کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو
ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو
ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں، جنبشِ جوہر نے آہن کو
خوشی کیا، کھیت پر میرے، اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں، کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو
وفاداری، بہ شرطِ استواری، اصلِ ایماں ہے
مرے بُت خانہ میں، تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو
شہادت تھی مری قسمت میں، جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو
نہ لٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا!
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو
سخن کیا کہہ نہیں سکتے، کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے، کہ کھودیں جا کے معدن کو
مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں، غالب!
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

★

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو
دل کو میں، اور مجھے دل، محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو
ضعف سے، نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن
تیرے کوچے سے، کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو
جان کر کیجے تغافل، کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو
رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ سحر، تیغِ دو دم ہے ہم کو
سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم"
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ؟ ولیکن ناچار
پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہم کو
تم وہ نازک، کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز، کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

قطعہ

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لے جاتی ہے کہیں ایک توقع، غالبؔ!
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

★

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو، تو کیا گناہ ہو
بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے، تو تم گواہ ہو
کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق نا سپاس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں، خورشید و ماہ ہو
ابھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار
مرتا ہوں میں، کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب میکدہ چھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست
لیکن خدا کرے، وہ ترا جلوہ گاہ ہو
غالب بھی گر نہ ہو، تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو، یارب! اور مرا بادشاہ ہو

★

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں، کہ دید کا احساں اٹھائیے

ہے سنگ پر، براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے

دیوار، بارِ منتِ مزدور سے، ہے خم
اے خانماں خراب! نہ احساں اٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

★

گر خامشی سے فائدہ، اخفائے حال ہے
خوش ہوں، کہ میری بات سمجھنی محال ہے

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ؟
دل فردِ جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز اے خدا!
رحمت، کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

ہے ہے، خدانخواستہ، وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل، یہ تجھے کیا خیال ہے؟

مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے، نہ کہ نافِ غزال ہے

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو، اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

★

سرگشتگی میں، عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید، کہ مرنے کی آس ہے

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

کیجے بیاں سرورِ تبِ غم کہاں تلک
ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

پی، جس قدر ملے، شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف، اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے، تو جنگل اداس ہے

٭

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے، ضد سے، کھینچ کے باہر لگن کے پانو
دی سادگی سے جان، پڑوں کوہ کن کے پانو
ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے، پیرزن کے پانو
بھاگے تھے ہم بہت، سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں، راہ زن کے پانو
مرہم کی جستجو میں، پھرا ہوں جو دُور دُور
تن سے سوا فگار ہیں، اس خستہ تن کے پانو
اللہ رے ذوقِ دشت نوردی، کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بہ خود مرے اندر کفن کے پانو
ہے جوشِ گُل بہار میں یاں تک، کہ ہر طرف
اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں، مرغِ چمن کے پانو
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دُکھتے ہیں آج اُس بتِ نازک بدن کے پانو
غالب! مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

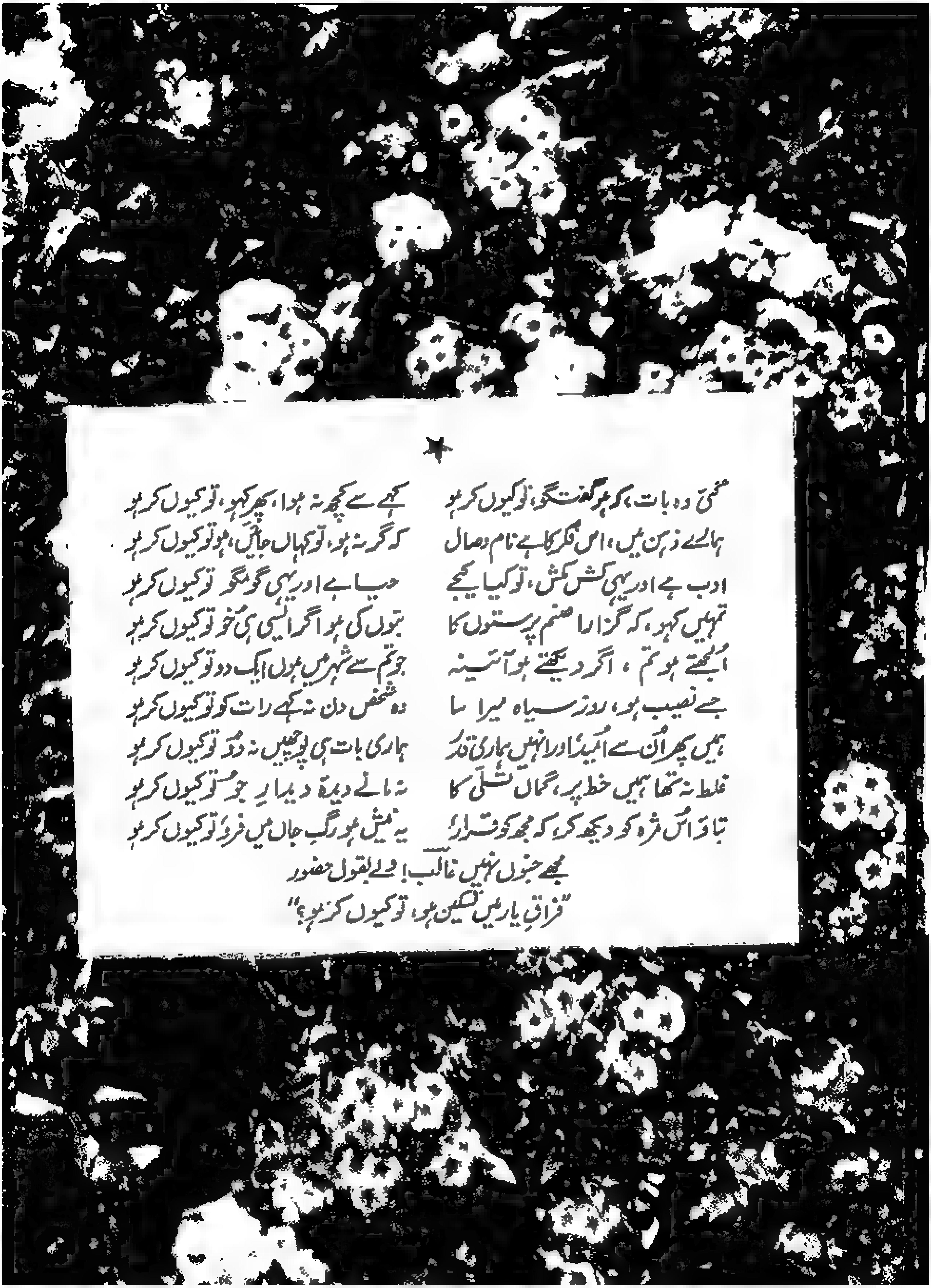

غنی وہ بات، کہ ہو گفتگو، تو کیوں کر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو، تو کیوں کر ہو

ہمارے ذہن میں، اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو، تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش، تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گو مگو تو کیوں کر ہو

تمہیں کہو، کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

الجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

جسے نصیب ہو، روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

ہمیں پھر اُن سے اُمید، اور انہیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو

غلط نہ تھا ہمیں خط پر، گماں تسلی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو، تو کیوں کر ہو

بتاؤ اُس مژہ کو دیکھ کر، کہ مجھ کو قرار!
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو، تو کیوں کر ہو

مجھے جنوں نہیں غالب! ولے بقولِ حضور
"فراقِ یار میں تسکیں ہو، تو کیوں کر ہو؟"

★

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے!
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے!

تیرے دِل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تُو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے!

کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے!

عُمر بھر کا تُو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا؟
عُمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے!

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے!

گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہوگیا؟
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے!

شرمِ رُسوائی سے، جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے!

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اُٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے!

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دِل پہ اِک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے!

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے!

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دِل، تِس پر یہ نااُمیدواری ہائے ہائے!

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ! ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے!

★

کسی کو دے کے دل، کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دِل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟
وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں!
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں، کہ "ہم سے سرگراں کیوں ہو؟"
کیا غم خوار نے رُسوا، لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو؟
وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر، اے سنگ دل! تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟
قفس میں، مجھ کو رُودادِ چمن کہتے، نہ ڈر ہمدم!
گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟
یہ کہہ سکتے ہو؟ "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو، تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جُرم کس کا ہے!
نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو؟
یہ فتنہ، آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟
یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم، تو میرا امتحاں کیوں ہو؟
کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رُسوائی؟"
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ "ہاں کیوں ہو؟"
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو؟ غالبؔ!
ترے بے مہر کہنے سے، وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے — بھوں پاس آنکھ، قبلۂ حاجات چاہیے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر — آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
دے داد، اے فلک! دلِ حسرت پرست کی — ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے
سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری — تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو؟ — اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے
ہے رنگ لالہ و گل و نسریں، جدا جدا — ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
سر پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بے خودی — رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات — عارف ہمیشہ مستِ مےِ ذات چاہیے

نشو و نما ہے اصل سے غالب! فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے، جو بات چاہیے

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی — سو رہتا ہے، بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے — تکلف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے — مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی
نہ کرتا کاش نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا، ہمدم! — کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی
نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ — مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی
مےِ عشرت کی خواہش، ساقیِ گردوں سے کیا کیجے — لیے بیٹھا ہے، اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالب! شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے، جو اس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی

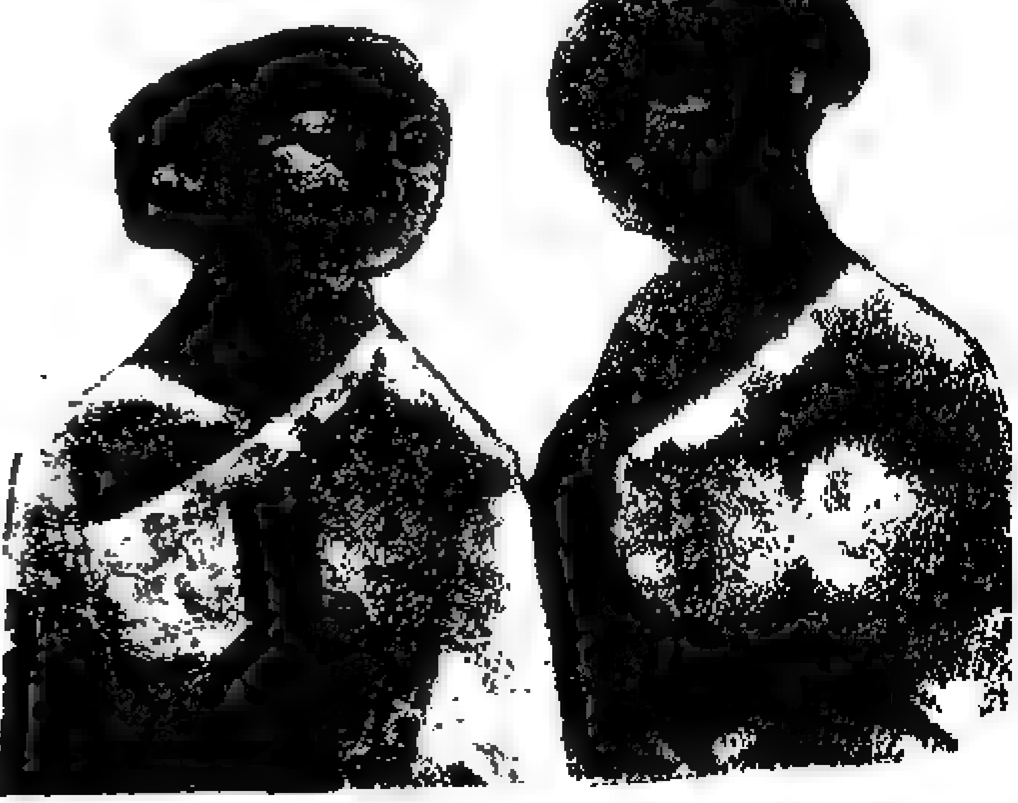

★

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، سو بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے
جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں؟
ہم نہیں جلتے، نفَس ہر چند آتش بار ہے
آگ سے، پانی میں بجھتے وقت، اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے
ہے وہی بدمستیِ ہر ذرّہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے
مجھ سے مت کہہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی"
زندگی سے بھی مرا جی اِن دنوں بے زار ہے
آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے، کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے، کہ اِس کو حسرتِ دیدار ہے

★

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے
خزاں کیا؟ فصلِ گل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے، اور ماتم بال و پر کا ہے
وفائے دلبراں ہے اتفاقی، ورنہ، اے ہمدم
اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے
نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

★

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم، ایسے خوشامد طلبوں سے
ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیِ صہبا
یک بار لگا دو خمِ مے، میرے لبوں سے
رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں، زاہد!
زنہار نہ ہونا طرف، اِن بے ادبوں سے
بے دادِ وفا دیکھ، کہ جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

★

رفتارِ عمر، قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو، برق آفتاب ہے

مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے
بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں، نہ اقامت کی تاب ہے

جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حسن کا
جوشِ بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں؟
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

گزرا اسدؔ! مسرّتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

★

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب، کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا! ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو، دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی، کیا گل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظارہ نے بھی، کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے، کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے، اسد اللہ خاں! تمھیں
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

★

کوئی دن، گر زندگانی اور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں، یہ گرمی، کہاں؟ — سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں، اُن کی رنجشیں — پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دے کے خط، منہ دیکھتا ہے نامہ بر — کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار، ہیں اکثر نجوم — وہ بلائے آسمانی اور ہے
ہو چکیں، غالب! بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

★

کارگاہِ ہستی میں، لالہ داغ ساماں ہے — برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے
غنچہ تا شگفتن ہا، برگِ عافیت معلوم — باوجودِ دلجمعی، خوابِ گل پریشاں ہے
ہم سے رنجِ بے تابی کس طرح اُٹھایا جائے
داغِ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بہ دنداں ہے

★

تسکیں کو ہم نہ روئیں، جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے
اپنی گلی میں، مجھ کو نہ کر دفن، بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے؟
ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے، جس قدر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اے ندیم!
میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں، کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے
لازم نہیں، کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا، کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار! دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

★

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی
میری وحشت، تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے، تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟
اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برقِ خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے، اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے، اسد
گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی

★

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

ڈھونڈھے ہے اُس مغنیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

تانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

رتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

کھلتا کسی پہ کیوں، مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

★

گرم فریاد رکھا، شکلِ نہالی نے مجھے   تب اماں ہجر میں دی، بردِ لیالی نے مجھے
نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم   لے لیا مجھ سے، مری ہمتِ عالی نے مجھے
کثرت آرائیٔ وحدت، ہے پرستاریٔ وہم   کر دیا کافر، اِن اصنامِ خیالی نے مجھے
ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا، بے پر و بالی نے مجھے

★

سادگی پر اس کی، مر جانے کی حسرت، دل میں ہے
بس نہیں چلتا، کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذت، کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا، کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے، ولے بایں ہمہ
ذکر میرا، مجھ سے بہتر ہے، کہ اُس محفل میں ہے
بس، ہجومِ نا اُمیدی، خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
رنجِ رہ کیوں کھینچیے؟ واماندگی کو عشق ہے
اٹھ نہیں سکتا، ہمارا جو قدم منزل میں ہے
جلوہ زارِ آتشِ دوزخ، ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت، کس کی آب و گِل میں ہے؟
ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ، طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر، کہ کس مشکل میں ہے

★

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے — سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے
پیکرِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے — نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

دست گاہِ دیدۂ خوں بارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل، فرشِ پا انداز ہے

★

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی
کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا، یارب!
قسم کھائی ہے اس کافر نے، کاغذ کے جلانے کی
لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت، دل میں سوزِ غم چھپانے کی
انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اٹھے تھے سیرِ گل کو، دیکھنا شوخی بہانے کی
ہماری سادگی تھی، التفاتِ ناز پہ مرنا
ترا آنا نہ تھا، ظالم! مگر تمہید جانے کی
لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی
کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

★

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے، ذرّہ میں جان ہے
حال آنکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشہ پہ مے کا گمان ہے
کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے
کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟
بس چپ رہو، ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے
ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے
ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالب! ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

★

اس بزم میں، مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے
دل ہی تو ہے، سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں، اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے
رکھتا پھروں ہوں، خرقہ و سجادہ رہنِ مے
مدت ہوئی ہے، دعوتِ آب و ہوا کیے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے، کہ "ہم کیا کیا کیے؟"
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں، کہ "اے لئیم!
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے؟"
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو؟
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے؟
صحبت میں غیر کی، نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
ضد کی ہے اور بات، مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے
غالب! تمہیں کہو، کہ ملے گا جواب کیا؟
مانا، کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

★

دیکھنا قسمت، کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
ہاتھ دھو دل سے، یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ، تندیِ صہبا سے، پگھلا جائے ہے
غیر کو، یا رب! وہ کیوں کر منعِ گستاخی کرے،
گر حیا بھی اس کو آتی ہے، تو شرما جائے ہے
شوق کو یہ لت، کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت، کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے
دُور چشمِ بد، تری بزمِ طرب سے، واہ، واہ
نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے
گرچہ ہے طرزِ تغافل، پردہ دارِ رازِ عشق،
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں، کہ وہ پا جائے ہے
اُس کی بزم آرائیاں سُن کر، دلِ رنجور، یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے
ہو کے عاشق، وہ پری رُخ، اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے
نقش کو اس کے، مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر، اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے
سایہ میرا، مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے، اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے، کس سے ٹھہرا جائے ہے

★

کوئی اُمید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات، جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں، کہ یاد کرتے ہیں — میری آواز گر نہیں آتی
داغِ دل، گر نظر نہیں آتا — بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی؟
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے، پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے، غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

★

دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے؟ — آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار — یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش! پوچھو کہ "مدعا کیا ہے؟"
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ — ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟
ہم کو ان سے، وفا کی ہے اُمید — جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے؟
"ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہوگا" — اور درویش کی صدا کیا ہے؟
جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا، دعا کیا ہے؟

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟

★

کہتے تو ہو تم سب کہ "بتِ غالیہ مُو آئے"
یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"
ہوں کشمکشِ نزع میں، ہاں جذبِ محبت!
کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے
ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے
ظاہر ہے، کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں، منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے
جلاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے
ہاں اہلِ طلب! کون سنے طعنۂ نایافت؟
دیکھا، کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے
اپنا نہیں وہ شیوہ، کہ آرام سے بیٹھیں
اُس در پہ نہیں بار، تو کعبہ ہی کو ہو آئے
کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے
اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالب!
ہم بھی گئے واں، اور تری تقدیر کو رو آئے

★

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے — سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز — پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشمِ دلّال، جنسِ رُسوائی — دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہ ہی صد رنگ نالہ فرسائی — وہ ہی صد گونہ اشکباری ہے
دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر — محشرستانِ بے قراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے — روزِ بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے
پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز — گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر — زُلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال — ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب — اشک باری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا — آج پھر اس کی روبکاری ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے، جس کی پردہ داری ہے

★

جز نہ نقدِ داغِ دل کی، کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے، بہ کمینِ بے زبانی
مجھے اس سے کیا توقع، بہ زمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے، نہ سنی مری کہانی
یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب، ورنہ کہتا
کہ "مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی"

★

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو، گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے، لذت زندگانی کی
کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر، موجِ آب کو فرصت روانی کی
پس از مُردن بھی، دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں کی
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گُل فشانی کی
نکوہش ہے سزا، فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی
رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں، ریشگی بخشے
اگر بووے بجائے دانہ دہقاں، نوک نشتر کی
پرِ پروانہ، شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی
کروں بے دادِ ذوقِ پَرفشانی عرض، کیا قدرت!
کہ طاقت اُڑ گئی، اُڑنے سے پہلے، میرے شہپر کی
کہاں تک روؤں اس کے خیمہ کے پیچھے، قیامت ہے!
مری قسمت میں یا رب! کیا نہ تھی دیوار پتھر کی؟

★

بے اعتدالیوں سے، سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے، اتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دامِ سخت، قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے، کہ گرفتار ہم ہوئے
ہستی ہماری، اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے، کہ آپ اپنی قسم ہوئے
سختی کشانِ عشق کی، پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں
تیرے سوا بھی، ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے، جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
اللہ ری تیری تندیِ خو، جس کے بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے
اہلِ ہوس کی فتح ہے، ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اٹھ گئے، وہی اُن کے علم ہوئے
نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے، سو وہ یاں آ کے دم ہوئے
چھوڑی، اسدؔ! نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے، تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

★

ظلمت کدے میں میرے، شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال، نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی، کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مَے نے کیا ہے، حسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق! یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے
دیدار، بادہ، حوصلہ، ساقی، نگاہ مست
بزمِ خیال، مے کدۂ بے خروش ہے

★

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی، بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب، بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے، کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر، تو بزم میں،
نے وہ سرور و شور، نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے، یہ مضامیں خیال میں
غالب! صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

★

پا بہ دامن ہو رہا ہوں، بس کہ میں صحرا نورد
خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے
دیکھنا حالت مرے دل کی، ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہِ آشنا، تیرا سرِ ہر مُو مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر، کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

★

آ، کہ مری جان کو قرار نہیں ہے — طاقتِ بے دادِ انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنت، حیات کے بدلے — نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو — ہائے! کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے
ہم سے، عبث ہے، گمانِ رنجشِ خاطر — خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے
دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی — غیرِ گل، آئینۂ بہار نہیں ہے
قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے — وائے! اگر عہد استوار نہیں ہے
تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے، غالب!
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

★

ہجومِ غم سے یہاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے
رفوئے زخم سے مطلب، ہے لذت زخمِ سوزن کی
سمجھیو مت، کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے
وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب!
چٹکنا غنچۂ گل کا، صدائے خندۂ دل ہے

★

جس بزم میں، تُو ناز سے، گفتار میں آوے
جاں، کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے، جو گلزار میں آوے
تب نازِ گراں مایگیِ اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت، کہ ستمگر!
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے
اس چشمِ فسوں گر کا، اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے، یارب!
اک آبلہ پا وادیِ پُرخار میں آوے
مرجاؤں نہ کیوں رشک سے، جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے
غارتگرِ ناموس نہ ہو، گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل، باغ سے بازار میں آوے
تب چاکِ گریباں کا مزا ہے، دلِ ناداں!
جب اک نفس الجھا ہوا، ہر تار میں آوے
آتش کدہ ہے سینہ مرا، رازِ نہاں سے
اے وائے! اگر معرضِ اظہار میں آوے
گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب! مرے اشعار میں آوے

★

حُسنِ مہ، گرچہ بہ ہنگامِ کمال، اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے
بوسہ دیتے نہیں، اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں، کہ "مفت آئے، تو مال اچھا ہے"
اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے
بے طلب دیں، تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا، جس کو نہ ہو خُوئے سوال، اچھا ہے
اُن کے دیکھے سے، جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں، کہ بیمار کا حال اچھا ہے
دیکھیے، پاتے ہیں عشاق، بتوں سے کیا فیض!
اک برہمن نے کہا ہے، کہ "یہ سال اچھا ہے"
ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو، شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جو مل جائے، تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
خضر سلطان کو رکھے، خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں، یہ تازہ نہال اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے، جنّت کی حقیقت، لیکن
دل کے خوش رکھنے کو، غالب! یہ خیال اچھا ہے

★

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی

خارِ خارِ الم حسرتِ دیدار تو ہے
شوق، گلچینِ گلستانِ تسلّی نہ سہی

مے پرستاں! خُمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی، نہ سہی

نفسِ قیس، کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ، نہ سہی

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنّا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی، غالبؔ! اگر عمرِ طبیعی، نہ سہی

★

عجب نشاط سے، جلاّد کے، چلے ہیں ہم، آگے
کہ اپنے سایہ سے سر، پاؤں سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا، "خرابِ بادۂ الفت"
فقط "خراب" لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ نے جھاڑی، نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذّتِ الم، آگے

خدا کے واسطے، داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم، آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں، ہم نے
تمہارے آئیو، اے طرّہ ہائے خم بہ خم! آگے

دل و جگر میں پر افشاں، جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو، دم آگے

قسم جنازہ پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں، غالبؔ!
ہمیشہ کھاتے تھے جو، میری جان کی قسم، آگے

شکوہ کے نام سے، بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ، کہ جو کہیے، تو گلا ہوتا ہے

پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے، کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں، پر حسنِ تلافی دیکھو!
شکوۂ جور سے، سرگرمِ جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں، ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد، کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا، اور اب
لب تک آتا ہے، جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

خامہ میرا، کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہِ کواکب سپہ مہرِ علم!
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو غالبؔ! مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

★

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تم سے کیا شکوہ، کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا، کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھیے کب دن پھریں حمام کے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

★

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے؟
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ، کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے؟

یہ رشک ہے، کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے؟

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے؟

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے؟

وہ چیز، جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفامِ مشکبو کیا ہے؟

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے؟

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے؟

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

★

میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے، جو مے پیے ہوتے

قہر ہو، یا بلا ہو، جو کچھ ہو
کاشکے! تم مرے لئے ہوتے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

★

گلشن کو تری صحبت، از بس کہ خوش آئی ہے
ہر غنچے کا گل ہونا، آغوش کشائی ہے
واں کنگرِ استغنا، ہر دم ہے بلندی پر
یاں نالہ کو اور الٹا، دعوائے رسائی ہے
از بسکہ سکھاتا ہے غم، ضبط کے اندازے
جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

★

نقشِ نازِ بتِ طنّاز، بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
تو وہ بدخو، کہ تحیّر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ، کہ آشفتہ بیانی مانگے
وہ تپِ عشق تمنّا ہے کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

★

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر، رفو کی
لکھ دیجیو، یارب! اسے قسمت میں عدو کی
اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے، اک بوند لہو کی
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے؟
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی
دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی
صد حیف وہ ناکام، کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی

★

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری — اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ! — دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کرکے مرا، روئیں گے یار! — مگر آشفتہ بیانی میری
ہوں زخود رفتۂ بیدائے خیال — بھول جانا ہے، نشانی میری
متقابل ہے، مقابل میرا — رُک گیا دیکھ روانی میری
قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں — سخت ارزاں ہے، گرانی میری
گرد بادِ رو بے تابی ہوں — صرصرِ شوق ہے بانی میری
دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا — کُھل گئی ہیچ مدانی میری

کر دیا ضعف نے عاجز غالب
ننگِ پیری ہے جوانی میری

★

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو، اے ساکنانِ خطۂ خاک! — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — رُوکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا رُوئے آب پر کائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر — بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہِ دیندار نے شفا پائی

★

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے — یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے
صحبتِ رنداں سے، واجب ہے حذر — جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل — بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
چاک مت کر جیب، بے ایامِ گُل — کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی — مُنہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
دشمنی نے میری کھویا غیر کو — کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے
اپنی رُسوائی میں کیا چلتی ہے سعی — یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — نا امیدی اُس کی دیکھا چاہیے
غافل! ان مہ طلعتوں کے واسطے — چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خوب رُویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

★

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
درسِ عنوانِ تماشا، بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے
وحشتِ آتشِ دل سے، شبِ تنہائی میں
صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے
غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے
اثرِ آبلہ سے، جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
بے خودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو
پُر ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے
شوقِ دیدار میں، گر تُو مجھے گردن مارے
ہو نگہ، مثلِ گلِ شمع، پریشاں مجھ سے
بے کسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت، ہے ہے!
سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے
گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں، مجھ سے
نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے، اسدؔ
ہے چراغاں، خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

★

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بُلاتا تو ہوں اُس کو، مگر اے جذبۂ دل!
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے
کاش! یوں بھی ہو، کہ بِن میرے ستائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے، لیے یوں ترے خط کو، کہ اگر
کوئی پوچھے، کہ "یہ کیا ہے"، تو چھپائے نہ بنے
اس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں، تو کیا
ہاتھ آویں، تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے
کہہ سکے کون، کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے
موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بِن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ، تو بلائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے، کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے، کہ بنائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

★

چاک کی خواہش، اگر وحشت بہ عریانی کرے — صبح کی مانند، زخمِ دل گریبانی کرے
جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال — دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے
ہے شکستن سے بھی دل نومید، یارب کب تلک — آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے
مے کدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست — موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خطِّ عارض سے، لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے

★

وہ آ کے خواب میں، تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے
کرے ہے قتل، لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
دکھا کے جنبشِ لب ہی، تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ، تو منہ سے کہیں جواب تو دے
پلا دے اوک سے ساقی! جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے
اسدؔ! خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے "ذرا میرے پاؤں داب تو دے"

★

تپش سے میری، وقفِ کش مکش، ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے
سرشکِ سر بہ صحرا دادہ، نور العینِ دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ، برخوردارِ بستر ہے
خوشا اقبالِ رنجوری! عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدارِ بستر ہے
بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے
ابھی آتی ہے بُو، بالش سے، اس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو، خوابِ زلیخا، عارِ بستر ہے
کہوں کیا، دل کی کیا حالت ہے، ہجرِ یار میں، غالبؔ
کہ بے تابی سے، ہر یک تارِ بستر خارِ بستر ہے

★

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے — نالہ پابندِ نَے نہیں ہے
کیوں بوتے ہیں باغباں تونبے؟ — گر باغ گدائے مَے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تُو ہے — پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے
ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی — ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے
شادی سے گزر، کہ غم نہ ہووے — اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے
کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد؟ — مَے ہے، یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے، غالبؔ!
آخر تو کیا ہے؟ اے "نہیں ہے"!

★

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے
بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
مرحبا میں، کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے
کیوں نہ ہو بے التفاتی، اُس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے
میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی، مجھے
بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا، کاشکے!
اِس قدر ذوقِ نوائے مُرغِ بُستانی مجھے
وائے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں، ذوقِ تن آسانی مجھے
وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے؟
تم نے کیوں سونپی ہے، میرے گھر کی دربانی، مجھے
ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری، واہ، واہ!
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے
دی مرے بھائی کو حق نے، از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف، ہے غالب! یوسفِ ثانی مجھے

★

کرے ہے بادہ، ترے لب سے، کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے
کبھی تو اِس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے!
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے
بجا ہے، گر نہ سُنے، نالہائے بُلبلِ زار
کہ گوشِ گُل، نمِ شبنم سے، پنبہ آگیں ہے
اسدؔ ہے نزع میں، چل بے وفا، برائے خدا
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

★

یاد ہے شادی میں بھی، ہنگامۂ "یارب" مجھے
سُبحۂ زاہد ہوا ہے، خندہ زیرِ لب مجھے
ہے کشادِ خاطرِ وابستہ دَر، رہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد، خانۂ مکتب مجھے
یارب! اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے؟
رشک، آسایش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے
طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت، کیا کروں!
آرزو سے، ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے
دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہوگئے
عشق سے آتے تھے مانع، میرزا صاحب مجھے

★

دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے، کیا کہیے
ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے
یہ ضد، کہ آج نہ آوے اور آئے بِن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے، کیا کہیے؟
رہے ہے یُوں گہ و بے گہ، کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے، کیا کہیے؟
زہے کرشمہ، کہ یُوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بِن کہے ہی اُنہیں سب خبر ہے، کیا کہیے؟
سمجھ کے کرتے ہیں، بازار میں وہ پُرسشِ حال
کہ یہ کہے، کہ سرِ رہ گزر ہے، کیا کہیے؟
تمہیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا؟ کہیے!
اُنہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے، کیوں لڑیے؟
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے؟
حسد، سزائے کمالِ سخن ہے، کیا کیجے
ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کہیے؟
کہا ہے کس نے، کہ غالبؔ بُرا نہیں، لیکن
سوائے اس کے، کہ آشفتہ سر ہے، کیا کہیے

★

حضورِ شاہ میں، اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں، خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے
قد و گیسو میں، قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
کریں گے کوہ کن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اُس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے
نسیم مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی!
اُسے یوسف کی بُوے پیرہن کی آزمائش ہے
وہ آیا بزم میں، دیکھو، نہ کہیو پھر، کہ "غافل تھے"
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے
رہے دل ہی میں تیر، اچھا، جگر کے پار ہو، بہتر
غرض شستِ بُتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے
نہیں کچھ سُبحہ و زُنّار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
پڑا رہ، اے دلِ وابستہ! بے تابی سے کیا حاصل؟
مگر پھر تابِ زُلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے
رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے
وہ آویں گے مرے گھر؟ وعدہ کیسا! دیکھنا غالبؔ!
نئے فتنوں میں اب چرخِ کُہن کی آزمائش ہے

★

زبسکہ مشقِ تماشا، جنوں علامت ہے
کشاد و بستِ مژہ، سیلیِ ندامت ہے
نہ جانوں، کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی
تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے
بہ پیچ و تابِ ہوس، سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے
وفا مقابل و دعوٰے عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ و فصلِ گُل قیامت ہے

★

لاغر اتنا ہوں، کہ گر تُو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمّہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے
کیا تعجب ہے، کہ اس کو دیکھ کر آ جائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے
منہ نہ دکھلاوے، نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ، ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے
یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بن جاؤں، تو شانہ میں اُلجھا دے مجھے

★

بازیچۂ اطفال ہے دنیا، مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا، مرے آگے
ایک کھیل ہے اورنگِ سلیماں، مرے نزدیک
ایک بات ہے اعجازِ مسیحا، مرے آگے
جز نام، نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم، نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا، مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا، مرے آگے
مت پوچھ، کہ کیا حال ہے میرا، ترے پیچھے
تو دیکھ، کہ کیا رنگ ہے تیرا، مرے آگے
سچ کہتے ہو، خودبین و خودآرا ہوں، نہ کیوں ہوں؟
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما، مرے آگے
پھر دیکھیے، اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی، پیمانۂ صہبا، مرے آگے
نفرت کا گماں گزرے ہے، میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں "لو نام نہ اُن کا مرے آگے"
ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے
عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلا، مرے آگے
خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا، مرے آگے
ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش! یہی ہو
آتا ہے، ابھی دیکھیے، کیا کیا، مرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا، مرے آگے
ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو بُرا کیوں کہو، اچھا، مرے آگے

★

کہوں جو حال، تو کہتے ہو "مدّعا کہیے" تمہیں کہو، کہ جو تم یوں کہو، تو کیا کہیے؟
نہ کہیو طعن سے پھر تم، کہ "ہم ستمگر ہیں" مجھے تو خُو ہے، کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے
وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اُتر جاوے نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے؟
نہیں ذریعۂ راحت، جراحتِ پیکاں وہ زخمِ تیغ ہے، جس کو کہ دل کشا کہیے
جو مدّعی بنے، اُس کے نہ مدّعی بنیے جو ناسزا کہے، اس کو نہ ناسزا کہیے
کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھیے کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے
رہے نہ جان، تو قاتل کو خوں بہا دیجے کٹے زبان، تو خنجر کو مرحبا کہیے
نہیں نگار کو اُلفت، نہ ہو، نگار تو ہے روانیِ روِشِ و مستیِ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا، غالب!
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے؟

★

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں، برائے خندہ ہے
دعوئ جمعیتِ احباب، جائے خندہ ہے
ہے عدم میں، غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گُل
یک جہاں زانو تامّل در قفائے خندہ ہے
کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام
ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے
سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر، ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

★

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال، جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ! — کچھ نہ سمجھے، خدا کرے کوئی
نہ سنو، گر برا کہے کوئی — نہ کہو، گر برا کرے کوئی
روک لو، گر غلط چلے کوئی — بخش دو، گر خطا کرے کوئی
کون ہے؟ جو نہیں ہے حاجت مند — کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے! — اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی، غالبؔ!
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی؟

★

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں، گر آجائے ہے، مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے، مجھ سے

خدایا! جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں، اور کھنچتا جائے ہے، مجھ سے

وہ بدخو، اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے، مجھ سے

اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پُوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے، مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے، اے ناامیدی! کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار، چھوٹا جائے ہے، مجھ سے

تکلّف برطرف، نظارگی میں بھی سہی، لیکن
وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے، مجھ سے

ہوئے ہیں پانْو ہی پہلے، نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے، مجھ سے

قیامت ہے، کہ ہووے مدّعی کا ہم سفر، غالب!
وہ کافر، جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے، مجھ سے

★

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے، کہ بس پاک ہو گئے

صرفِ بہائے مے ہوئے، آلاتِ مے کشی
تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے

رُسوائے دہر گو ہوئے، آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر؟
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اُس سے، تغافل کا ہم گلا
کی ایک ہی نگاہ، کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اُٹھائی کل اُس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غم ناک ہو گئے

★

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرّۂ لیلا کرے کوئی

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات
ہاں! درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

رونے سے، اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ، کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل
تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں، کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں، کہ تیری تمنا کرے کوئی

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز
یہ درد وہ نہیں، کہ نہ پیدا کرے کوئی

بے کاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے، اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

★

باغ پا کر خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل، افعی نظر آتا ہے مجھے

جوہرِ تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم
ہوں میں وہ سبزہ، کہ زہراب اگاتا ہے مجھے

مدّعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک
آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر، کون اُٹھاتا ہے مجھے

★

ہزاروں خواہشیں ایسی، کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے
ڈرے کیوں میرا قاتل؟ کیا رہے گا اُس کی گردن پر
وہ خوں، جو چشمِ تر سے، عمر بھر یوں دم بدم نکلے!
نکلنا خُلد سے آدم کا سُنتے آئے ہیں، لیکن،
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
بھرم کھُل جائے، ظالم! تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرّۂ پُرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط، تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح، اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے
ہوئی اس دَور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ، جو جہاں میں جامِ جم نکلے
ہوئی جن سے توقّع، خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے
محبّت میں نہیں ہے فرق، جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کافر پہ دم نکلے
کہاں مے خانہ کا دروازہ، غالب! اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

★

بجومِ نالہ! حیرت، عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی، ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

تکلف برطرف، ہے جاں ستاں تر، لطفِ بدخویاں
نگاہِ بے حجابِ ناز، تیغِ تیزِ عریاں ہے

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف، کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں، ساغر متاعِ دستِ گرداں ہے

غمِ آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے، عاشق کو
چراغِ روشن اپنا، قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

★

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے
نافہ دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے

کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو؟ اے خدا!
آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے

ہے ذرہ ذرہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق
گر دام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکار ہے

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب
اے عندلیب! وقتِ وداعِ بہار ہے

پچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یہاں انتظار ہے

بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرّے کے نقاب میں دل بیقرار ہے

اے عندلیب! یک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی
اے بے دماغ! آئینہ تمثال دار ہے

غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے

★

مُدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم — برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس — مُدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق — سامانِ صد ہزار نمک داں کئے ہوئے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بہ خونِ دل — سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے

باہم دِگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب — نظّارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

دِل پھر طوافِ کُوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب — عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گُل و لالہ پر خیال — صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا — جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کئے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں، آرزو — سُرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر، نگاہ — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

پھر، جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں — سر زیرِ بارِ منّتِ درباں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

غالب! ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

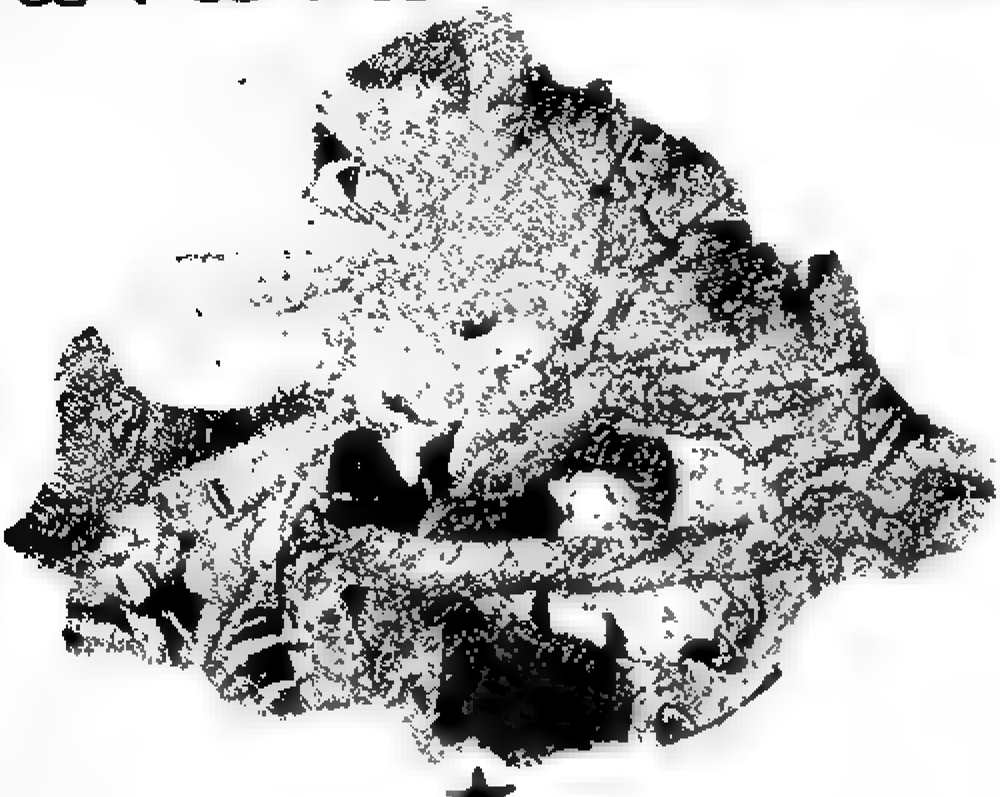

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست' جاں کے لئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لئے

وہ زندہ ہم ہیں، کہ ہیں روشناسِ خلق، اے خضر!
نہ تم، کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے، کہ میں ہی نہیں
درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا، اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

بہ قدرِ شوق نہیں، ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا؟
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ورق تمام ہوا، اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

★

شبنم بہ گلِ لالہ، خالی ز ادا ہے
داغِ دلِ بے درد، نظر گاہِ حیا ہے
دلِ خوں شدہ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بہ دستِ بتِ بدمستِ حنا ہے
شعلے سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے!
تمثال میں تیری، ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ، بہ اندازِ گل، آغوش کشا ہے
قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ، نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟
خُو نے تری افسردہ کیا، وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی، طرفہ بلا ہے
مجبوری و دعوائے گرفتاریِ اُلفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے
معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے
اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب اِدھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
بیگانگیِ خلق سے بے دل نہ ہو غالبؔ!
کوئی نہیں تیرا، تو مری جان! خدا ہے

★

کٹے تو شب کہیں، کاٹے تو سانپ کہلاوے
کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے
لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے؟
نہ حشر و نشر کا قائل، نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے! ایسے کی پھر قسم کیا ہے
وہ داد و دید گراں مایہ شرط ہے ہمدم
وگرنہ مہرِ سلیماں و جامِ جم کیا ہے

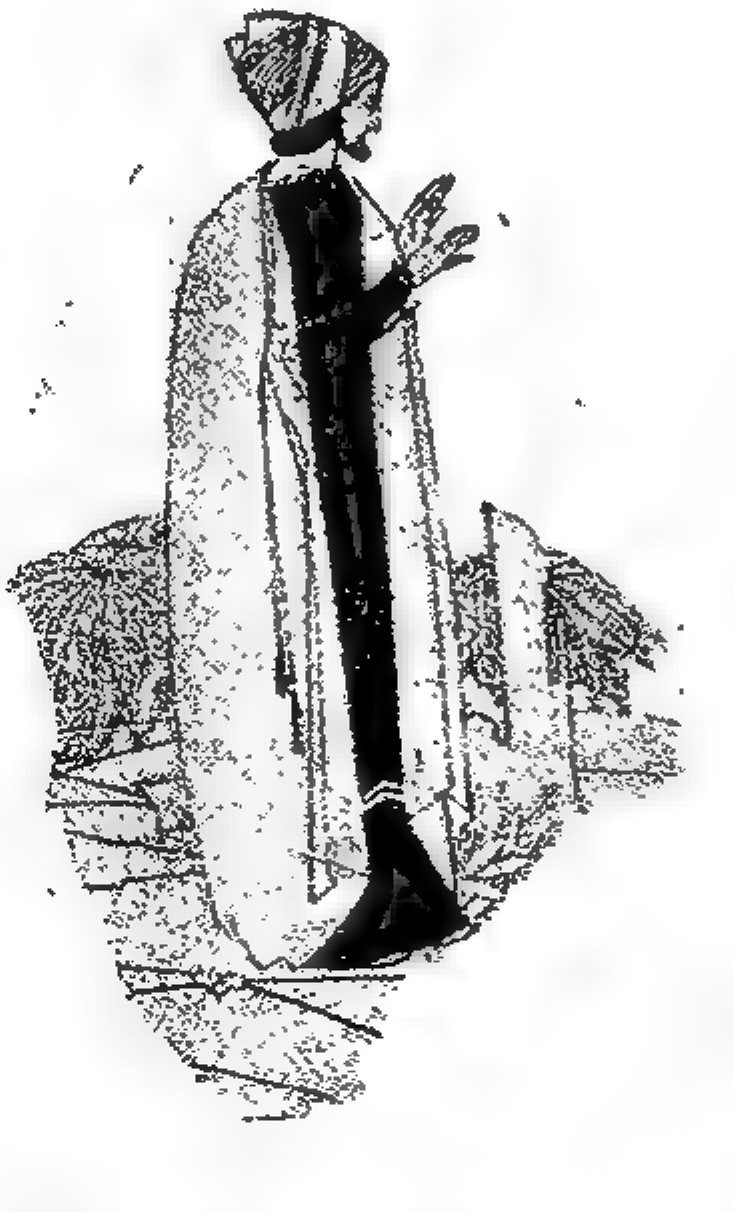

★

منظور تھی یہ شکل، تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی
اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ، تیرے شہیدوں پہ حور کی
واعظ نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی!
لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل، کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی
آمد بہار کی ہے، جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے، زبانی طیور کی
گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
کیا فرض ہے، کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ، ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی
غالب اگر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

★

غم کھانے میں بودا، دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج، کہ کم ہے مےِ گلفام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہہ جام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں ہے
گوشہ میں قفس کے، مجھے آرام بہت ہے
کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے
ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں؟
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے، جامۂ احرام بہت ہے
ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات، کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے، ابرام بہت ہے
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں، کہ ابھی کام بہت ہے
ہو گا کوئی ایسا بھی، کہ غالب کو نہ جانے؟
شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

★

لطفِ نظارۂ قاتل دمِ بسمل آئے
جان جائے، تو بلا سے، پہ کہیں دل آئے

اُن کو کیا علم، کہ کشتی پہ مری کیا گزری
دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے

وہ نہیں ہم، کہ چلے جائیں حرم کو، اے شیخ!
ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے

آئیں جس بزم میں وہ، لوگ پکار اُٹھتے ہیں
"لو، وہ برہم زنِ ہنگامۂ محفل آئے"

دیدہ خوں بار ہے مدت سے، و لے آج ندیم!
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

سامنا حور و پری نے نہ کیا ہے نہ کریں
عکس تیرا ہی مگر، تیرے مقابل آئے

اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا غالب!
آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے

★

شبِ وصال میں، مونس گیا ہے بن تکیہ
ہوا ہے موجبِ آرامِ جان و تن تکیہ

خراج بادشہِ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج!
کہ بن گیا ہے خمِ جعدِ پُرشکن تکیہ

بنا ہے تختۂ گل ہائے یاسمیں بستر
ہوا ہے دستۂ نسرین و نسترن تکیہ

فروغِ حسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام
جو رختِ خواب ہے پرویں، تو ہے پرن تکیہ

مزا ملے، کہو کیا خاک، ساتھ سونے کا
رکھے جو بیچ میں وہ شوخِ سیم تن تکیہ

اگرچہ تھا یہ ارادہ، مگر خدا کا شکر
اٹھا سکا نہ نزاکت سے گلبدن تکیہ

ہوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غائب
اگر چہ زانوئے نل پر رکھے دمن تکیہ

بضربِ تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا
کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا کوہکن تکیہ

یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہونے تک
رکھو نہ شمع پہ اے اہلِ انجمن! تکیہ

اگرچہ پھینک دیا تم نے دور سے لیکن
اٹھائے کیونکہ یہ رنجورِ خستہ تن! تکیہ

غش آ گیا جو پس از قتل میرے قاتل کو
ہوئی ہے اس کی مری نعش بے کفن تکیہ

شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیت کا
کہ سانپ فرش ہے اور سانپ کا ہے پھن تکیہ

روا رکھو نہ رکھو، تھا جو لفظ "تکیہ کلام"
اب اس کو کہتے ہیں اہلِ سخن "سخن تکیہ"

ہم اور تم فلکِ پیر جس کو کہتے ہیں
فقیرِ غالبِ مسکیں کا ہے کہن تکیہ

★

آئینہ کیوں نہ دوں، کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں، کہ تجھ سا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا، تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہ، سویدا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا!
افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے، ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک، کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عناں گسیختہ، دریا کہیں جسے

درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
صبحِ بہار، پنبۂ مینا کہیں جسے

غالب! برا نہ مان، جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے؟

★

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک
وضع میں گو ہوئی دو سر، تیغ ہے ذوالفقار ایک
ہم سخن اور ہم زباں، حضرتِ قاسم و طپاں
ایک طپش کا جانشیں، درد کا یادگار ایک
نقدِ سخن کے واسطے، ایک عیارِ آگہی
شعر کے فن کے واسطے، مایۂ اعتبار ایک
ایک وفا و مہر میں، تازگیِ بساطِ دہر
لطف و کرم کے باب میں، زینتِ روزگار ایک
گُلکدہ تلاش کو، ایک ہے رنگ، ایک بُو
ریختہ کے قماش کو، پود ہے ایک، تار ایک
مملکتِ کمال میں، ایک امیرِ نامور
عرصۂ قیل و قال میں، خسروِ نامدار ایک
گلشنِ اتفاق میں، ایک بہارِ بے خزاں
مے کدۂ وفاق میں، بادۂ بے خمار ایک
زندۂ شوقِ شعر کو، ایک چراغِ انجمن
کشتۂ ذوقِ شعر کو، شمعِ سرِ مزار ایک
دونوں کے دل حق آشنا، دونوں رسول پر فدا
ایک محبِّ چار یار، عاشقِ ہشت و چار ایک
جانِ وفا پرست کو، ایک شمیمِ نوبہار
فرقِ ستیزہ مست کو، ابرِ تگرگ بار ایک
لایا ہے کہہ کے یہ غزل، شائبہ ریا سے دور
کر کے دل و زباں کو غالبِ خاکسار ایک

★

آپ نے مَسَّنِیَ الضُّرّ کہا ہے تو سہی
یہ بھی یا حضرتِ ایوبؑ! گلا ہے تو سہی
رنج طاقت سے سوا ہو، تو نہ پیٹوں کیوں سر
ذہن میں خوبیِ تسلیم و رضا ہے تو سہی
ہے غنیمت، کہ بامید گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی
دوست گر کوئی نہیں ہے، جو کرے چارہ گری
نہ سہی، لیک تمنائے دوا ہے تو سہی
غیر سے، دیکھیے کیا خوب نبھائی اُس نے!
نہ سہی ہم سے، پر اُس بُت میں وفا ہے تو سہی
نقل کرتا ہوں اُسے نامۂ اعمال میں مَیں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
کبھی آ جائے گی، کیوں کرتے ہو جلدی، غالبؔ!
شہرۂ تیزیِ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

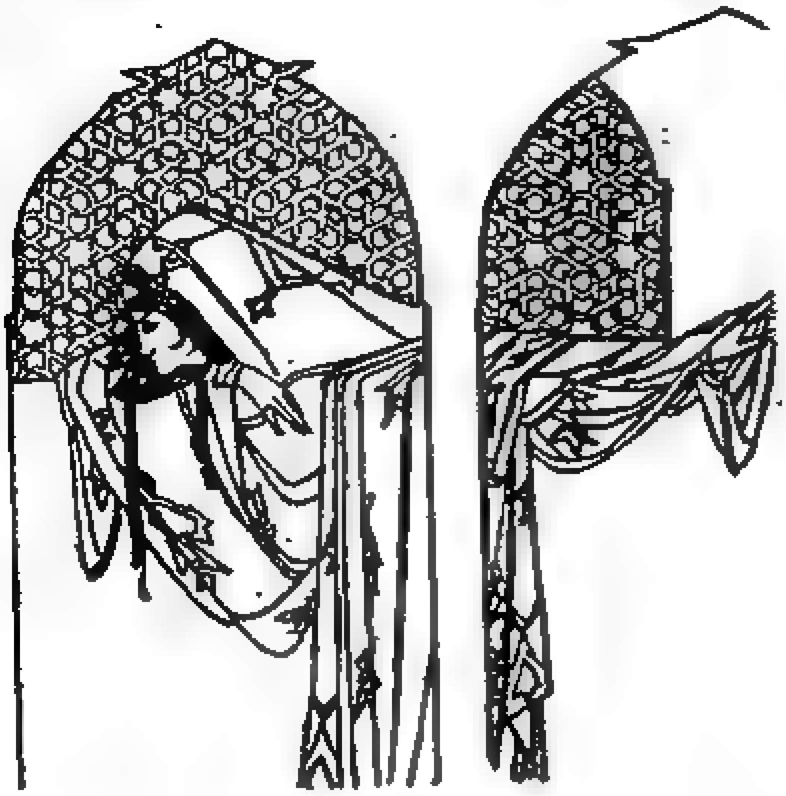

★

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں؟
ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں
نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر
میں بھی ہوں واقفِ اسرار، کہوں یا نہ کہوں؟
شکوہ سمجھو اسے، یا کوئی شکایت سمجھو
اپنی ہستی سے ہوں بےزار، کہوں یا نہ کہوں؟
اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتاریِ دل
جب نہ پاؤں کوئی غم خوار، کہوں یا نہ کہوں؟
دل کے ہاتھوں سے، کہ ہے دشمنِ جانی اپنا
ہوں اک آفت میں گرفتار، کہوں یا نہ کہوں؟
میں تو دیوانہ ہوں، اور ایک جہاں ہے غمّاز
گوش ہیں در پسِ دیوار، کہوں یا نہ کہوں؟
آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے، تو اسدؔ!
حسبِ حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں؟

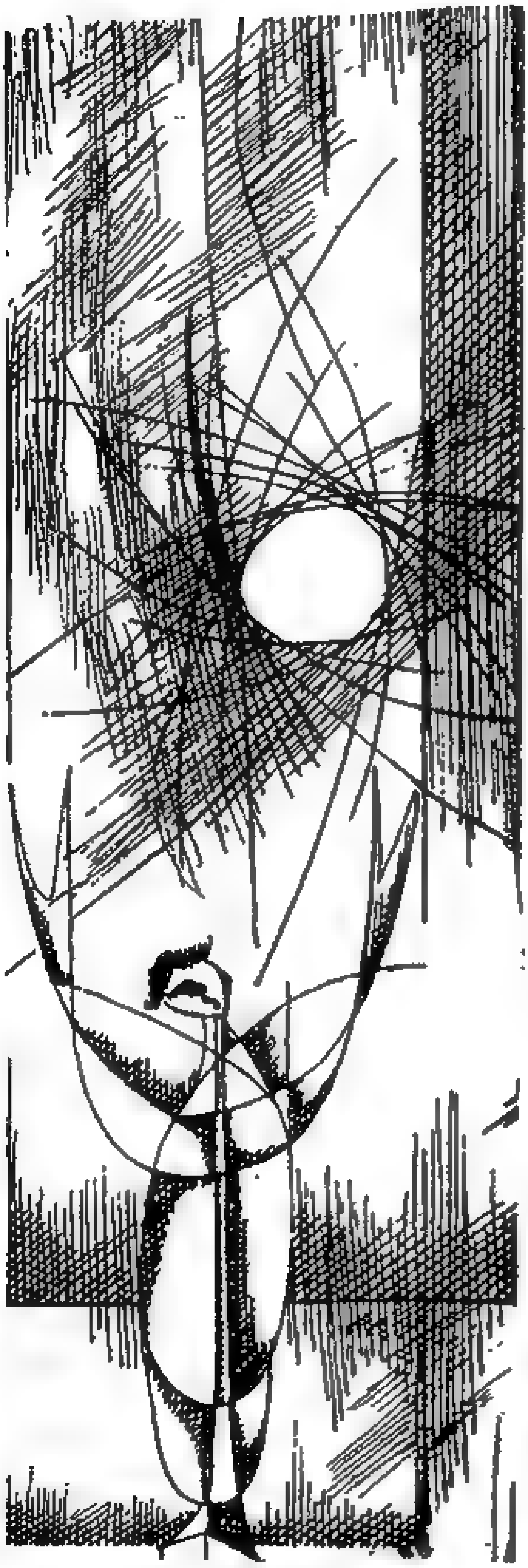

★

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی
غیر کی مرگ کا غم کس لئے، اے غیرتِ ماہ!
ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا، اور سہی
تم ہو بُت، پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟
تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی
حسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی
تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا
کعبہ اک اور سہی، قبلہ نما اور سہی
کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے، واعظ!
خُلد بھی باغ ہے، خیر آب و ہوا اور سہی
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں، یارب!
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
مجھ کو وہ دو، کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی، آبِ بقا اور سہی
مجھ سے، غالب! یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بے دادگرِ رنج فزا اور سہی

★

ممکن نہیں، کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں، آہوئے صیاد دیدہ ہوں
ہوں دردمند، جبر ہو یا اختیار ہو
گہ نالۂ کشیدہ، گہ اشکِ چکیدہ ہوں
جاں لب پہ آئی، تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بسکہ، تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں
نے سُبحہ سے علاقہ، نہ ساغر سے رابطہ
میں معرضِ مثال میں، دستِ بریدہ ہوں
ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نہ دانۂ فتادہ ہوں، نہ دامِ چیدہ ہوں
جو چاہیے، نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسفِ بقیمتِ اوّل خریدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز، ولے ناشنیدہ ہوں
اہلِ ورع کے حلقہ میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے فرقہ میں، میں برگزیدہ ہوں
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح، اسدؔ!
ڈرتا ہوں آئینے سے، کہ مردم گزیدہ ہوں

★

مجلسِ شمعِ عذاراں میں جو آجاتا ہوں
شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں
ہو وے ہے جادۂ رہ، رشتۂ گوہر ہر گام
جس گزر گاہ میں، میں آبلہ پا جاتا ہوں
سرگراں مجھ سے سبک رَو کے نہ رہنے سے رہو
کہ بہ یک جنبشِ لب مثلِ صدا جاتا ہوں

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

قصیدے
مثنویات
قطعات
رباعیات
مرثیہ
سلام
منقبت
نظم
مدح
خمسہ
سہرے

قصائد در منقبت

سازِ یک ذرہ نہیں، فیضِ چمن سے بے کار
سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

مستیِ بادِ صبا سے، ہے بہ عرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے، جوہرِ تیغِ کہسار

سبز ہے، جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ
تازہ ہے، ریشۂ نارنج صفت رُوئے شرار

مستیِ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

کوہ و صحرا ہمہ معموریِ شوقِ بلبل
راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

سونپے ہے فیض ہوا، صورتِ مژگانِ یتیم
سرنوشتِ دو جہاں ابر بہ یک سطرِ غبار

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ اندازِ ہلال
قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بے کار

کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ، قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ، طاؤس شکار

مے کدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی
بھول جا یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار

موجِ گل ڈھونڈ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ مے خانہ میں گر تو دستار

کھینچے گر مانیِ اندیشہ، چمن کی تصویر
سبز، مثلِ خطِ نوخیز ہو، خطِ پرکار

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

وہ شہنشاہ، کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلک العرش، ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل، سازِ طنابِ معمار

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرکاہ
وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

خاکِ صحرائے نجف، جوہرِ سیرِ عرفا
چشمِ نقشِ قدم، آئینۂ بختِ بیدار

ذرہ اُس گرد کا، خورشید کو آئینۂ ناز
گرد اُس دشت کی، اُمید کو احرامِ بہار

آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیِ ناز
عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار
دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلنار

شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ، پرواز
ذوق میں جلوہ کے تیرے بہ ہوائے دیدار

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں
سلکِ اختر میں مہِ نو، مژہ گوہر بار

ہم عبادت کو، ترا نقشِ قدم، مُہرِ نماز
ہم ریاضت کو تِرے حوصلے سے استظہار

مدح میں تیری، نہاں زمزمۂ نعتِ نبی
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

جوہرِ دستِ دُعا آئینہ یعنی تاثیر
یک طرف نازشِ مژگاں و دگر سو غمِ خار

مَردُمک سے ہو عزا خانۂ اقبالِ نگاہ
خاکِ در کی ترے جو چشم نہ ہو آئینہ دار

دشمنِ آلِ نبی کو، بہ طرب خانۂ دہر
عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو، طاقِ دیوار

دیدہ تا دل، اسدؔ! آئینۂ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

★

دہر جُز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے، اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے، نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنّا، کہ نہ دنیا ہے، نہ دیں

ہرزہ ہے، نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے، آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

نقشِ معنی، ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق، ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دُنیا و چہ دیں

مثلِ مضمونِ وفا باد بہ دستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم، خاک بہ فرقِ تمکیں

عشق، بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصلِ، زنگارِ رُخِ آئینۂ حُسنِ یقیں

کوہ کن، گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں، آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟
کس نے پایا اثرِ نالۂ دل ہائے حزیں؟

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں، لیکن
نہ سر و برگِ ستائش، نہ دماغِ نفریں

کس قدر ہرزہ سرا ہوں، کہ عیاذاً باللہ!
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

نقشِ لاحول لکھ، اے خامۂ ہذیاں تحریر!
"یا علی" عرض کر، اے فطرتِ وسواس قریں!

مظہرِ فیضِ خدا، جان و دلِ ختمِ رسُل
قبلۂ آلِ نبی، کعبۂ ایجادِ یقیں

ہو وہ سرمایۂ ایجاد، جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اُس کا جس جا
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

نسبتِ نام سے اُس کی ہے یہ رتبہ، کہ رہے
ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

فیضِ خلق اُس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گُل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں

بُرشِ تیغ کا اُس کی، ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سررشتۂ ایجاد کہیں

کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح، رونقِ بُت خانۂ چیں

جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا!
وصیِ ختمِ رُسُل تو ہے بہ فتوائے یقیں

جسمِ اطہر کو ترے، دوشِ پیمبر منبر
نامِ نامی کو ترے، ناصیۂ عرش، نگیں

کس سے ممکن ہے تری مدح، بغیر از واجب
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں

تیرے در کے لئے اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دئے جان و دل و دیں

تیری مدحت کے لئے ہیں دل و جاں کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم، دست و جبیں

کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا!
کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں!

جنسِ بازارِ معاصی، اسداللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں

دے دُعا کو مری، وہ مرتبۂ حُسنِ قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار "آمیں"

غمِ شبیر سے ہو سینہ، یہاں تک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

طبع کو اُلفتِ دُلدُل میں یہ سرگرمیِ شوق
کہ جہاں تک چلے اُس سے قدم اور مجھ سے جبیں

دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں

صرفِ اعدا، اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ
وقفِ احباب، گُل و سنبلِ فردوسِ بریں

★

قصیدے

ہاں، مہِ نو! سنیں ہم اس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب! — "بندہ عاجز ہے، گردشِ ایام
اڑ کے جاتا کہاں؟ کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام"
مرحبا، اے سرورِ خاصِ خواص! — حبذا، اے نشاطِ عامِ عوام!
عذر میں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا — صبح جو جاتے اور آتے شام
ایک میں کیا، کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟ — مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں کا نمام؟
جانتا ہوں، کہ آج دنیا میں — ایک ہی ہے، اُمید گاہِ انام
میں نے مانا، کہ تو ہے حلقہ بگوش — غالب اُس کا مگر نہیں ہے غلام؟
جانتا ہوں، کہ جانتا ہے تو — تب کہا ہے، بہ طرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو، تو ہو، اے ماہ! — قربِ ہر روزہ، بر سبیلِ دوام
تجھ کو کیا پایا روشناسی کا — جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں، کہ اس کے فیض سے تو — پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون؟ — مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام
میرا اپنا جدا معاملہ ہے — اور کے لین دین سے کیا کام؟
ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص — گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ — کیا نہ دے گا مجھے مےِ گلفام!
جب کہ چودہ منازلِ فلکی — کر چکے قطع تیری تیزیِ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر — کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز   اپنی صورت کا اک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا   توسنِ طبع چاہتا تھا لگام
زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام   تجھ کو کس نے کہا، کہ ہو بدنام؟
مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں   غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے   کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام
کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس   اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
اُس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد   چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام
بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار   دل کے لینے میں جن کو تھا اِبرام

چھیڑتا ہوں، کہ ان کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام؟

کہہ چکا میں تو سب کچھ، اب تو کہہ   اے پری چہرہ، پیکِ تیز خرام!
کون ہے، جس کے در پہ ناصیہ سا   ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام؟
تو نہیں جانتا، تو مجھ سے سن   نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل، بہادر شاہ   مظہرِ ذوالجلال والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف   نو بہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل، صورتِ اعجاز   جس کا ہر قول، معنیِ الہام
بزم میں، میزبانِ قیصر و جم   رزم میں، اوستادِ رستم و سام
اے ترا لُطف، زندگی افزا   اے ترا عہد، فرخی فرجام
چشمِ بد دور! خسروانہ شکوہ   لوحش اللہ! عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے، قیصرِ روم   جرعہ خواروں میں تیرے، مرشدِ جام
وارثِ مُلک جانتے ہیں تجھے   ایرج و تور و خسرو و بہرام
زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے   گیو و گودرز و بیژن و رُہام
مرحبا! موشگافیِ ناوک   آفریں! آب داریِ صمصام
تیر کو تیرے تیرِ غیر، ہدف   تیغ کو تیری تیغِ خصم، نیام
رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند!   برق کو دے رہا ہے کیا الزام!

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام
فنِ صورت گری میں تیرا گرز
گر نہ رکھتا دستگاہِ تمام
اُس کے مضروب کے سروتن سے
کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور اُن اوراق میں بہ کلکِ قضا
مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش
لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام
آسماں کو کہا گیا ، کہ کہیں
گنبدِ تیز گردِ نیلی فام
حکمِ ناطق لکھا گیا ، کہ لکھیں
خال کو دانہ اور زلف کو دام
آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام ، خسروِ روز
ماہِ تاباں کا اسم ، شحنۂ شام
تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی بدستور صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم
اس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روائیِ آغاز
ہو ابد تک رسائیِ انجام!

★

صبح دم دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اک نگارِ آتشیں رخ، سر کھلا
تھی نظر بندی، کیا جب ردِ سحر
بادۂ گل رنگ کا ساغر کھلا
لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا
تاجِ زریں ، مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا

شاہِ روشن دل، بہادر شہ کہ ہے — رازِ ہستی اس پہ سرتاسر کھلا
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں — مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے — عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا
پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام — اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا
روشناسوں کی جہاں فہرست ہے — واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا
توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب — تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا
نقشِ پا کی صورتیں وہ دل فریب — تو کہے، بت خانۂ آزر کھلا
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے — منصبِ مہر و مہ و محور کھلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک — میری حدِ وسع سے باہر کھلا
تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید — کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیونکر کھلا!
باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار — مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا
ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس — لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا — کاش کے ہوتا قفس کا در کھلا
ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے؟ — یار کا دروازہ پاویں گر کھلا
ہم کو ہے اس راز داری پر گھمنڈ — دوست کا، ہے راز دشمن پر کھلا
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ — زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا
ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کماں؟ — کب کمر سے غمزہ کی خنجر کھلا
مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ؟ — رہروی میں پردۂ رہبر کھلا
سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک؟ — آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا
نامہ کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ — رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھیو، غالبؔ سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ، اور کافر کھلا

★

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال — پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
خامہ نے پائی طبیعت سے مدد — بادباں بھی اٹھتے ہی لنگر کھلا
مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ — یہاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا
مہر کانپا، چرخ چکر کھا گیا — بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب — اب علوِ پایۂ منبر کھلا
سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس — اب عیارِ آبروئے زر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ — اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح؟ ہاں اک نام ہے — دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی، پر ستائش نا تمام — عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا
جانتا ہوں، ہے خطِ لوحِ ازل — تم پہ، اے خاقانِ نام آور! کھلا

تم کرو صاحبقرانی جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

★

ملاذِ کشور و لشکر، پناہِ شہر و سپاہ
جنابِ عالیِ ایلن بردن والا جاہ
بلند رتبہ وہ حاکم، وہ سرفراز امیر
کہ باج تاج سے لیتا ہے جس کا طرفِ کلاہ
وہ محضِ رحمت و رافت کہ بہرِ اہلِ جہاں
نیابتِ دمِ عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ
وہ عینِ عدل، کہ دہشت سے جس کی پرسش کی
بنے ہے شعلۂ آتش، انیسِ پرِ کاہ

زمیں سے سُودہٗ گوہر اُٹھے بجائے غبار
جہاں ہو توسنِ حشمت کا اُس کے جولاں گاہ

وہ مہرباں ہو تو انجم کہیں: "الٰہی شکر"
وہ خشمگیں ہو، تو گردوں کہے: "خدا کی پناہ"

یہ، اُس کے عدل سے، اضداد کو ہے آمیزش
کہ دشت و کوہ کے اطراف میں بہ ہر سرِ راہ

ہِزَبر، پنجے سے لیتا ہے کام شانے کا
کبھی جو ہوتی ہے اُلجھی ہوئی دُمِ روباہ

نہ آفتاب، ولے آفتاب کا ہم چشم
نہ بادشاہ، ولے مرتبے میں ہمسرِ شاہ

خدا نے اس کو دیا ایک خوب رُو فرزند
ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوے ماہ

زہے ستارۂ روشن، کہ جو اُسے دیکھے
شعاعِ مہرِ درخشاں ہو اس کا تارِ نگاہ

خدا سے ہے یہ توقع، کہ عہدِ طفلی میں
بنے گا شرق سے تا غرب اس کا بازی گاہ

جوان ہو کے کرے گا یہ وہ جہانبانی
کہ تابع اس کے ہوں روز و شب سپید و سیاہ

کہے گی خلق اِسے "داورِ سپہر شکوہ"
کہیں گے لوگ اِسے "خسروِ ستارہ سپاہ"

عطا کرے گا خداوند کارساز اِسے
روانِ روشن و خوئے خوش و دلِ آگاہ

ملے گی اِس کو وہ عقلِ نہفتہ داں کہ اِسے
پڑے نہ قطعِ خصومت میں احتیاجِ گواہ

یہ ترکتاز سے برہم کرے گا کشورِ روس

یہ لے گا، بادشہِ چیں سے چھین تخت و کُلاہ
سِنینِ عیسوی اٹھارہ سو اور اٹھارہ دن
یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے تمام دیگاہ
یہ جتنے سینکڑے ہیں سب ہزار ہو جاویں
دراز اس کی ہو عمر اس قدر سخن کوتاہ
اُمیدوارِ عنایات، "شیو نارائن"
کہ آپ کا ہے نمک خوار اور دولت خواہ
یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عزّ و جاہ کے ساتھ
تمہیں اور اس کو سلامت رکھے سدا اللہ!

★

گنی ہیں سال کے رشتہ میں بیس بار گرہ
ابھی حساب میں باقی ہیں، سو ہزار گرہ

گرہ کی ہے یہی گنتی، کہ تا بروزِ شمار
ہُوا کرے گی ہر اک سال، پیش کار گرہ

یقین جان، برس گانٹھ کا ہے جو تاگا
یہ کہکشاں ہے، کہ ہیں اس میں بے شمار گرہ

گرہ سے اور گرہ کی اُمید کیوں نہ پڑے
کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں تین چار گرہ

دکھا کے رشتہ کسی جوتشی سے پوچھا تھا
کہ دیکھ کتنی اُٹھا لائے گا یہ تار گرہ

کہا، کہ چرخ پہ ہم نے گنی ہیں نو گرہیں
جو یاں گنیں گے تو پاویں گے نو ہزار گرہ

خود آسماں، ہے مہاراؤ راجا پر صدقے
کرے گا سینکڑوں اس تار پر نثار گرہ

وہ راؤ راجہ بہادر، کہ حکم سے جن کے
رواں ہو تار پہ فی الفور دانہ دار گرہ

انہیں کی سال گرہ کے لئے ہے سال بسال
کہ لائے غیب سے غنچوں کی نو بہار گرہ

انہی کی سال گرہ کے لئے بناتا ہے
ہوا میں بوند کو ابرِ تگرگ بار گرہ

انہی کی سال گرہ کے لئے ہے یہ توقیر
کہ بن گئے ہیں ثمر ہائے شاخسار گرہ

سُن، اے ندیم! برس گانٹھ کے یہ تاگے نے
تجھے بتاؤں، کہ کیوں کی ہے اختیار گرہ

پے دُعائے بقائے جنابِ فیض مآب
لگے گی اس میں ثوابت کی استوار گرہ

ہزار دانہ کی تسبیح چاہتا ہے یہی
بلا مبالغہ درکار ہے ہزار گرہ

عطا کیا ہے خدا نے یہ جاذبہ اس کو ۔۔۔ کہ چھوڑتا ہی نہیں رشتہ زینہار گرہ
کشادہ رُخ نہ پھرے کیوں جب اس زمانے میں ۔۔۔ بچے نہ از پئے بندِ نقاب یار گرہ
متاعِ عیش کا ہے قافلہ چلا آتا ۔۔۔ کہ جادہ رشتہ ہے اور ہے شترقطار گرہ
خدا نے دی ہے وہ غالب کو دستگارِ سخن ۔۔۔ کہ دوڑ ڈھونڈھ کے لاتا ہے خاکسار گرہ
کہاں مجالِ سخن، سانس لے نہیں سکتا ۔۔۔ پڑی ہے دل میں مرے غم کی پیچ دار گرہ
گرہ کا نام لیا پر نہ کر سکا کچھ بات ۔۔۔ زباں تک آکے ہوئی اور اُستوار گرہ
ملے یہ گانٹھ تو البتہ دم نکل جاوے ۔۔۔ بُری طرح سے ہوئی اور اُستوار گرہ
اِدھر نہ ہو گی توجہ حضور کی جب تک ۔۔۔ کبھی کسی سے کھُلے گی نہ زینہار گرہ
دعا ہے یہ کہ مخالف کی دل میں از رہِ بغض ۔۔۔ پڑی ہے یہ جو بہت سخت نابکار گرہ

دل اس کا پھوڑ کے نکلے بشکل پھوڑے کی
خدا کرے کہ کرے اس طرح ابھار گرہ

★

کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام ۔۔۔ فرماں روائے کشورِ پنجاب کو سلام
حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس ۔۔۔ نوابِ مستطاب، امیرِ شہ احتشام
جم رتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقتِ رزم ۔۔۔ ترکِ فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں حسام
جس بزم میں کہ ہو اُنہیں آئینِ میکشی ۔۔۔ واں آسمان شیشہ بنے آفتاب جام
چاہا تھا میں نے تم کو مہِ چاردہ کہوں ۔۔۔ دل نے کہا، کہ یہ بھی ہے تیرا خیالِ خام
دو رات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا ۔۔۔ حضرت کا عز و جاہ رہے گا علی الدوام
سچ ہے، تم آفتاب ہو، جس کے فروغ سے ۔۔۔ دریائے نور ہے فلکِ آبگینہ فام
میری سنو، کہ آج تم اس سرزمین پر ۔۔۔ حق کے تفضّلات سے ہو مرجعِ انام
اخبارِ لودھیانہ میں، میری نظر پڑی ۔۔۔ تحریر ایک، جس سے ہوا بندہ تلخ کام
ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر ۔۔۔ کاتب کی آستین ہے مگر تیغِ بے نیام
وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا ۔۔۔ جب یاد آگئی ہے، کلیجہ لیا ہے تھام
سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم ۔۔۔ نمبر رہا نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام

ستر برس کی عمر میں یہ داغِ جاں گداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام

تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں
استادہ ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام

اُس بزمِ پُر فروغ میں اس تیرہ بخت کو
نمبر ملا نشست میں از روے اہتمام

سمجھا اُسے گراب، ہوا پاش پاش دل
دربار میں جو مجھ پہ چلی چشمکِ عوام

عزت پہ اہلِ نام کی ہستی کی ہے بنا
عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام

تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
اس ناز کا فلک نے لیا انتقام

آیا تھا وقت ریل کے کھُلنے کا بھی قریب
تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا اژدہام

اس کش مکش میں آپ کا مدّاحِ دردمند
آقائے نامور سے نہ کچھ کرسکا کلام

جو واں نہ کہہ سکا تھا، وہ لکھا حضور کو
دیں آپ میری داد، کہ ہوں فائز المرام

ملک و سپہ نہ ہو، تو نہ ہو، کچھ ضرر نہیں
سلطانِ بر و بحر کے در کا ہوں میں غلام

وکٹوریہ کا دہر میں جو مدح خواں ہو
شاہانِ عصر چاہیے، ہیں عزت اس سے وام

خود ہے تدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور
بے وجہ کیوں ذلیل ہو، غالبؔ ہے جس کا نام

امرِ جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال
بارے قدیم قاعدے کا چاہیے قیام

ہے بندہ کو اعادۂ عزت کی آرزو
چاہیں اگر حضور، تو مشکل نہیں یہ کام

دستورِ فنِ شعر یہی ہے قدیم سے
یعنی دعا پہ مدح کا کرتے ہیں اختتام

ہے یہ دُعا، کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے
اقلیم ہند و سند سے تا ملک روم شام

★

مرحبا! سالِ فرخی آئیں
عیدِ شوال و ماہِ فروردیں

مہ و سال، اشرفِ شہور و سنیں
شب و روز، افتخارِ لیل و نہار

گرچہ ہے بعدِ عید کے نوروز
لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں

سو اس اکیس دن میں ہولی کی
جابجا مجلسیں ہوئی رنگیں

شہر میں کوُبہ کوُ، عبیر و گلال
باغ میں سُو بہ سُو، گل و نسریں

شہر، گویا نمونۂ گلزار
باغ، گویا نگار خانۂ چیں

تین تیوہار، اور ایسے خوب
جمع ہرگز ہوئے، نہ ہوں گے کہیں

پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں
منعقد محفلِ نشاط قریں

محفلِ غسلِ صحتِ نواب
رونق افزائے مسندِ تمکیں

بزم گہ میں، امیرِ شاہ نشاں
رزم گہ میں، حریفِ شیرِ کمیں

پیش گاہِ حضور، شوکت و جاہ
خیر خواہِ جناب، دولت و دیں

جن کی مسند کا آسماں گوشہ
جن کی خاتم کا آفتاب نگیں

جن کی دیوارِ قصر کے نیچے
آسماں ہے گدائے سایہ نشیں

دہر میں اس طرح کی بزم سرور
نہ ہوئی ہو کبھی بروئے زمیں

انجمن چرخ، گوہر آگیں فرش
نورِ مے، ماہِ ساغرِ سیمیں

راجہ اندر کا جو اکھاڑہ ہے
ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں

وہ نظر گاہِ اہلِ وہم و خیال
یہ ضیا بخشِ چشمِ اہلِ یقیں

واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم!
کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں

یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے
ژالہ آسا بچھے ہیں درّ ثمیں

نغمۂ مطربانِ زہرہ نوا
جلوۂ لولیانِ ماہ جبیں

اس اکھاڑے میں، جو کہ ہے مظنون
یاں وہ دیکھا بہ چشمِ صورت بیں

سرورِ مہر فر ہوا جو سوار
بہ کمالِ تجمل و تزئیں

سب نے جانا، کہ ہے پری توسن
اور بالِ پری ہے دامنِ زیں

نقشِ سُمِ سمند سے، یکسر
بن گیا دشت، دامنِ گلچیں

فوج کی گردِ راہ، مُشک فشاں
رہ رووں کے مشام، عطر آگیں

بسکہ بخشی ہے فوج کو عزت
فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں

موکبِ خاص یوں زمیں پر تھا
جس طرح ہے سپہر پر پرویں

چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام
ران پر داغِ تازہ دے کے وہیں

اور داغ آپ کی غلامی کا
خاص بہرام کا ہے زیبِ سُریں

بندہ پرور! ثنا طرازی سے
مدعا عرضِ فنِ شعر نہیں

آپ کی مدح، اور میرا منہ!
گر کہوں بھی، تو آئے کس کو یقیں

اور پھر اب، کہ ضعفِ پیری ہے — ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں
پیری و نیستی، خدا کی پناہ! — دستِ خالی و خاطرِ غمگیں
صرف اظہار ہے ارادت کا — ہے قلم کی جو سجدہ ریز زمیں
مدح گستر نہیں دعا گو ہے — غالبؔ عاجز نیاز آگیں
ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں
تم رہو زندہ جاوداں آمیں

★

مثنوی

در صفت آنبہ

ہاں، دلِ دردمندِ زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا — شاخِ گل کا ہے گل فشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے؟ — نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے، آموں کا کچھ بیاں ہو جائے — خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے؟ — ثمر و شاخ، گوئے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں؟ — آئے، یہ گوئے اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جاوے خاک — پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور — بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو، تمھیں خبر کیا ہے! — آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں، نہ شاخ و برگ، نہ بار — جب خزاں آئے، تب ہو اس کی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں — جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی — ق — کوہکن باوجودِ غمگینی
جان دینے میں اس کو یکتا جان — پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
کہ دوا خانۂ ازل میں مگر

آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام
شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغِ جنّت سے

انگبیں کے، بہ حکمِ رب النّاس
بھر کے بھیجے ہیں سر بہ مُہر گلاس

یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات
مدّتوں تک دیا ہے آبِ حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں ورنہ، اور کہاں یہ نخل

تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس
رنگ کا زرد، پر کہاں بو باس

آم کو دیکھتا اگر اک بار
پھینک دیتا طلائے دست افشار

رونقِ کارگاہِ برگ و نوا
نازشِ دودمانِ آب و ہوا

رہروِ راہِ خلد کا توشہ
طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم
نازپروردۂ بہار ہے آم

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد
عدل سے اس کے ہے حمایتِ عہد

فخرِ دیں، عزِّ شان و جاہ و جلال
زینتِ طینت و جمالِ کمال

کار فرمائے دین و دولت و بخت
چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

سایہ اُس کا ہما کا سایہ ہے
خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور
جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور

اس خداوندِ بندہ پرور کو
وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دل شاد و شادماں رکھیو
اور غالب پہ مہرباں رکھیو

★

مثنوی

ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی ۔۔۔ لے کے دل سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا ۔۔۔ اِس قدر بگڑا، کہ سر کھانے لگا
میں کہا، اے دل! ہوائے دلبراں ۔۔۔ بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں
پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار ۔۔۔ یہ نہیں ہیں گے کسُو کے یارِ غار
گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر ۔۔۔ کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مِل جائے گی تیری ان سے سانٹھ ۔۔۔ لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہوگا سُلجھانا تجھے ۔۔۔ قہر ہے دل اِن سے اُلجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے ۔۔۔ بھُول مت اِس پر اُڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں ۔۔۔ مُفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں
دل نے سُن کر، کانپ کر، کھا پیچ و تاب ۔۔۔ غوطے میں جا کر، دیا کٹ کر جواب

"رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اُوست"

★

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل
پانوں سے تیرے مَلے فرقِ ارادت اَورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اِکلیل
تیرا اندازِ سُخن، شانۂ زُلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبریل

تجھ سے عالم پہ کھلا، رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے دُنیا میں بچھا، مائدۂ بذلِ خلیل
بہ سخن، اَوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ
بہ کرم، داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل
تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل
ماہ نے چھوڑ دیا ثَور سے جانا باہر
زُہرہ نے ترک کیا، حُوت سے کرنا تحویل
تیری دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش، مری انجاحِ مقاصد کی کفیل
تیرے اقبالِ ترحّم، مرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل
بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخِ کج باز نے چاہا، کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل
تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل
دُرِ معنی سے مرا صفحہ، لقا کی ڈاڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ اَمر کی زنبیل
فکر میری، گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری، رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدّق، توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش، تفصیل

نیک ہوتی مری حالت، تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل
قبلۂ کون و مکاں! خستہ نوازی میں یہ دیر!
کعبۂ امن و اماں! عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

★

گئے وہ دن، کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے
بس، اب بگڑے پہ کیا شرمندگی، جانے دو مل جاؤ
قسم لو ہم سے، گر یہ بھی کہیں "کیوں ہم نہ کہتے تھے"

★

کلکتہ کا جو ذکر کیا تُو نے ہم نشیں!
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے!
وہ سبزہ زار ہائے مطرّا، کہ ہے غضب!
وہ نازنیں بتانِ خود آرا، کہ ہائے ہائے!
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا، کہ ہائے ہائے!
وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ واہ!
وہ بادہ ہائے نابِ گوارا کہ ہائے ہائے!

★

نہ پُوچھ اِس کی حقیقت، حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہے، بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

★

مقامِ شکر ہے، اے ساکنانِ خطۂ خاک! رہا ہے زور سے ابرِ ستارہ بار، برس
کہاں ہے ساقیِ مہوش؟ کہاں ہے ابرِ مطیر؟ بیار، لا مےِ گلنار گوں، بہار، برس
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی درِ حضور پر، اے ابر! بار بار برس
ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو ملک، دہ کہے "امیر کلب علی خاں جئیں ہزار برس"
فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں کئی ہزار برس، بلکہ بے شمار برس
جنابِ قبلۂ حاجات! اس بلاکش نے بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
شفا ہو آپ کو، غالبؔ کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے، کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

★

افطارِ صوم کی کچھ، اگر دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے، روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے، تو ناچار کیا کرے

★

سیہ گلیم ہوں، لازم ہے، میرا نام نہ لے جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پہ مجھے کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

★

سہل تھا مسہل، ولے یہ سخت مشکل آپڑی مجھ پہ کیا گزرے گی اِتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد تین مسہل، تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

★

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں　　دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام　　اِس سے ہے یہ مُراد کہ ہم آشنا نہیں

★

ہند میں اہلِ تسنّن کی ہیں دو سلطنتیں
حیدر آبادِ دکن، رشکِ گلستانِ اِرم
رام پور، اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آکے ہوئے ہیں باہم
حیدر آباد بہت دور ہے اس ملک کے لوگ
اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جاتے ہیں تو کم
رام پور آج ہے وہ بقعۂ معمور، کہ ہے
مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم
رام پور، ایک بڑا باغ ہے از روئے مثال
دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خورم
جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں
ہے اُسی طور پہ یہاں دجلہ فشاں دستِ کرم
ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مدام
دُرِ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم
صبح دم باغ میں آجائے، جسے ہو نہ یقین
سبزہ و برگِ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم
حبّذا باغِ ہمایونِ تقدّس آثار!
کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم
مسلکِ شرع کے ہیں راہ رو و راہ شناس
خضر بھی یہاں اگر آجائے، تو لے اِن کے قدم

مدح کے بعد دعا چاہیے، اور اہلِ سخن
اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے باغراق رقم
حق سے کیا مانگیے، اُن کے لیے جب ہو موجود
ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و عَلَم
ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ غلُو کے قائل
دو دُعائیں ہیں، کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم
یا خدا! غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں، کہ طلب گار ہے جن کا عالم
اوّلاً عمرِ طبیعی، بہ دوامِ اقبال
ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ امم

★

اے جہاں آفریں خدائے کریم — صانعِ ہفت چرخ و ہفت اقلیم
نام سیکلوڈ جن کا ہے مشہور — یہ ہمیشہ بصد نشاط و سرور
عمر و دولت سے شادماں رہیں
اور غالب پہ مہرباں رہیں

★

گوڑگانویں کی ہے جتنی رعیت، وہ یک قلم — عاشق ہے اپنے حاکمِ عادل کے نام کی
سو یہ نظر فروز قلم دان نذر ہے — مسٹر کووان صاحبِ عالی مقام کی

★

اے منشیِ خیرہ سر، اسخن ساز نہ ہو — عصفور ہے تو، مقابلِ باز نہ ہو
آواز تری نکلی، اور آواز کے ساتھ — لاٹھی وہ لگی، کہ جس میں آواز نہ ہو

کیا اِن دنوں بسر ہو ہماری فراغ میں
کچھ تفرقہ رہا نہ دل و دردو داغ میں
چاہا بچشمِ شوق، جو موسیٰ نے طور پر
یہاں دیکھتے ہیں روز وہی ہر چراغ میں
یہ تمکنت و وقار، علاّئی یہ وحشتیں
شورش ہے کچھ ضرور تمہارے دماغ میں

قطعہ تاریخ اِختتامِ کتاب تکشیفِ حکمت

سلیم خاں، کہ وہ ہے نورِ چشمِ واصل خاں
حکیمِ حاذق و دانا ہے، وہ لطیف کا کلام
تمام دہر میں اس کے مطب کا چرچا ہے
کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام
اُسے فضایلِ علم و ہُنر کی افزایش
ہوئی ہے مبدءِ عالم سے، اس قدر انعام
کہ بحثِ علم میں، اطفالِ ابجدی اُس کے
ہزار بار فلاطوں کو دے چکے الزام
عجیب نسخۂ نادر لکھا ہے اِک اس نے
کہ جس میں حکمتِ طب ہی کے مسئلے ہیں تمام
نہیں کتاب، ہے اِک منبعِ نکاتِ بدیع
نہیں کتاب، ہے اِک معدنِ جواہر کام
کل اِس کتاب کے سالِ تمام میں جو مجھے
کمالِ فکر میں دیکھ خرد نے بے آرام
کہا یہ جلد، کہ تو اس میں سوچتا کیا ہے
"لکھا ہے نسخۂ تحفہ" یہی ہے سالِ تمام
۱۲۷۹ء

قطعہ تاریخ

خُجستہ انجمنِ طوے میرزا جعفر
کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالبؔ
نہ کیوں ہو مادّۂ سالِ عیسوی "محظوظ"
۱۸۵۴ء

قطعہ تاریخ

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی — ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالبؔ سے تاریخ اِس کی کیا ہے! — تو بولا "اِنشراحِ جشنِ جمشید"
۱۲۷۰ھ

قطعہ تاریخ

اِس کتابِ طرب نصاب نے جب — آب و تابِ انطباع کی پائی
فکرِ تاریخ سال میں، مجھ کو — ایک صورت نئی نظر آئی
ہندسے پہلے سات سات کے دو — دیے ناگاہ مجھ کو دکھلائی
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا — با ہزاراں ہزار زیبائی
سالِ ہجری تو ہو گیا معلوم — بے شمولِ عبارت آرائی
مگر اب ذوقِ بذلہ سنجی کو — ہے جُدا گانہ کارفرمائی
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ — بہ اُمیدِ سعادت افزائی
غرض اس سے ہیں چاردہ معصوم — جس سے ہے چشمِ جاں کو زیبائی
اور بارہ، امام ہیں، بارہ — جس سے ایماں کو ہے توانائی

اُن کو غالبؔ یہ سال اچھا ہے
جو ائمّہ کے ہیں تولائی

در مدح ڈلی

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے، اِسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں، کہ اِسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بہ گریباں، کہ اِسے کیا کہیے

مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی، لکھیے
حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے
مِسّی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رُخِ دل کشِ لیلا کہیے
حجر الاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض
نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے
وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے
صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز
میکدے میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے
کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے؟
کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنّا کہیے؟
کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجے
کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے؟
کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلا لکھیے
کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلما کہیے؟
بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اِس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

★

مدح

نصرت الملک بہادر! مجھے بتلا، کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے؟
گرچہ تو وہ ہے، کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونقِ بزمِ مہ و مہر، تری ذات سے ہے
اور میں وہ ہوں، کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا، خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا، جس کے سبب سے سرِ دست
نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عنان
یہ دعا شام و سحر قاضیِ حاجات سے ہے
تو سکندر ہے، مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے
اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالبِ خاک نشیں، اہلِ خرابات سے ہے

در مدحِ شاہ

اے شاہِ جہاں گیر جہاں بخش جہاں دار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
جو عقدۂ دشوار، کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اُس عقدے کو، سو بھی بہ اشارت
ممکن ہے؟ کرے خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخرِ سلیماں، جو کرے تیری وزارت
ہے نقشِ مُریدی ترا، فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غلامی ترا، توقیعِ امارت
تو آب سے گر سلب کرے، طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے، تابِ شرارت
ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت
ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغّل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
کیوں کر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر
قاصر ہے ستائش میں تری، میری عبارت
نوروز ہے آج اور وہ دن ہے، کہ ہوئے ہیں
نظّارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت
تجھ کو شرفِ مہرِ جہاں تاب مبارک
غالبؔ کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت!

★

سہرا

ہم نشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں　　بزمِ شادی ہے فلک، کاہکشاں ہے سہرا
ان کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو　　ہے تو کشتی میں، ولے بحرِ رواں ہے سہرا

★

سہرا

خوش اے بخت! کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے، پر اے طرفِ کلاہ
مجھ کو ڈر ہے، کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی
تب بنا ہو گا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دُولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخِ روشن کی دمک، گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تارِ ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گراں باریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں، اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

★

سہرا

چرخ تک دھوم ہے، کس دھوم سے آیا سہرا
چاند کا دائرہ لے زہرہ نے گایا سہرا

رشک سے لڑتی ہیں آپس میں اُلجھ کر لڑیاں
باندھنے کے لئے میں نے جو اٹھایا سہرا

بیانِ مصنّف

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں؟
مانا، کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

اُستادِ شہ سے، ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون، اور ریختہ! ہاں اس سے مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا، ز رہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُو سیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ، کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

★

گزارشِ غالب بحضورِ شاہ

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ!
اے جہاندارِ آفتاب آثار!

تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار

تم نے مجھ کو، جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز
روشناسِ ثوابت و سیار

گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں، کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
بادشہ کا غلامِ کار گزار

خانہ زاد اور مرید اور مدّاح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے، نوکر بھی ہو گیا، صد شکر!
نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں؟
مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد! اگرچہ مجھ کو نہیں
ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر
تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش؟
جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انسان؟
دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار؟

دھوپ کی تابش، آگ کی گرمی
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

میری تنخواہ جو مقرر ہے
اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اِسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو، ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار

رزم کی داستان گر سنیے
ہے زباں میری تیغ جوہر دار

بزم کا اِلتزام گر کیجے
ہے قلم میری ابرِ گوہر بار

ظلم ہے، گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے، گر کرو نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا؟
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

خمسہ بر غزل

بہادر شاہ ظفر

گھِستے گھِستے پانو میں زنجیر آدھی رہ گئی
مرگئے پر قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی
سب ہی پڑھتا کاش! کیوں تکبیر آدھی رہ گئی
"کھینچ کے، قاتل! جب تری شمشیر آدھی رہ گئی
غم سے جانِ عاشقِ دلگیر آدھی رہ گئی"

بیٹھ رہتا لے کے چشمِ پُرنم اُس کے رُو برو
کیوں کہا تو نے کہ کہہ دل کا غم اُس کے رُو برو
بات کرنے میں نکلتا ہے دم اُس کے رُو برو
"کہہ سکے ساری حقیقت ہم نہ اُس کے رُو برو
ہم نشیں! آدھی ہوئی تقریر آدھی رہ گئی"

تو نے دیکھا، مجھ پہ کیسی بن گئی، اے رازدار!
خواب و بیداری پہ کب ہے آدمی کو اختیار
مثلِ زخم آنکھوں کو سی دیتا جو ہوتا ہوشیار
"کھینچتا تھا رات کو میں خواب میں تصویرِ یار
جاگ اُٹھا، جو کھینچی تصویر آدھی رہ گئی"

غم نے جب گھیرا، تو چاہا ہم نے یوں اے دلنواز
مستیٔ چشمِ سیہ سے چل کے ہو دیں چارہ ساز
تو صدا نے پا سے جاگا تھا جو محوِ خوابِ ناز!
"دیکھتے ہی، اے ستم گر! تیری چشمِ نیم باز
کی تھی پوری ہم نے جو تدبیر، آدھی رہ گئی"

اُس بتِ مغرور کو کیا ہو کسی پر التفات
جس کے حسنِ روز افزوں کی یہ اک آدنا ہے بات
ماہِ نو نکلے پہ گزری ہوں کی راتیں پان سات
"اُس رُخِ روشن کے آگے ماہِ یک ہفتہ کی رات
تابشِ خورشید پُر تنویر آدھی رہ گئی"

تا مجھے پہنچائے کاہش، بختِ بد ہے گھات میں
ہاں فراوانی اگر کچھ ہے، تو ہے آفات میں
جز غم و رنج و الم گھاٹا ہے ہر اک بات میں
"کم نصیبی اس کو کہتے ہیں، کہ میرے ہات میں
آتے ہی خاصیتِ اکسیر آدھی رہ گئی"

سب سے یہ گوشہ کنارے ہے گلے لگ جا مرے
آدمی کو کیوں پکارے ہے گلے لگ جا مرے
سر سے گر چادر اُتارے ہے گلے لگ جا مرے
"مانگ کیا بیٹھا سنوارے ہے، گلے لگ جا مرے
وصل کی شب اے بُتِ بے پیر آدھی رہ گئی"

میں یہ کیا جانوں، کہ وہ کس واسطے یوں پھر گئے
پر نصیب اپنا، انہیں جاتا سنا یوں پھر گئے
دیکھنا قسمت، وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے
"آ کے آدھی دُور میرے گھر سے وہ کیوں پھر گئے
کیا کشش میں دل کی اب تاثیر آدھی رہ گئی"

ناگہاں یاد آگئی ہے مجھ کو، یا رب کب کی بات
کچھ نہیں کہتا کسی سے سُن رہا ہوں سب کی بات
کس لیے تجھ سے چھپاؤں ہاں وہ پرسوں شب کی بات
"نامہ بر جلدی میں تیری، وہ جو تھی مطلب کی بات
خط میں آدھی ہو سکی تحریر، آدھی رہ گئی"

ہو تجلّی برق کی صورت میں، ہے یہ بھی غضب
ہاں چند گھنٹے کی تو ہوتی، فرصتِ عیش و طرب
شام سے آتے، تو کیا اچھی گزرتی رات سب
"پاس میرے وہ جو آئے بھی تو بعد از نصف شب
نکلی آدھی حسرت، اے تقدیر آدھی رہ گئی"

تم جو فرماتے ہو، دیکھ اے غالبِ آشفتہ سر!
ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے گیا کیوں اُس کے گھر؟
جان کی پاؤں اماں، باتیں یہ سب سچ ہیں، مگر
"دل نے کی ساری خرابی، لے گیا مجھ کو ظفرؔ
واں کے جانے میں مری توقیر آدھی رہ گئی"

★

خطِ منظوم بنام علائیؔ

بس کہ فعّال ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب، انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا؟
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم
ماجرا دیدہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے، یا رب
کیا مٹے داغ دل سے ہجراں کا

خط منظوم بنام علائی

خوشی تو ہے آنے کی برسات کے
پییں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سرِ آغازِ موسم میں اندھے ہیں ہم
کہ دلّی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں
سوا ناج کے جو ہیں مطلوبِ جاں
نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو، کہ ہاں!
ابھی جا کے پوچھو، کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول
وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشہ دار
کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

★

مرثیہ

ہاں اے نفسِ بادِ سحر! شعلہ فشاں ہو
اے دجلۂ خوں! چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم! لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو
اے ماتمیانِ شہِ معصوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو
ماتم میں شہِ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو
گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگۂ نُہ پایا جو مدت سے بجا ہے
کیا خیمۂ شبیر سے رُتبہ میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا
کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیا فلک اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا
ہوگا دلِ بے تاب کسی سوختہ جاں کا
اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس رُو سے کہو برق نہیں ہے

سلام

سلام اسے، کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو
تو پھر کہیں، کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو

نہ بادشاہ نہ سلطاں، یہ کیا ستائش ہے
کہو کہ خامسِ آلِ عبا کہیں اس کو

خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی؟
کہو کہ رہبرِ راہِ خدا کہیں اس کو

خدا کا بندہ، خداوندگار بندوں کا
اگر کہیں نہ خداوند کیا کہیں اس کو

فروغِ جوہرِ ایماں حسین رضؓ ابنِ علی رضؓ
کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اس کو

کفیلِ بخششِ اُمّت ہے، بن نہیں پڑتی
اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اس کو

مسیح جس سے کرے اخذِ فیضِ جاں بخشی
ستم ہے کشتۂ تیغِ جفا کہیں اس کو

وہ جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیل سبیل
شہیدِ تشنہ لبِ کربلا کہیں اس کو

عدو کی سمعِ رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات
کہ جنّ و انس و ملک سب بجا کہیں اس کو

بہت ہے پایۂ گردِ رہِ حسین رضؓ بلند
بقدرِ فہم ہے، گر کیمیا کہیں اس کو

نظارہ سوز ہے یہاں تک ہر اک ذرّۂ خاک
کہ نوکِ جوہرِ تیغِ قضا کہیں اس کو

ہمارے درد کی یارب کہیں دوا نہ ملے
اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اس کو

ہمارا منہ ہے کہ دیں اُس کے حسنِ صبر کی داد
مگر نبیؐ و علی رضؓ مرحبا کہیں اس کو

زمامِ ناقہ کف اس کے میں ہے کہ اہلِ یقیں
پس از حسین رضؓ علی رضؓ پیشوا کہیں اس کو

وہ ریگِ تفتۂ وادی پہ گام فرسا ہے
کہ طالبانِ خدا رہنما کہیں اس کو

امامِ وقت کی یہ قدر ہے، کہ اہلِ عناد
پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اس کو

یہ اجتہاد عجب ہے، کہ ایک دشمنِ دیں
علی رضؓ سے آ کے لڑے اور خطا کہیں اس کو

یزید کو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
بُرا نہ مانیے، گر ہم بُرا کہیں اس کو

علی رضؓ کے بعد حسن رضؓ اور حسن رضؓ کے بعد حسین رضؓ
کرے جو اُن سے بُرائی بھلا کہیں اس کو

نبی کا ہو نہ جسے اعتقاد کافر ہے
رکھے امام سے جو بغض کیا کہیں اس کو

بھرا ہے غالبؔ دل خستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے، کہ خونیں نوا کہیں اس کو

رُباعیات

بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال
ایّامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم
اے عمرِ گزشتہ! یک قدم استقبال

★

شب، زُلف و رُخِ عرق فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں، کہ طُرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک، دیدۂ پُرنم تھا

★

آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال
ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال

★

دل تھا، کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی
بے تابیِ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن، اے تجلّی، افسوس!
تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

★

ہے خلقِ حسد قماش لڑنے کے لئے
وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے
یعنی، ہر بار صورتِ کاغذِ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے

★

دِل سخت نژند ہو گیا ہے گویا
اُس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
غالب! منہ بند ہو گیا ہے گویا

★

★

دُکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ
دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ
واللہ، کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

★

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل!
سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

★

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال
ہے لُطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

★

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں، سافل و عالی باہم
ہے اب کی شبِ قدر و دوالی باہم

★

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے

★

اِس رشتہ میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں، بلکہ سوا
ہر سینکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں، بلکہ سوا

★

★

کہتے ہیں، کہ "اب وہ مردم آزار نہیں
عشّاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں"
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا
کیوں کر مانوں، کہ اُس میں تلوار نہیں

★

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ، کام کرنے والے
کہتے ہیں، کہیں خدا سے، اللہ اللہ!
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

★

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں؟
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟
روزہ مرا ایمان ہے، غالبؔ! لیکن
خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں؟

★

اِن سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

★

دیکھ وہ برقِ تبسّم بسکہ دِل بے تاب ہے
دیدۂ گریاں مرا فوّارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازۂ مے خانہ بولا مے فروش
"اب شکستِ توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے"

★

ایک گرم آہ کی، تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر، ہم جگر جلے
پروانہ کا نہ غم ہو، تو پھر کس لئے اسدؔ!
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

رقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے
ثاقب! حرکت یہ کی ہے بے جا تم نے
حاجی کلّو کو دے کے بے وجہ جواب
غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے

★

اے روشنیٔ دیدہ شہاب الدین خاں!
کٹتا ہے، بتاؤ، کس طرح سے رمضان؟
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک؟
سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں؟

★

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھ کو رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو، جو کہ ہووے صوفی؟
شیعی کیونکر ہو ماورا النّہری؟

فردیات

مے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل
بادہ غالب! عرقِ بید نہیں

★

ابر روتا ہے، کہ بزمِ طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

★

بہا ہے یاں تک اشکوں میں، غبارِ کلفتِ خاطر
کہ چشمِ تر میں، ہر اک پارۂ دل، پائے درگل ہے

★

دل آپ کا، کہ دل میں ہے جو کچھ، سو آپ کا
دل لیجیے، مگر مرے ارماں نکال کے

★

شمشیرِ صافِ یار، جو زہراب دادہ ہو
وہ خطِ سبز ہے، کہ بہ رخسارِ سادہ ہو

★

دیکھتا ہوں اسے، تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

★

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے — یہ رنگِ زرد ہے، چمن زعفراں مجھے

★

جگر سے ٹوٹے ہوئے مُو کی ہے سناں پیدا — دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

★

نیازِ عشق، خرمن سوزِ اسبابِ ہوس بہتر
جو ہو جاوے نثارِ برق، مشتِ خار و خس بہتر

★

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط — کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط

★

ماہِ نو ہوں، کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے — عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سُلاتا ہے مجھے

★

صبا! لگا وہ طمانچہ طرف سے بُلبل کی — کہ رُوئے غنچۂ گل سوئے آشیاں پھر جائے

★

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے، کہ جی جانے ہے
ایسے ہنستے کو رُلایا ہے، کہ جی جانے ہے

★

ذرا کر زور سینے پر، کہ تیرِ پُرستم نکلے
جو وہ نکلے، تو دل نکلے، جو دل نکلے، تو دم نکلے

★

گلشنِ دہر بھی، ہے کوئی سرائے ماتم — شبنم اس باغ میں جب آئے، تو گریاں آئے

★

دو رنگیاں یہ زمانے کی جیتے جی ہیں سب — کہ مُردوں کو نہ بدلتے ہوئے کفن دیکھا

★

پھر مرتبہ بڑھاپا مرا، نفیِ غیر سے آیا ہر ایک مکاں نظر، لامکاں مجھے

★

پیری میں بھی کمی نہ ہوئی جھانک تانک کی
روزن کی طرح دید کا آزار رہ گیا
وہ مرغ ہے خزاں کی صعوبت سے بے خبر
آئندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا

★

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

★

ہے چارشنبہ آخرِ ماہِ صفر، چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشک بو کی ناند
جو آئے، جام بھر کے پیے، اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے، پھولوں کو جائے پھاند
غالب! یہ کیا بیاں ہے، بجز مدحِ بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت خواند
بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زر، مہر و ماہ ماند
یوں سمجھیے، کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

★

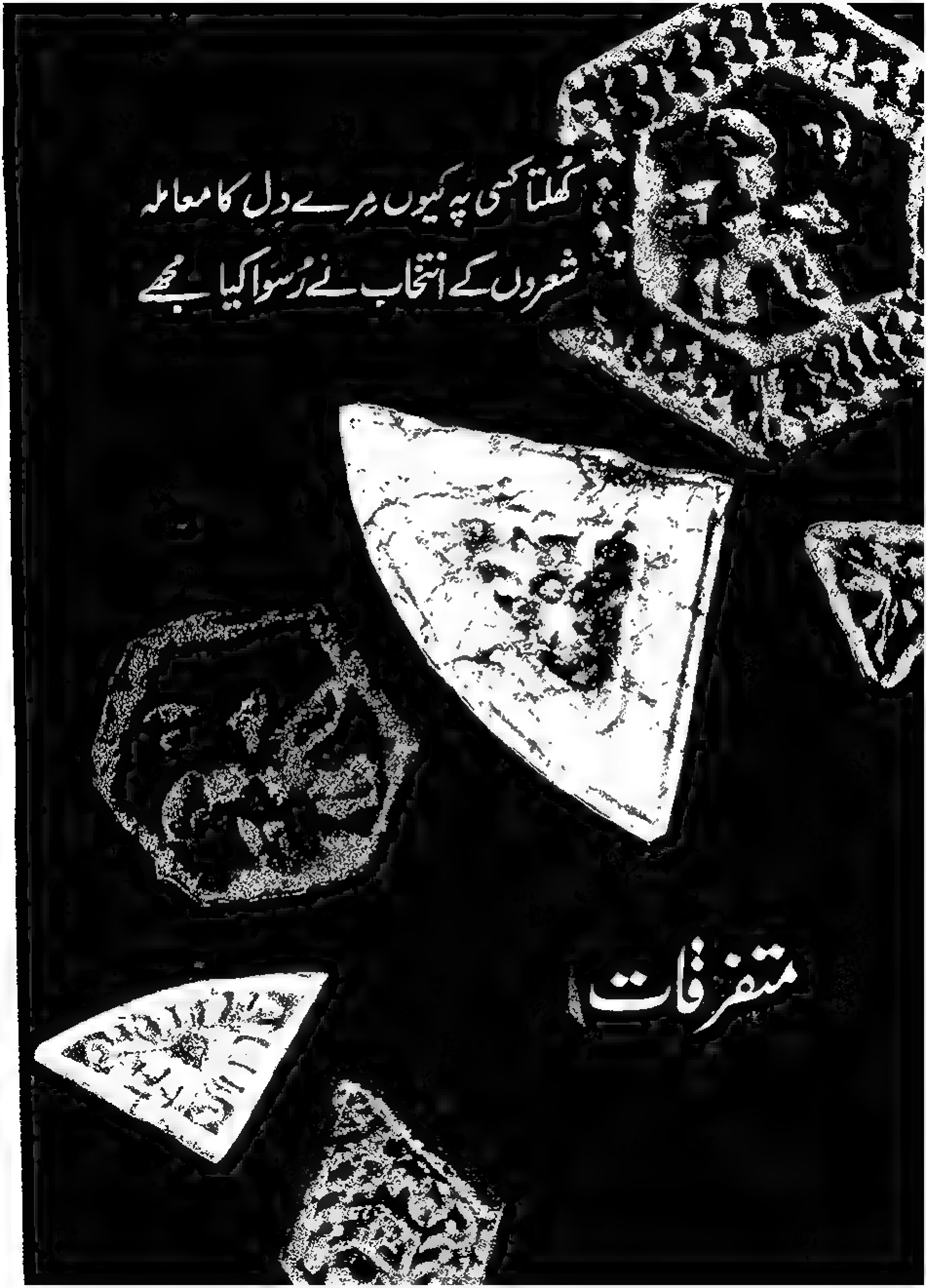
کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے
متفرقات

★

ہم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش
مجبور یہاں تلک ہوئے اے اختیار حیف!
جلتا ہے دل، کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار، حیف!

★

نہ لیوے گر خسِ جوہر، طراوت سبزہ خط سے
لگاوے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش
فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِّ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے، نکالے گر نہ خار آتش

★

جادۂ رہ خُور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

★

صفائے حیرتِ آئینہ ہے، سامانِ زنگ آخر
تغیر آبِ برجا ماندہ کا، پاتا ہے رنگ آخر
نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے، داغِ پلنگ آخر

★

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف، مِل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

سُرمۂ مفتِ نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
رُخصتِ نالہ مجھے دے، کہ مبادا ظالم!
تیرے چہرے سے ہو ظاہر، غمِ پنہاں میرا

★

لو ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو، تو مسیحا کا کیا علاج

★

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
حریفِ جوششِ دریا نہیں، خود داریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تُو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

★

مُند گئیں، کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب!
یار لائے مری بالیں پہ اسے، پر کس وقت!

★

ہندوستان کی بھی عجب سرزمین ہے
جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور
جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے
اخلاص کا ہوا ہے اسی مُلک سے ظہور
ہے اصل تخمِ ہند سے، اور اس زمین سے
پھیلا ہے سب جہان میں یہ میوہ دُور دُور

★

اسدؔ! ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو، پشت خار اپنا

★

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ، کہ سر تا سرِ خاک
گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہر بار ہنوز
یک قلم کاغذِ آتش زدہ، ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تپ گرمیِ رفتار ہنوز

★

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ اُلفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
بقدرِ ظرف ہے ساقی! خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

★

رَوندی ہوئی ہے، کوکبۂ شہریار کی
اِترائے کیوں نہ خاک، سرِ رہ گزار کی!
جب اُس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی
بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم، ولے
کیوں کر نہ کھائیے، کہ ہوا ہے بہار کی

★

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا
محبت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بُوئے گُل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ !
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

★

آئینہ دیکھ، اپنا سا منہ لے کے رہ گئے	صاحب کو دل نہ دینے پہ، کتنا غرور تھا
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اس کی خطا نہیں ہے، یہ میرا قصور تھا

★

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے!
غلامِ ساقیٔ کوثر ہو، مجھ کو غم کیا ہے!
تمھاری طرز و روش، جانتے ہیں، ہم کیا ہے!
رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے؟
سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقیں ہے، ہم کو بھی، لیکن اب اُس میں دم کیا ہے

★

لبِ خشک در تشنگی، مُردگاں کا	زیارت کدہ ہوں، دل آزردگاں کا
ہمہ نا امیدی، ہمہ بدگمانی	میں دل ہوں، فریبِ وفا خوردگاں کا

★

سیماب پشت گرمیِ آئینہ دے ہے، ہم	حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے
آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے	اے عندلیب! چل، کہ چلے دن بہار کے

★

ہے وصل ہجر، عالمِ تمکین و ضبط میں — معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے
اُس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو، ہاں — شوقِ فضول و جُراَتِ رندانہ چاہیے

★

خطر ہے، رشتۂ اُلفت رگِ گردن نہ ہو جائے
غرورِ دوستی آفت ہے، تُو دشمن نہ ہو جائے
سمجھ اِس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما، غالبؔ!
اگر گُل، سرو کے قامت پہ، پیراہن نہ ہو جائے

★

نہ پُوچھ نسخۂ مرہم، جراحتِ دل کا — کہ اُس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ، کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

★

ہم رشک کو اپنے بھی، گوارا نہیں کرتے — مرتے ہیں، ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے
در پردہ اُنھیں غیر سے، ہے ربطِ نہانی — ظاہر کا یہ پردا ہے، کہ پردا نہیں کرتے
یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے — غالبؔ کو بُرا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے

★

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو؟
یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے
مرتے مرتے، دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے ناکامی! کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے
عارضِ گُل دیکھ، روئے یار یاد آیا، اسدؔ!
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

★

★

مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے
موجِ شراب یک مژہ خواب ناک ہے

جز زخمِ تیغِ ناز، نہیں دل میں آرزو
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ
صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے

★

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

★

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے
نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے
بزمِ مے، وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا
شیشہ میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

★

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

★

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے
بے تکلف، اے شرارِ جستہ! کیا ہو جائیے
بیضہ آسا، ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

★

تغافل دوست ہوں، میرا دماغِ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے، تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، میخانہ خالی ہے

★

خموشیوں میں تماشا اَدا نکلتی ہے
نگاہِ دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے
فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے
نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

★

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

★

نشّہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے
ہم نشیں مت کہہ، کہ "برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست"
واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

★

حُسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
تاکجا، اے آگہی! رنگِ تماشا باختن؟
چشمِ وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

★

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دعا نہ مانگ
یعنی بغیرِ یک دلِ بے مدعا نہ مانگ
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب، اے خدا! نہ مانگ

★

بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر
متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا، معلوم

★

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے، مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہ ہائے زلف، کمیں میں ہیں، اے خدا!
رکھ لیجو میرے دعوئ وارستگی کی شرم

★

لوں دام بختِ خفتہ سے، یک خوابِ خوش، ولے
غالب! یہ خوف ہے، کہ کہاں سے ادا کروں؟

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

★

برشکالِ گریۂ عاشق ہے، دیکھا چاہیے
کھل گئی مانندِ گل، سو جا سے دیوارِ چمن
الفتِ گل سے غلط ہے دعوئ وارستگی
سرو ہے با وصفِ آزادی گرفتارِ چمن

★

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی، کارگر
عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

★

قیامت ہے، کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں؟"
دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے، غالب!
نہ کر سرگرم اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں

★

دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے، اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد، یاں
ہیں زوال آمادہ، اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں، ہے چراغِ رہ گزارِ باد، یاں

★

وہاں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

★

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

★

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

★

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو، پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

★

تا، ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں، گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالب! ترا احوال سُنا دیں گے ہم ان کو
وہ سُن کے بلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے
گھر میں تھا کیا، کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اِک حسرتِ تعمیر، سو ہے

★

★

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی!
دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
اُس شمع کی طرح سے، جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں، ہوں داغِ ناتمامی

★

تم اپنے شکوہ کی باتیں، نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے، کہ اس میں آگ دبی ہے
دلا! یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے، کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے، نہ آہِ نیم شبی ہے

★

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

★

رحم کر ظالم! کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا، دودِ چراغِ کشتہ ہے
دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی، سودِ چراغِ کشتہ ہے

★

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری، غالب!
ہم بھی کیا یاد کریں گے، کہ خدا رکھتے تھے

★

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ، غالب!
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

ہیں اور بھی دُنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

انتخاب

از

نسخۂ حمیدیہ

★

تنگیِ رفیقِ راہ تھی، عدم یا وجود تھا
میرا سفر بہ طالعِ چشمِ حسود تھا

پوچھا تھا گرچہ یار نے احوالِ دل، مگر
کس کو دماغِ منتِ گفت و شنود تھا

خور شبنم آشنا نہ ہوا، ورنہ میں، اسدؔ
سر تا قدم، گزارشِ ذوقِ سجود تھا

★

ہے کہاں، تمنا کا دوسرا قدم، یا رب!
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

بے دماغِ خجلت ہوں، رشکِ امتحاں تا کے
ایک بیکسی، تجھ کو عالم آشنا پایا

خاکبازیِ امید، کارخانۂ طفلی
یاس کو دو عالم سے، لب بخندہ وا پایا

★

شب نظارہ پرور تھا خواب میں خیال اس کا
صبح موجۂ گل کو نقشِ بوریا پایا

★

کارخانے سے جنوں کے بھی، میں عریاں نکلا
میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا

ساغرِ جلوۂ سرشار، ہے ہر ذرۂ خاک
شوقِ دیدار، بلا آئینہ ساماں نکلا

کچھ کھٹکتا تھا مرے سینے میں، لیکن آخر
جس کو دل کہتے تھے، سو تیر کا پیکاں نکلا

★

وسعتِ رحمتِ حق دیکھ کہ بخشا جاوے
مجھ سا کافر کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا

★

دیدہ تا دل ہے یک آئینہ چراغاں، کس نے
خلوتِ ناز پہ پیرایۂ محفل باندھا؟

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالبؔ!
ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

★

واں ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا، اسدؔ
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

★

اگر آسودگی، ہے مدعائے رنجِ بیتابی
نثارِ گردشِ پیمانۂ مے روزگا

★

ہلوائے صبح یک عالم گریباں چاکئ گل ہے
دہانِ زخم پیدا کر، اگر کھاتا ہے غم میرا

★

اسدؔ! یہ عجز و بے سامانئ فرعون توام ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے، دعویٰ ہے خدائی کا

★

ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع
شعلۂ عشق کو اپنا سروساماں سمجھا

★

نگاہِ چشمِ حاسد وام لے، اے ذوقِ خود بینی
تماشائی ہوں وحدت خانۂ آئینۂ دل کا
شررِ فرصت نگہ، سامانِ یک عالم چراغاں ہے
بقدرِ رنگ، یاں گردش میں ہے پیمانہ محفل کا
سراسر تاختن کو شش جہت یک عرصہ جولاں تھا
ہوا واماندگی سے رہرواں کی فرقِ منزل کا
مجھے راہِ سخن میں، خوفِ گمراہی نہیں، غالبؔ!
عصائے خضرِ صحرائے سخن، ہے خامہ بیدلؔ کا

★

بصورت تکلف، بمعنی تاسف
اسدؔ! میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

★

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش، در بھی دور تھا
اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا
اے وائے! غفلتِ نگہِ شوق، ورنہ یاں
ہر پارہ سنگ، لختِ دلِ کوہِ طور تھا
درسِ تپش ہے برق کو اب اس کے نام سے
وہ دل ہے یہ، کہ جس کا تخلص صبور تھا
جنت ہے تیری تیغ کے کشتوں کی منتظر
جوہر سوادِ جلوۂ مژگانِ حور تھا
ہر رنگ میں جلا اسدِ فتنہ انتظار
پروانۂ تجلیِ شمعِ ظہور تھا

★

اندازِ نالہ یاد ہیں سب مجھ کو، پر اسدؔ!
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

★

بُت پرستی ہے بہارِ نقش بندی ہائے دہر
ہر صریرِ خامہ میں یک نالۂ ناقوس تھا

★

خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا
بیکسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا

آتشِ موئے دماغِ شوق ہے تیرا تپاک
ورنہ ہم کس کے ہیں، اے داغِ تمنا! آشنا

بے دماغی شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہیں
یار تیرا جامِ مے، خمیازہ میرا آشنا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گُل نا آشنا

★

کل اسد کو ہم نے دیکھا گوشۂ غم خانہ میں
دست بر سر، سر بہ زانوئے دلِ مایوس تھا

★

رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا، ورنہ
اشارت فہم کو، ہر ناخنِ بُریدہ، ابرو تھا

★

بشغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شب ہا
سرِ تارِ نظر ہے رشتۂ تسبیحِ کوکب ہا
کرے گر فکرِ تعمیرِ خرابی ہائے دل گردوں
نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیرونِ قالب ہا
کرے ہے حسنِ خوباں پردہ میں مشاطگی اپنی
کہ ہے تہ بندیِ خط، سبزہ خط در تہِ لب ہا
اسد کو بت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے
نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں در پردہ "یارب" ہا

★

سر منزلِ ہستی سے، ہے صحرائے طلب دوُر
جو خط ہے کفِ پا پہ، سو ہے سلسلۂ پا

★

عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا   ورنہ جو چاہیے اسبابِ تمنا سب تھا

آخرِ کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا   دلِ دیوانہ، کہ وارستۂ ہر مذہب تھا

شوق سامانِ فضولی ہے، وگرنہ غالب!
ہم میں سرمایۂ ایجادِ تمنا کب تھا

★

یک گام بے خودی سے لوٹیں بہارِ صحرا   آغوشِ نقشِ پا میں کیجے فشارِ صحرا

وحشت اگر رسا ہے، بے حاصلی ادا ہے   پیمانۂ ہوا ہے، مشتِ غبارِ صحرا

دیوانگی اسد کی حسرت کشِ طرب ہے   در سر ہوائے گلشن، در دل غبارِ صحرا

★

بہ رہنِ شرم ہے باوصفِ شہرت، اہتمام اس کا
نگیں میں، جوں شرارِ سنگ، ناپیدا ہے نام اس کا
بہ امیدِ نگاہِ خاص ہوں، محمل کشِ حسرت
مبادا ہو، عناں گیرِ تغافل، لطفِ عام اس کا

اسد سودائے سرسبزی سے ہے تسلیم رنگیں تر
کہ کشتِ خشک اس کا، ابرِ بے پروا خرام اس کا

★

وردِ اسمِ حق سے، دیدارِ صنم حاصل ہوا   رشتۂ تسبیح، تارِ جادۂ منزل ہوا

عیب کا دریافت کرنا، ہے ہنرمندی، اسد!   نقص پر اپنے ہوا جو مطلع، کامل ہوا

★

اسد اربابِ فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں، لیکن نہیں مشتاقِ تحسیں کا

★

وحشی بن، صیاد نے ہم رمخوردوں کو کیا رام کیا
رشتۂ چاکِ جیبِ دریدہ، صرفِ قماشِ دام کیا
مُہر بجائے نامہ لگائی، بر لبِ پیکِ نامہ رساں
قاتلِ تمکیں سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا
شامِ فراقِ یار میں، جوشِ خیرہ سری سے ہم نے اسدؔ!
ماہ کو در تسبیحِ کواکب جائے نشینِ امام کیا

★

سیر آنسوئے تماشا ہے طلبگاروں کا
خضر مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا
پھر وہ سوئے چمن آتا ہے، خدا خیر کرے!
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا
اسدؔ اے ہرزہ درا! نالہ بہ غوغا تا چند؟
حوصلہ تنگ نہ کر بے سبب آزاروں کا

★

بہ مہرِ نامہ جو بوسہ گلِ پیام رہا
ہمارا کام ہوا اور تمھارا نام رہا
ہوا نہ مجھ سے بجز دردِ حاصلِ صیاد
بسانِ اشک گرفتارِ چشمِ دام رہا
دل و جگر تفِ فرقت سے جل کے خاک ہوئے
ولے ہنوز خیالِ وصال خام رہا
شکستِ رنگ کی لائی سحر شبِ سنبل
پہ زلفِ یار کا افسانہ ناتمام رہا
دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا
کہ شب خیال میں بوسوں کا ازدحام رہا
نہ پوچھ حال شب و روزِ ہجر کا، غالبؔ!
خیالِ زلف و رخِ دوست صبح و شام رہا

۱ ★

زندگانی نہیں بیش از نفس چند، اسدؔ!
غفلت آرامیِ یاراں پہ ہیں خنداں گلِ صبح

★

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا، ہیچ — رفتار نہیں، بیشتر از لغزشِ پا، ہیچ
حیرت ہمہ اسرار پہ مجبورِ خموشی — ہستی نہیں جز بستنِ پیمانِ وفا، ہیچ
کس بات پہ مغرور ہے، اے عجزِ تمنا! — سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا، ہیچ
آہنگِ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ
"عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما، ہیچ"

★

تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب — بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد
تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ — متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

★

ہم نے سوزِ زخمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی
گل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہانِ دار
تیغ در کف، کف بلب، آتا ہے قاتل اس طرف
مژدہ باد، اے آرزوے مرگِ غالبؔ! مژدہ باد

★

تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند — اے طفلِ خود معاملہ، قد سے عصا بلند
رکھتا ہے انتظارِ تماشائے حسنِ دوست — مژگانِ باز ماندہ سے، دستِ دعا بلند
قربان اوج ریزیِ چشمِ حیا پرست — یک آسماں ہے مرتبۂ پشتِ پا بلند
ہے دلبری کمینگرِ ایجادِ یک نگاہ — کارِ بہانہ جوئیِ چشمِ حیا بلند

★

اے چرخ! خاک بر سرِ تعمیرِ کائنات — لیکن بنائے عہدِ وفا، استوار تر

★

چشمِ بے خونِ دل و دل تہی از جوشِ نگاہ — بزباں عرضِ فسونِ ہوسِ گُل تا چند

بزم، داغِ طرب و باغ، کشادِ پرِ رنگ — شمع و گل تا کے و پروانہ و بلبل تا چند

سادگی ہے عدمِ قدرتِ ایجادِ غنا — ناکسی! آئینہ نازِ توکّل تا چند

اسدِ خستہ، گرفتارِ دو عالم اوہام
مشکل آساں کنِ یک خلق! تغافل تا چند

★

نوازشِ نفسِ آشنا کہاں، ورنہ — بہ رنگِ نے ہے نہاں در ہر استخواں فریاد

تغافل آئینہ دارِ خموشیٔ دل ہے — ہوئی ہے محو بہ تقریبِ امتحاں فریاد

ہلاکِ بے خبری، نغمۂ وجود و عدم — جہان و اہلِ جہاں سے جہاں جہاں فریاد

جوابِ سنگ دلی ہائے دشمناں، ہمّت — زدستِ شیشہ دلی ہائے دوستاں فریاد

ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسد
خدا کے واسطے، اے شاہِ بیکساں! فریاد

★

ظلم کرنا، گدائے عاشق پر — نہیں شاہانِ حسن کا دستور

دوستو! مجھ ستم رسیدہ سے — دشمنی ہے، وصال کا مذکور

زندگانی پہ اعتماد، غلط — ہے کہاں قیصر؟ اور کہاں فغفور؟

کیجے جوں اشک، اور قطرہ زنی
اے اسد! ہے ہنوز دلّی دور

★

رگِ گُل جادۂ تارِ نگہ سے حد موافق ہے
ملیں گے منزلِ اُلفت میں ہم اور عندلیب آخر

غرورِ ضبط، وقتِ نزع ٹوٹا بیقرارانہ
نیازِ بال افشانی ہوا صبر و شکیب آخر

اسد کی طرح، میری بھی، بغیر از صبحِ رخساراں
ہوئی شامِ جوانی، اے دلِ حسرت نصیب! آخر

★

کفر ہے، غیر از وفورِ شوق، رہبر خواستن
راہِ صحرائے حرم میں ہے جرسِ ناقوس و بس
یک جہاں گُل تختۂ مشقِ شگفتن ہے، اسدؔ!
غنچۂ خاطر، بہ افسردگی مانوس و بس

★

اے آرزو شہیدِ وفا! خوں بہا نہ مانگ — جز بہرِ دست و بازوئے قاتل دعا نہ مانگ
برہم ہے بزمِ غنچہ، بہ یک جنبشِ نشاط — کاشانہ بسکہ تنگ ہے، غافل! ہوا نہ مانگ
میں دور گردِ عرضِ رسومِ نیاز ہوں — دشمن سمجھ، و لے نگہِ آشنا نہ مانگ
نظارہ دیگر و دلِ خونیں نفس دگر — آئینہ دیکھ، جوہرِ برگِ حنا نہ مانگ

★

بقدرِ حوصلۂ عشق جلوہ ریزی ہے — وگرنہ خانۂ آئینہ کی فضا معلوم
بہار در گرِو غنچہ، شہر جولاں ہے — طلسمِ ناز بجز تنگیٔ قبا معلوم
طلسمِ خاک، کمیں گاہِ یک جہاں سودا — بہ مرگ تکیۂ آسائشِ فنا معلوم
اسدؔ، فریفتۂ انتخابِ طرزِ جفا
وگرنہ دلبریِ وعدۂ وفا معلوم

★

فرطِ بے خوابی سے ہیں شب ہائے ہجرِ یار میں — جوں زبانِ شمع، داغِ گرمیٔ افسانہ ہم
جانتے ہیں جوششِ سودائے زلفِ یار میں — سنبلِ بالیدہ کو موئے سرِ دیوانہ ہم
بسکہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے — چپکے چپکے جلتے ہیں، جوں شمعِ ماتم خانہ ہم

★

ازآنجا کہ حسرت کشِ یار ہیں ہم — رقیبِ تمنائے دیدار ہیں ہم
تماشائے گلشن، تمنائے چیدن — بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم
نہ ذوقِ گریباں، نہ پروائے داماں — نگاہِ آشنائے گل و خار ہیں ہم
اسدؔ! شکوہ کفر و دعا ناسپاسی
ہجومِ تمنائے لاچار ہیں ہم

★

غالبؔ! ہے رتبۂ فہم تصور سے کچھ پرے — ہے عجزِ بندگی، جو علی کو خدا کہوں

★

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا، غالبؔ! — جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

★

جائیکہ پائے سیلِ بلا درمیاں نہیں — دیوانگاں کو واں ہوسِ خانماں نہیں

★

ناگوار ہے ہمیں احسانِ صاحب دولتاں — ہے زرِ گل بھی نظر میں جوہرِ فولادیاں
قطرہ ہائے خونِ بسمل زیبِ داماں ہیں اسدؔ — ہے تماشا کردنی، گل چینیٔ جلادیاں

★

ہے نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چمن — قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن
وقت ہے گر بلبلِ مسکیں زلیخائی کرے — یوسفِ گل جلوہ فرما ہے بہ بازارِ چمن

★

پھر حلقۂ کاکل میں پڑیں دید کی راہیں — جوں دود فراہم ہوئیں روزن میں نگاہیں
پایا سرِ ہر ذرّہ، جگر گوشۂ وحشت — ہیں داغ سے معمور شقایق کی کلاہیں
دیر و حرم، آئینۂ تکرارِ تمنا — واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

★

تمیزِ زشتی و نیکی میں لاکھ باتیں ہیں
بہ عکسِ آئینہ یک فرد سادہ رکھتے ہیں
بہ زاہداں رگِ گردن ہے رشتۂ زنّار
سرے بہ پائے بتِ نا نہاد رکھتے ہیں

سودائے عشق سے، دمِ سردِ کشیدہ ہوں
شامِ خیالِ زلف سے، صبحِ دمیدہ ہوں
دورانِ سر سے گردشِ ساغر ہے متصل
خمخانۂ جنوں میں دماغِ رسیدہ ہوں

کی متصل ستارہ شماری میں عمر صرف
تسبیحِ اشکہائے ز مژگاں چکیدہ ہوں
ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں
جوں شانہ پشتِ دست بدنداں گزیدہ ہوں
ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں
دیتا ہوں کشتگاں کو، سخن سے سرِ تپش
مضرابِ تارہائے گلوئے بریدہ ہوں
ہے جنبشِ زباں بہ دہن، سخت ناگوار
خوں نابۂ ہلاہلِ حسرت چشیدہ ہوں
جوں بوئے گل ہوں گرچہ، گراں بارِ شتہ ذر
لیکن، اسدؔ! بوقتِ گزشتن جریدہ ہوں

اے نوا سازِ تماشا! سر بکف جلتا ہوں میں
اک طرف جلتا ہے دل، اور اک طرف جلتا ہوں میں
ہے تماشا گاہِ سوزِ تازہ، ہر یک عضوِ تن
جوں چراغانِ دِوالی صف بصف جلتا ہوں میں
شمع ہوں، تو بزم میں جا پاؤں غالب کی طرح
بے محل، اے مجلس آرائے نجف! جلتا ہوں میں

★

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں — برنگِ جادہ سرِ کوئے یار رکھتے ہیں
جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے، غالبؔ! — بسانِ دشتِ دلِ پُر غبار رکھتے ہیں

★

زلفِ خیال نازک و اظہار بے قرار — یارب! بیانِ شانہ کشِ گفتگو نہ ہو

★

ہر داغِ تازہ، یک دلِ داغ انتظار ہے — عرضِ فضائے سینۂ دردِ امتحاں نہ پوچھ
کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے، بسوزِ دل — "دردِ جدائیٔ اسد اللہ خاں نہ پوچھ"

★

خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ — ورنہ ہے چرخ و زمیں یک ورقِ گرداندہ
میکدے میں نہ دل افسردگیٔ بادہ کشاں — موجِ مے، مثلِ خطِ جام، ہے برجا ماندہ
خواہشِ دل ہے زباں کو، سببِ گفت و بیاں — ہے سخن گرد زدامانِ ضمیر افشاندہ
کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے — ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

حیف ہے حاصلیِ اہلِ ریا پر غالبؔ!
یعنی ہیں ماندہ زآں سو و ازیں سو راندہ

★

ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں
کب تلک پھیرے اسدؔ لبہائے تفتہ پر زباں
طاقتِ لب تشنگی، اے ساقیِ کوثر! نہیں

کی ہے وا اہلِ جہاں نے بہ گلستانِ جہاں
چشمِ غفلت نظرِ شبنم خورِ نادیدہ

یاس آئینۂ پیدائیِ استغنا ہے
نا اُمیدی ہے پرستارِ دلِ رنجیدہ

واسطے فکرِ مضامینِ متیں کے، غالب
چاہیے خاطرِ جمع و دلِ آرامیدہ

شکوہ و شکر کو ثمر، بیم و اُمید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب، دل نہ سمجھ بلا سمجھ

وحشتِ دردِ بیکسی، بے اثر اس قدر نہیں
رشتۂ عمرِ خضر کو نالۂ نارسا سمجھ

گاہ بہ خلد اُمیدوار، گہ بہ جحیم بیمناک
گرچہ خدا کی یاد ہے کلفتِ ماسوا سمجھ

اے بہ سرابِ تحسینِ خلق تشنۂ سعیِ امتحاں
شوق کو منفعل نہ کر، ناز کو التجا سمجھ

کلفتِ ربطِ این و آں، غفلتِ مدعا سمجھ
شوق کرے جو سرگراں محملِ خواب پا سمجھ

جلوہ نہیں ہے دردِ سر آئینہ صندلی نہ کر
عکسِ کجا و گو نظر، نقش کو مدعا سمجھ

ہے خطِ عجزِ ما و تو، اوّل درسِ آرزو
ہے یہ سیاقِ گفتگو، کچھ نہ سمجھ، فنا سمجھ

شیشہ شکستِ اعتبار، رنگ بہ گردش استوار
گرد نشیں یہ کوہسار، آپ کو تو صدا سمجھ

نغمہ ہے محوِ ساز رہ، نشہ ہے بے نیاز رہ
رند تمام ناز رہ، خلق کو پارسا سمجھ

نے سر و برگِ آرزو، نے رہ و رسمِ گفتگو
اے دل و جانِ خلق تو، ہم کو بھی آشنا سمجھ

ہستی فریب نامۂ موجِ سراب ہے
یک عمر نازِ شوخیِ عنواں اُٹھائیے

کیا پوچھے ہے برخود غلطی ہائے عزیزاں
خواری کو بھی اک عار ہے عالی نسبوں سے

گو تم کو رضا جوئیِ اغیار ہے، لیکن
جاتی ہے ملاقات کب ایسے سببوں سے

مت پوچھ اسدؔ! وعدۂ کم فرصتیِ زیست
وہ دن بھی جو کاٹے تو قیامت تعبوں سے

★

لغزشِ پا کو ہے بلد، نعرۂ یا علی! مدد،
ٹوٹے گر آئینہ، اسدؔ! سبحہ کو خوں بہا سمجھ

★

کیا غم ہے اُس کو، جس کا علی سا امام ہو
اتنا بھی اے فلک زدہ کیوں بے حواس ہے؟

★

نظر بہ نقصِ گدایاں، کمالِ بے ادبی ہے
کہ خارِ خشک کو بھی دعوائے چمن نسبی ہے

ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ
لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے

خوشا وہ دل! کہ سراپا طلسمِ بے خبری ہو
جنون و یاس و الم رزقِ مدعا طلبی ہے

چمن میں کس کے یہ برہم ہوئی ہے بزمِ تماشا؟
کہ برگ برگِ سمن، شیشہ ریزۂ حلبی ہے

امامِ ظاہر و باطن، امیرِ صورت و معنی
علی ولی اسد اللہ، جانشینِ نبی ہے

★

بے چشمِ دل نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار
یعنی یہ ہر ورق، ورقِ انتخاب ہے

★

تا چند پستِ فطرتیِ طبعِ آرزو
یارب ملے بلندیِ دستِ دعا مجھے

یک بار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے
اے جوشِ عشق! بادۂ مرد آزما مجھے

★

گر مصیبت تھی، تو غربت میں اٹھا لیتے، اسدؔ!
میری دلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری، ہائے ہائے

★

مجھے معلوم ہے، جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد، اے گردشِ گردونِ دوں! وہ بھی

★

ہوسکے کب کلفتِ دل، مانعِ طوفانِ اشک!
گردِ ساحل سنگِ راہِ جوششِ دریا نہیں
ہے طلسمِ دہر میں، صد حشرِ پاداشِ عمل
آگہی غافل، کہ یک امروز بے فردا نہیں
بسمل اس تیغِ دو دستی کا نہیں بچتا، اسدؔ!
عافیت بیزار! شغلِ کعبتین اچھا نہیں

★

باعثِ واماندگی ہے عمرِ فرصت جو مجھے
کردیا ہے پابہ زنجیرِ رمِ آہو مجھے

★

کہوں کیا گرم جوشی میکشی میں شعلہ رویاں کی!
کہ شمعِ خانۂ دل آتشِ مے سے فروزاں کی
سبب اپنے جنوں کی بے تکلف پردہ داری تھی
ولیکن کیا کروں، آوے جو رسوائی گریباں کی
ہوا شرمِ تہی دستی سے وہ بھی سرنگوں آخر
بس، اے زخمِ جگر! اب دیکھ لی شورش نمکداں کی
بیادِ گرمیِ صحبت، برنگِ شعلہ، دہکے ہے
چھپاؤں کیونکہ، غالبؔ! سوزشیں داغِ نمایاں کی

ہو جہاں، تیرا دماغِ ناز، مستِ بیخودی — خوابِ نازِ گل رُخاں، دودِ چراغِ کشتہ ہے

وہ دیکھ کے حُسن اپنا، مغرور ہوا غالب! — صد جلوۂ آئینہ، یک صبحِ جُدائی ہے

ہم مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے، اسد! — لائق نہیں رہے ہیں، غمِ روزگار کے

اسد! بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو، تو دکھلا دوں کہ یک عالم گلستاں ہے

اسد! جمعیتِ دل در کنارِ بے خودی خوش تر
دو عالم آگہی سامانِ یک خوابِ پریشاں ہے

عاشق نقابِ جلوۂ جانانہ چاہیے — فانوسِ شمع کو پرِ پروانہ چاہیے
ساقی! بہارِ موسمِ گُل ہے سرور بخش — پیماں سے ہم گزر گئے، پیمانہ چاہیے

وقت اس اُفتاد کا خوش جو قناعت سے اسد!
نقشِ پائے مور کو تختِ سلیمانی کرے

آتش افروزیِ یک شعلۂ ایماں تجھ سے — چشمک آرائیِ صد شہرِ چراغاں مجھ سے
اے اسد! دسترسِ وصلِ تمنا معلوم — کاش، ہو قدرتِ برچیدنِ داماں مجھ سے

بہ تنگی ہائے قیدِ زندگی، معلوم آزادی — شرر در بندِ دامِ رشتۂ رگہائے خارا ہے

بسکہ ویرانی سے کفر و دیں ہوئے زیر و زبر — گردِ صحرائے حرم تا کوچۂ زنار ہے
اے سرِ شوریدہ نازِ عشق و پاسِ آبرو — یک طرف سودا و یک سو منتِ دستار ہے

★

بہ ذوقِ شوخیِ اعضا تکلف بارِ بستر ہے
معافِ پیچ و تابِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
رہ دور [illegible] رہ و دل ناتواں و آرزو مضطر
بپائے خفتہ سیرِ وادیِ پرخار بستر ہے

★

ہو سکے کیا خاک دست و بازوئے فرہاد سے
بے ستوں خوابِ گرانِ خسرو پرویز ہے

★

[illegible] سامانی مجھے — موجِ گردابِ حیا ہے چینِ پیشانی مجھے
شوقِ [illegible] آمادہ — ہے گریباں گیرِ فرصت ذوقِ عریانی مجھے

★

[illegible] — [illegible] کوکب مجھے
[illegible] — [illegible] وسعتِ شب مجھے

★

[illegible] حیات — [illegible] و قامت ہے

★

تماشائے جلوہ [illegible] کب تک
آئینۂ حیراں کو دیکھا کرے کوئی

★

پیامِ تعزیت پیدا ہے، اندازِ عیادت سے
شبِ ماتم تہِ دامانِ دُودِ شمعِ بالیں ہے
غم و عشرت قدم بوسِ دلِ تسلیم آئیں ہے
دُعائے مدّعا گم کردگانِ عشق "آمیں" ہے

★

بزمِ ہستی وہ تماشا ہے، کہ جس کو ہم، اسدؔ!
دیکھتے ہیں چشم از خوابِ عدم نکشادہ سے

★

عبرت طلب ہے حلِّ معمّائے آگہی
شبنم گدازِ آئینۂ اعتبار ہے
خجلت کشِ وفا کو، شکایت نہ چاہیے
اے مدّعی! طلسمِ عرق بے غبار ہے

★

کیا ہے ترکِ دنیا کاہلی سے
ہمیں حاصل نہیں، بے حاصلی سے
پُراَفشاں ہو گئے شعلے ہزاروں
رہے ہم داغ، اپنی کاہلی سے
خدا، یعنی پدر سے مہرباں تر
پھرے ہم دربدر، ناقابلی سے

★

جنوں افسردہ و جاں ناتواں، اے جلوہ! شوخی کر
گئی یک عمرِ خودداری، بہ استقبالِ رعنائی
نگاہِ عبرت افسوں، گاہ برق و گاہ مشعل ہے
ہوا ہر خلوت و جلوت سے حاصل، ذوقِ تنہائی

★

رشک ہے آسایشِ اربابِ غفلت پر اسدؔ	پیچ و تابِ دل، نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

★

نے حسرتِ تسلّی، نہ ذوقِ بیقراری	یک درد و صد دوا ہے، یک دست و صد دعا ہے
بُت خانہ میں اسدؔ بھی بندہ تھا گاہ گاہے	حضرت چلے حرم کو، اب آپ کا خدا ہے

★

خانمانِ جبریانِ غفلتِ معنی خراب	جب ہوئے ہم بے گنہ، رحمت کی کیا تقصیر ہے؟
چاہیے گر جنّت، جز آدم وارثِ آدم نہیں	شوخیِ ایمانِ زاہد، سستیِ تدبیر ہے

آب ہو جاتے ہیں ننگِ ہمّتِ باطل سے مرد
اشک پیدا کر، اسدؔ! گر آہ بے تاثیر ہے

★

یقیں ہے آدمی کو دستگاہِ فقر حاصل ہو	دمِ تیغِ توکّل سے اگر پائے سبب کاٹے

★

خبر نگہ کو نگہ، چشم کو عدو جانے	وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے
نفس بہ نالہ رقیب و نگہ بہ اشک عدو	زیادہ اُس سے گرفتار ہوں، کہ تو جانے
زباں سے عرضِ تمنّائے خامشی معلوم	مگر وہ خانہ برانداز "گفتگو" جانے

★

گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے		کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے
فسردگی میں ہے فریادِ بیدلاں تجھ سے		چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے
بہارِ حیرتِ نظّارہ سخت جانی ہے		حنائے پائے اجل خونِ کشتگاں تجھ سے
طراوتِ سحر ایجادیِ اثر یک سُو		بہارِ نالہ و رنگینیِ فغاں تجھ سے
چمن چمن گلِ آئینہ در کنارِ ہوس		اُمید محوِ تماشائے گلستاں تجھ سے
نیاز، پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے		جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے آستاں تجھ سے
بہانہ جوئیِ رحمت، کمیں گرِ تقریب		وفائے حوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے

اسدؔ! بہ موسمِ گل در طلسمِ کنجِ قفس
خرام تجھ سے صبا تجھ سے گلستاں تجھ سے

★

چار سوئے عشق میں صاحب دکانی مفت ہے
نقد ہے داغِ دل اور آتش زبانی مفت ہے
چونکہ بالائے ہوس پر ہر قبا کوتاہ ہے
بر ہوسہائے جہاں دامن فشانی مفت ہے

★

اسدؔ! جاں نذرِ الطافے، کہ ہنگامِ ہم آغوشی
زبانِ ہر سرِ مُو، حالِ دل پرسیدنی جانے

★

کچھ نہیں حاصل تعلق میں، بغیر از کشمکش		اے خوشا رندے! کہ مرغِ گلشنِ تجرید ہے
کثرتِ اندوہ سے حیران و مضطر ہے اسدؔ		یا علی! وقتِ عنایات و دمِ تائید ہے

★

دو جہاں گردشِ یک سبحۂ اسرارِ نیاز	نقدِ صد دل، بہ گریبانِ سحر پنہاں ہے
خلوتِ دل میں نہ کر دخل، بجز سجدۂ شوق	آستاں میں، صفتِ آئینہ، در پنہاں ہے

★

نظر پرستی و بے کاری و خود آرائی	رقیبِ آئینہ، ہے حیرتِ تماشائی
خرابِ نالۂ بلبل، شہیدِ خندۂ گل	ہنوز دعوئ تمکین و بیمِ رسوائی
ہزار قافلۂ آرزو، بیاباں مرگ	ہنوز محملِ حسرت بہ دوشِ خود رائی

وداعِ حوصلہ، توفیقِ شکوہ، عجزِ وفا
اسدؔ! ہنوز گمانِ غرورِ دانائی

★

بادشاہی کا، جہاں یہ حال ہو، غالبؔ! تو پھر
کیوں نہ دلّی میں، ہر اک ناچیز نوابی کرے

★

صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے	غافلاں! آغازِ کار، آئینۂ انجام ہے

★

اے خوشا وقتے! کہ ساقی یک خمستاں وا کرے
تار و پودِ فرشِ محفل، پنبۂ مینا کرے
توڑ بیٹھے، جب کہ ہم جام و سبو، پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام، گر برسا کرے

★

کشودِ غنچۂ دل ہا عجب نہ رکھ، غافل!	صبا خرامئ خوباں، بہارِ ساماں ہے
اسدؔ! جہاں کہ علیؑ بر سرِ نوازش ہو	کشادِ عقدۂ دشوار کار آساں ہے

★

بہ رہنِ ضبط ہے آئینہ بندیِ گوہر
دگرنہ بحر میں ہر قطرہ چشمِ پُرنم ہے

اگر نہ ہووے رگِ خواب صرفِ شیرازہ
تمام دفترِ ربطِ مزاج برہم ہے

اسد! یہ نازکیِ طبعِ آرزو، انصاف
کہ ایک وہمِ ضعیف و غمِ دو عالم ہے

★

دام گاہِ عجز میں سامانِ آسائش کہاں!
پرفشانی بھی فریبِ خاطرِ آسودہ ہے

اے ہوس! عرضِ بساطِ نازِ مشتاقی نہ مانگ
جوں پرِ طاؤس، چندیں داغِ خشکِ اندوہ ہے

کیا کہوں پرواز کی آوارگی کی کشمکش!
عافیت سرمایۂ بال و پرِ نکشودہ ہے

جس طرف سے آئے ہیں آخر اُدھر ہی جائیں گے
مرگ سے وحشت نہ کر، راہِ عدم پیمودہ ہے

پنبۂ مینائی ہی رکھ لو تم اپنے کان میں
مے پرستاں! ناصحِ بیعرفہ گو، بیہودہ ہے

★

رکھ فکرِ سخن میں تو معذور مجھے، غالب
یاں زورقِ خودداری طوفانیِ معنی ہے

★

رنجشِ یارِ مہرباں، عیش و طرب کا ہے نشاں
دل سے اُٹھے ہے جو غبار، گردِ سوادِ باغ ہے
شعر کی فکر کو اسدؔ! چاہیئے ہے دل و دماغ
عُذر، کہ یہ فسردہ دل بے دل و بے دماغ ہے

★

شمع آسا، چہ سرِ دعویٰ و گو پائے ثبات؟
گُلِ صد شعلہ، بہ یک جیبِ شکیبائی ہے
بوئے گُل فتنۂ بیدارِ چمن، جامۂ خواب
وصل بر رنگِ تپش، کسوتِ رسوائی ہے

★

نوائے خفتۂ اُلفت اگر بیتاب ہو جاوے
پرِ پروانہ، تارِ شمع پر مضراب ہو جاوے
بہ رنگِ گُل، اگر شیرازہ بندِ بیخودی رہیے
ہزار آشفتگی مجموعۂ یک خواب ہو جاوے
اسدؔ! باوصفِ عجز، بے تکلّف خاک گردیدن
غضب ہے گر غبارِ خاطرِ احباب ہو جاوے

★

تا چند، نازِ مسجد و بت خانہ کھینچیے
جوں شمع، دل بہ خلوتِ جانانہ کھینچیے
عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے
ہے ذوقِ گریہ، عزمِ سفر کیجیے اسدؔ
رختِ جنونِ سیل بہ ویرانہ کھینچیے

★

دامانِ دل بہ وہمِ تماشا نہ کھینچیے   اے مدّعی! خجالتِ بے جا نہ کھینچیے
گُل سر بہ سر اشارۂ جیبِ دریدہ ہے   نازِ بہار، جز بہ تقاضا نہ کھینچیے
حیرت، حجابِ جلوہ و وحشت غبارِ راہ   پائے نظر بہ دامنِ صحرا نہ کھینچیے
واماندگی، بہانہ و دلبستگی، فریب   دردِ طلب بہ آبلۂ پا نہ کھینچیے

خود نامہ بن کے جایئے، اُس آشنا کے پاس
کیا فائدہ کہ منّتِ بے گانہ کھینچیے

★

دلِ آگاہ، تسکیں خیزِ بیدردی نہ ہو یا رب   نفس، آئینہ دارِ آہِ بے تاثیر بہتر ہے
خدایا! چشم تا دل دردہے افسونِ آگاہی   نگہ حیرت سوادِ خوابِ بے تعبیر بہتر ہے
درونِ جوہرِ آئینہ، جوں برگِ حنا خوں ہے   بتاں! نقشِ خود آرائی، حیا تحریر بہتر ہے

★

دریوزۂ ساماں ہا، اے بے سر و سامانی!   ایجادِ گریباں ہا، در پردۂ عُریانی
تمثالِ تماشا ہا، اقبالِ تمنّا ہا   عجزِ عرقِ شرمے، اے آئینہ! حیرانی
دعوائے جنوں باطل، تسلیم عبث حاصل   پروازِ فنا مشکل، میں عجزِ تن آسانی
بیگانگیِ خُو ہا، موجِ رمِ آہُو ہا   دامِ گلۂ اُلفت، زنجیرِ پشیمانی
پروازِ تپش رنگے، گلزارِ ہمہ تنگے   خوں ہو قفسِ دل میں، اے ذوقِ پر افشانی!
سنگ آمد و سخت آمد، دردِ سرِ خودداری   معذورِ سبکساری، مجبورِ گراں جانی

گلزارِ تمنّا ہوں، گلچینِ تماشا ہوں
صد نالہ اسدؔ بلبل، دربندِ زباں دانی

★

بوقتِ کعبہ جوئی ہا جرس کرتا ہے ناقوسی
کہ صحرا فصلِ گُل میں رشک ہے بتخانۂ چیں کا

★

جامِ ہر ذرّہ ہے سرشارِ تمنّا مجھ سے　　کس کا دل ہوں؟ کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے
جوشِ فریاد سے لوں گا دیتِ خواب، اسدؔ!　　شوخیِ نغمۂ بیدلؔ نے جگایا ہے مجھے

★

نہ انشا معنیِ مضموں، نہ املا صورتِ موزوں
عنایت نامہائے اہلِ دنیا ہرزہ عنواں ہیں
مگر آتش ہمارا کوکبِ اقبال چمکا دے
وگرنہ مثلِ خارِ خشک، مردودِ گلستاں ہیں
اسدؔ! بزمِ تماشا میں، تغافل پردہ داری ہے
اگر ڈھانپے، تو آنکھیں ڈھانپ، ہم تصویرِ عریاں ہیں

★

ہم زانوئے تامل و ہم جلوہ گاہِ گُل　　آئینہ بندِ خلوت و محفل ہے آئینہ
دل کارگاہِ فکر و اسدؔ بینوائے دل　　یاں سنگِ آستانۂ بیدلؔ ہے آئینہ

★

تیز تر ہوتا ہے خشمِ تند خویاں عجز سے
ہے رگِ سنگِ فسانِ تیغِ شعلہ، خار و خس

سختیٔ راہِ محبت، منعِ دخلِ غیر ہے
پیچ و تابِ جادہ، ہے یاں جوہرِ تیغِ عسس

اے اسدؔ ہم خود اسیرِ رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہرا صیادِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس

★

کرتے ہو شکوہ کس کا؟ تم اور بے وفائی
سر پیٹتے ہیں اپنا، ہم اور نیک نامی

ہر چند عمر گذری آزردگی میں، لیکن
ہے شرحِ شوق کو بھی، جوں شکوہ ناتمامی

ہے یاس میں اسدؔ کو ساقی سے بھی فراغت
دریا سے خشک گذرے مستوں کی تشنہ کامی

★

عروجِ نشہ ہے سر تا قدم، قدِ چمن رویاں
بجائے خود و گرنہ سرو بھی مینائے خالی ہے

برستی ہے اہلِ خاک کو ابرِ بہاری سے
زمیں جوشِ طرب سے جامِ لبریزِ سفالی ہے

اسدؔ اٹھنا قیامت قامتوں کا، وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں، بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

تمام شد

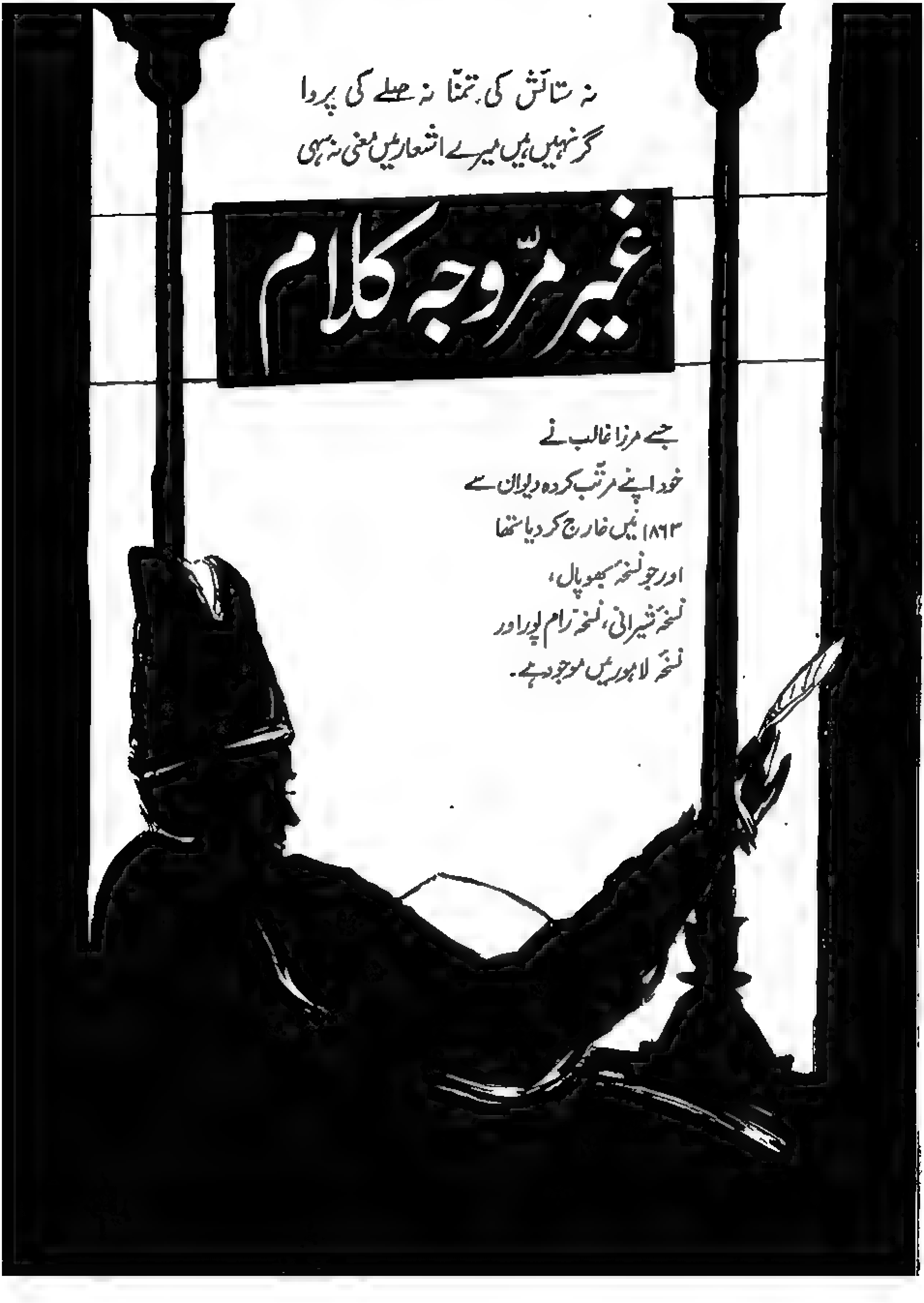

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی
غیر مروّجہ کلام
جسے مرزا غالب نے
خود اپنے مرتب کردہ دیوان سے
۱۸۶۳ میں خارج کر دیا تھا
اور جو نسخۂ بھوپال،
نسخۂ شیرانی، نسخۂ رام پور اور
نسخۂ لاہور میں موجود ہے۔

★

بجز دیوانگی ہوتا نہ انجامِ خود آرائی
اگر پیدا نہ کرتا آئینہ زنجیر جوہر کی
مرا دل مانگتے ہیں عاریت اہلِ ہوس شاید
یہ جایا چاہتے ہیں آج دعوت میں سمندر کی
غرورِ لطفِ ساقی نشۂ بے باکیِ مستاں
نمِ دامانِ عصیاں ہے طراوت موجِ کوثر کی
اسدؔ جز آب بخشیدن ز دریا خضر کو کیا تھا؟
ڈبوتا چشمۂ حیواں میں گر کشتی سکندر کی

★

نوائے خفتۂ الفت، اگر بے تاب ہو جاوے
پرِ پروانہ تارِ شمع پر مضراب ہو جاوے
اگر وحشت عرق افشانِ بے پروا خرامی ہو
بیاضِ دیدۂ آہو، کفِ سیلاب ہو جاوے
زبس طوفانِ آب و گل ہے غافل کیا تعجب ہے
کہ ہر یک گردِ بادِ گلستاں گرداب ہو جاوے
اثر میں یاں تک اے دستِ دعا حق تصرف کر
کہ سجدہ قبضۂ تیغِ خمِ محراب ہو جاوے
بہ رنگِ گل، اگر شیرازہ بندِ بے خودی رہیے
ہزار آشفتگی مجموعۂ یک خواب ہو جاوے
اسدؔ با وصفِ مشقِ بے تکلف خاک گردیدن
غضب ہے، گر غبارِ خاطرِ احباب ہو جاوے

★

تشنۂ خونِ تماشا جو وہ پانی مانگے
آئینہ رخصتِ اندازِ روانی مانگے

رنگ سے گل سے دمِ عرضِ پریشانیٔ بزم
برگِ گل ریزۂ مینا کی نشانی مانگے

ہوں گرفتارِ کمیں گاہِ تغافل کہ جہاں
خوابِ صیاد سے پروازِ گرانی مانگے

وحشتِ شورِ تماشا ہے کہ جوں نکہتِ گل
نمکِ زخمِ جگر بال فشانی مانگے

گر ملے حضرتِ بیدل کا خطِ لوحِ مزار
اسدؔ آئینۂ پروازِ معانی مانگے

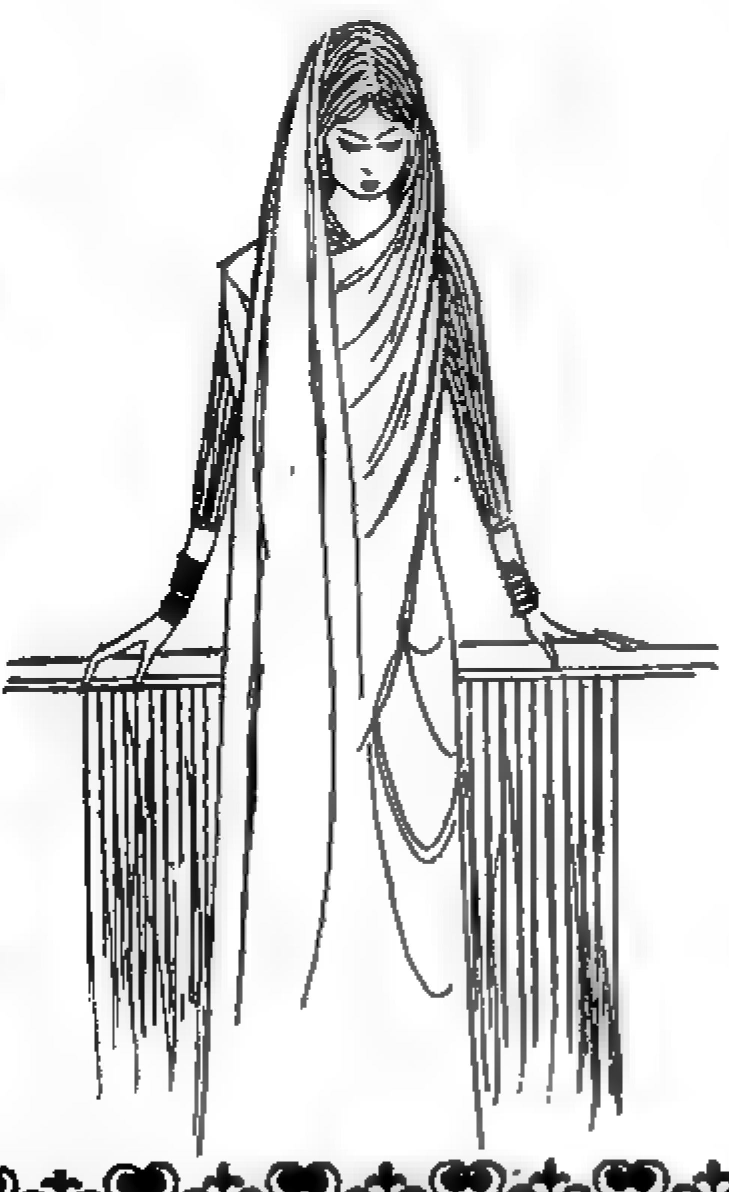

شکلِ طاؤس، گرفتار بنایا ہے مجھے
ہوں وہ گلدام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

پرِ طاؤس، تماشا نظر آیا ہے مجھے
ایک دل تھا کہ بصد چشم دکھایا ہے مجھے

عکسِ خط تا سخنِ ناصحِ دانا سرسبز
آئینہ، بیضۂ طوطی نظر آیا ہے مجھے

سنبلستانِ جنوں ہوں، ستم نسبتِ زلف
موکشاں خانۂ زنجیر میں لایا ہے مجھے

گردباد، آئینۂ محشرِ خاکِ مجنوں
یک بیاباں دلِ بیتاب اٹھایا ہے مجھے

لالہ و گل بہم آئینۂ اخلاقِ بہار
ہوں میں وہ داغ کہ پھولوں میں بسایا ہے مجھے

بے دماغِ تپشِ و عرضِ دو عالم فریاد
ہوں میں وہ خاک کہ ماتم میں اڑایا ہے مجھے

جوشِ فریاد سے لوں گا دیتِ خواب اسدؔ
شوخیٔ نغمۂ بیدل نے جگایا ہے مجھے

★

شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیری دل بیتاب تھا
شوخیِ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا
گرمیِ برقِ تپش سے زہرۂ دل آب تھا
شعلۂ جوالہ، ہر یک حلقۂ گرداب تھا
لے زمیں سے آسماں تک فرشِ تھیں بے تابیاں
شوخیِ بارش سے مہ، فوارۂ سیماب تھا
واں ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ
ناخنِ غم، یاں سرِ تارِ نفس، مضراب تھا

★

آفتِ آہنگ ہے کچھ نالۂ بلبل ورنہ
پھول ہنس ہنس کے گلستاں میں فنا ہو جاتا
کاش! نا قدر نہ ہوتا ترا اندازِ خرام
میں غبارِ سرِ دامانِ فنا ہو جاتا
منتقل مرکزِ غم پہ ہی نہیں تھے ورنہ
ہم کو اندازۂ آئینِ وفا ہو جاتا
دستِ قدرت ہے مرا خشت بہ دیوارِ فنا
گر فنا بھی میں نہ ہوتا تو فنا ہو جاتا

★

کارخانے سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا
میری قسمت کا نہ اک آدھ گریباں نکلا
ساغرِ جلوۂ سرشار ہے ہر ذرۂ خاک
شوقِ دیدار بلا آئینہ ساماں نکلا
کچھ کھٹکتا تھا مرے سینے میں لیکن آخر
جس کو دل کہتے تھے سو تیر کا پیکاں نکلا
کس قدر خاک ہوا ہے دلِ مجنوں یا رب
نقشِ ہر ذرہ سویدائے بیاباں نکلا
شورِ رسوائیِ دل دیکھ کہ یک نالۂ شوق
لاکھ پردے میں چھپا پر وہی عریاں نکلا
شوخیِ رنگِ حنا خونِ وفا سے کب تک
آخر اے عہد شکن تو بھی پشیماں نکلا
میں بھی معذورِ جنوں ہوں اسدؔ اے خانہ خراب
پیشوا لینے مجھے گھر سے بیاباں نکلا

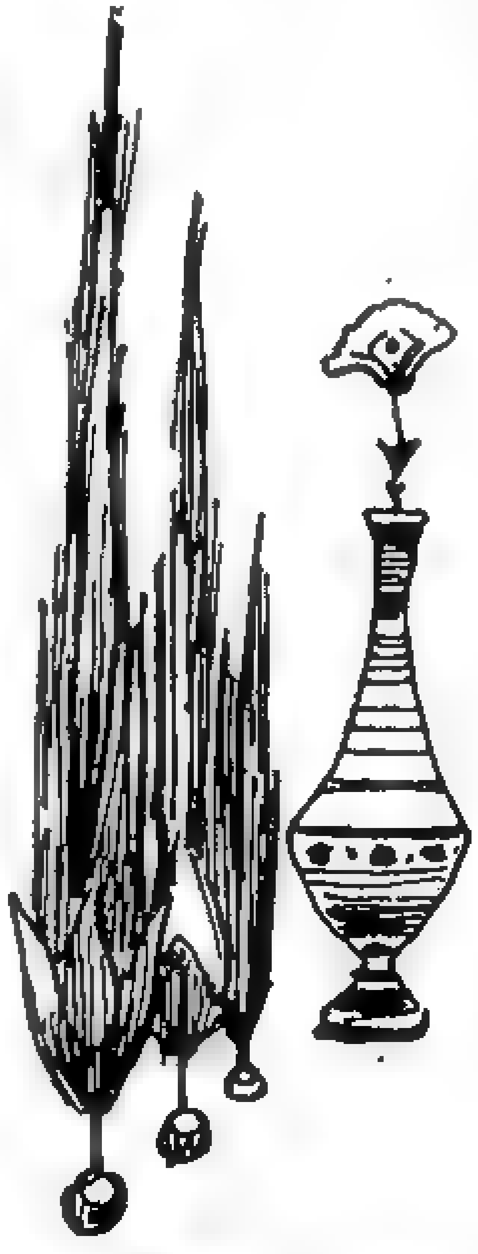

★

وحشت کہاں کہ بے خودی انشا کرے کوئی؟
ہستی کو لفظِ معنیِ عنقا کرے کوئی

جو کچھ ہے، محوِ شوخیِ ابروئے یار ہے
آنکھوں کو رکھ کے طاق پہ دیکھا کرے کوئی

عرضِ سرشک پر ہے، فضائے زمانہ تنگ
صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی

وہ شوخ اپنے حُسن پہ مغرور ہے، اسدؔ
دکھلا کے اس کو آئینہ توڑا کرے کوئی

★

بس کہ مائل ہے وہ رشکِ ماہتاب آئینے پر
ہے نفس تارِ شعاعِ آفتاب آئینے پر

بازگشتِ جادہ پیمائی رہِ حیرت کہاں؟
غافلاں، غش جان کر چھڑکے ہیں آب آئینے پر

بدگماں کرتی ہے عاشق کو خود آرائی تری
بے دلوں کو ہے براتِ اضطراب آئینے پر

مدعی میری صفائی دل سے ہوتا ہے خجل
ہے تماشا زشت رویوں کا عتاب آئینے پر

نازِ خودبینی کے باعث مجرمِ صد بے گناہ
جوہرِ شمشیر کو ہے پیچ و تاب آئینے پر

سدّ اسکندر بنے بہرِ نگاہِ گلرخاں
گر کرے یوں امرِ نہی کو تراب آئینے پر

دل کو تڑپا جوشِ بے تابی سے غالبؔ کیا کیا؟
رکھ دیا پہلو بہ وقتِ اضطراب آئینے پر

★

صبح ہے معلوم، آثارِ ظہورِ شام ہے
غافلاں، آغازِ کار، آئینۂ انجام ہے

بس کہ ہیں صیاد راہِ عشق میں محوِ کمیں
جادۂ رہ سربسر، مژگانِ چشمِ دام ہے

بس کہ تیرے جلوۂ دیدار کا ہے اشتیاق
ہر بتِ خورشید طلعت، آفتابِ بام ہے

مستعدِ قتلِ یک عالم ہے جلادِ فلک
کہکشاں موجِ شفق میں تیغِ خوں آشام ہے

کیا کمالِ عشق نقص آبادِ گیتی میں ملے
پختگی ہائے تصور، یاں خیالِ خام ہے

ہو جہاں وہ ساقیِ خورشید رو مجلس فروز
واں، اسدؔ، تارِ شعاعِ مہر خطِ جام ہے

★

معزولیِ تپش ہوئی افراطِ انتظار
چشمِ کشادہ حلقۂ بیرونِ در ہے آج

حیرت فروشِ صد نگرانی ہے اضطرار
ہر رشتہ چاکِ جیب کا تارِ نظر ہے آج

ہوں داغِ نیم رنگیِ شامِ وصالِ یار
نورِ چراغِ بزم سے جوشِ سحر ہے آج

کرتی ہے عاجزی سفرِ سوختن تمام
پیراہنِ خسک میں غبارِ شرر ہے آج

تا صبح ہے بمنزلِ مقصد رسیدنی
دودِ چراغ خانہ، غبارِ سفر ہے آج

دور اوفتادۂ چمنِ فکر ہے اسد
مرغِ خیالِ بلبلِ بے بال و پر ہے آج

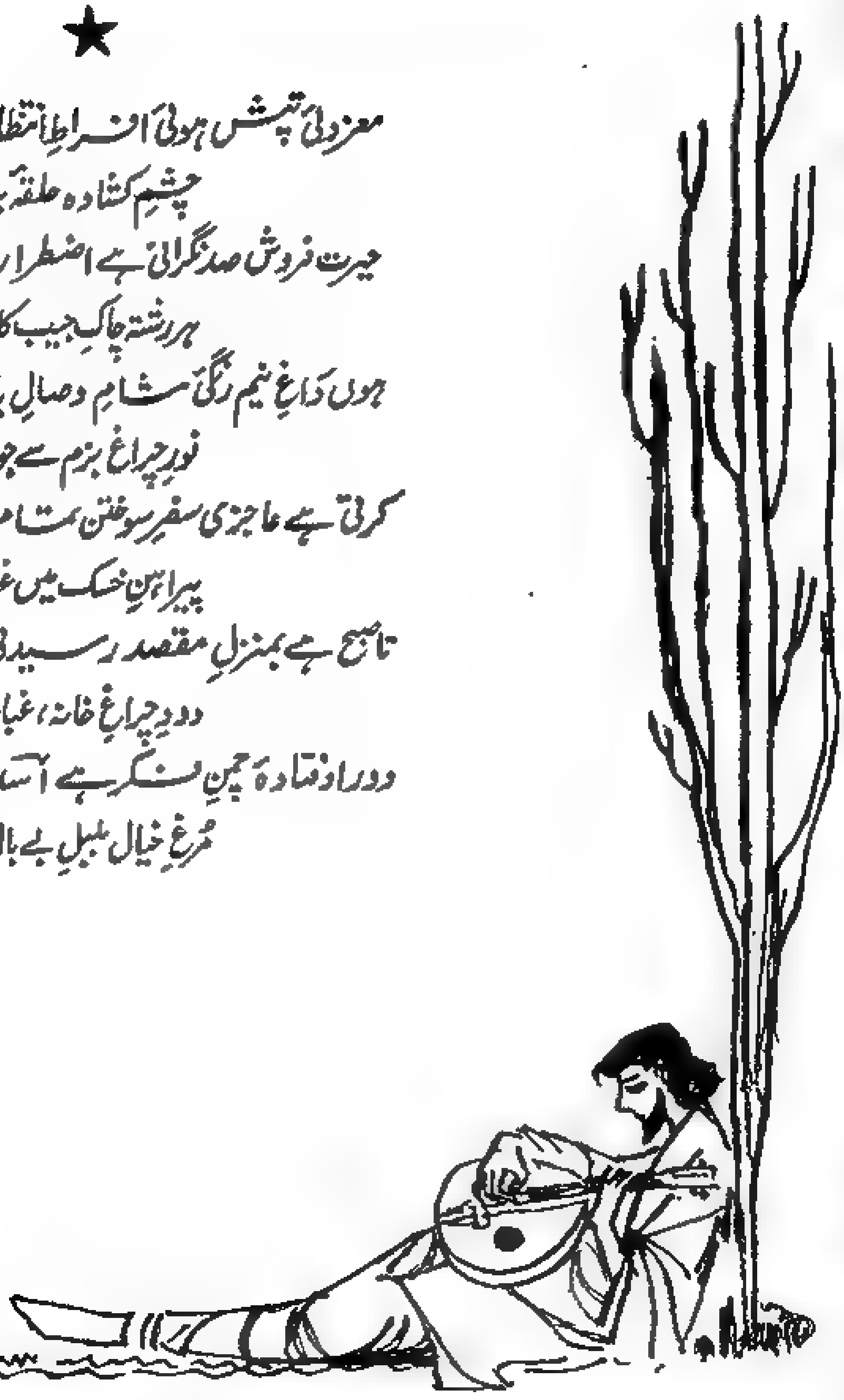

★

جنبشِ گل برگ سے ہے گل کے لب کو اختلاج
حبِّ شبنم سے صبا ہر صبح کرتی ہے علاج
شاخِ گل جنبش میں ہے گہوارہ آسا ہر نفس
طفلِ شوخِ غنچۂ گل بس کہ ہے وحشی مزاج
سیرِ ملکِ حسن کو مے خانہ ہا نذرِ خمار
چشمِ مستِ یار سے ہے گردنِ مینا پہ باج
گریہ ہائے بے دلاں، گنجِ شرر در آستیں
قہرمانِ عشق میں حسرت سے لیتے ہیں خراج
ہے سوادِ چشمِ قربانی میں یک عالم مقیم
حسرتِ فرصت نے بخشا بسکہ حیرت کو رواج
اے اسد ہے مستعدِ شانہ گیسو شدن
پنجۂ مژگاں بخود بالیدنی رکھتا ہے آج

★

عاشق، نقابِ جلوۂ جانانہ چاہیے
فانوسِ شمع کو پرِ پروانہ چاہیے
پیدا کریں دماغِ تماشائے سرو و گل
حسرت کشوں کو ساغر و مینا نہ چاہیے
دیوانگاں ہیں حاملِ رازِ نہانِ عشق
اے بے تمیز، گنج کو پروانہ چاہیے
ساقی بہارِ موسمِ گل ہے سرور بخش
پیماں سے ہم گزر گئے پیمانہ چاہیے
جادو ہے یار کی روشِ گفتگو اسد
یاں جز فسوں نہیں اگر افسانہ چاہیے

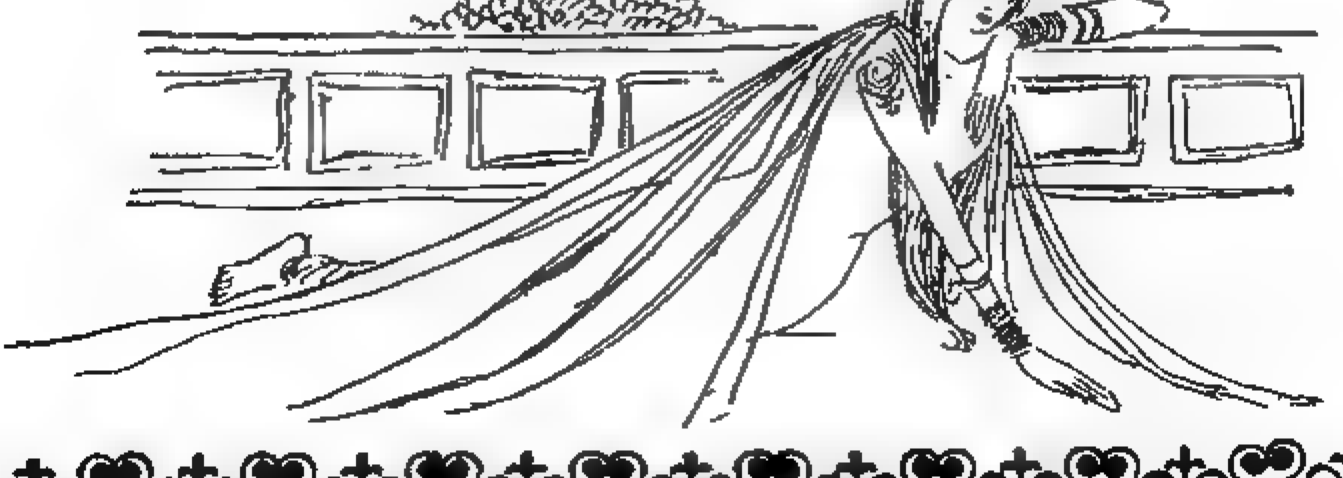

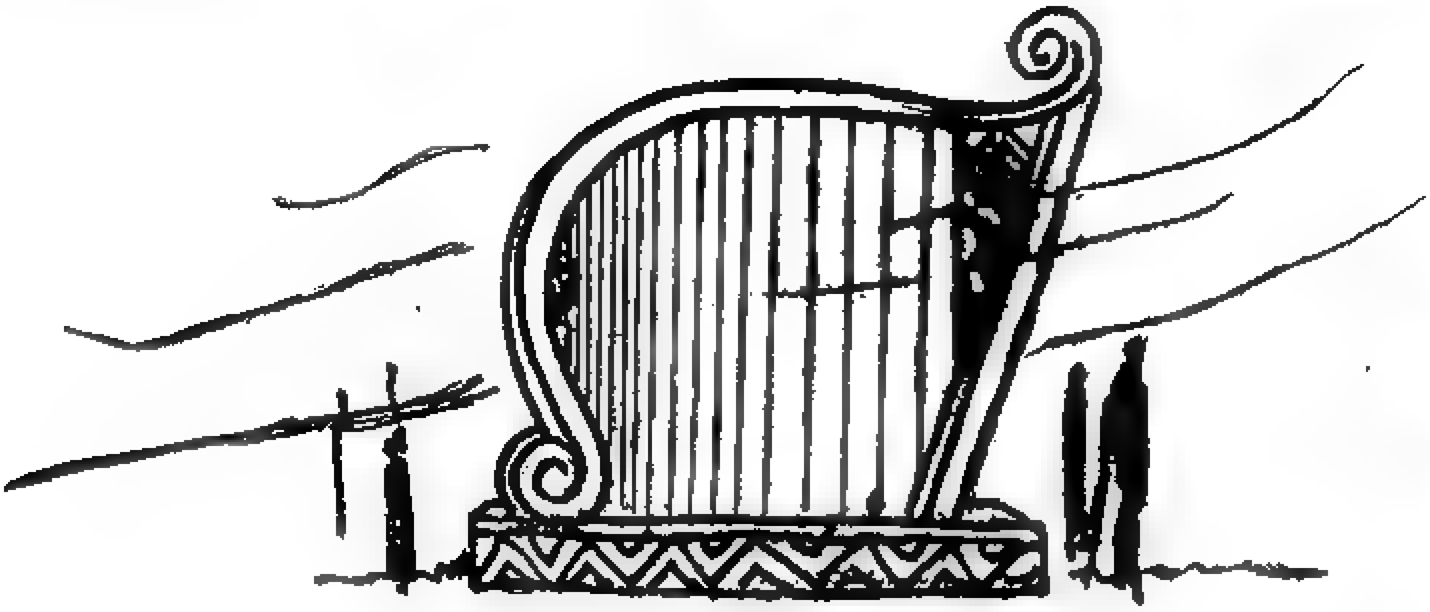

★

ذوقِ خود داری، خرابِ وحشتِ تسخیر ہے
آئینہ خانہ، مری تمثال کو زنجیر ہے
ذرّہ دے مجنوں کے کس کس داغ کو پروازِ عرض؟
ہر بیاباں، یک بیاباں حسرتِ تعمیر ہے
میکشِ مضمونِ حسنِ ربطِ خط کیا چاہیے؟
لغزشِ رفتارِ خامہ، مستیٔ تحریر ہے
خانمانِ جبریانِ غافل از معنی خراب!
جب ہوئے ہم بے گناہ رحمت کی کیا تقصیر ہے؟
چاہے گر جنت، جز آدم وارثِ آدم نہیں
شوخیٔ ایمانِ زاہد سستیٔ تدبیر ہے
شب دراز و آتشِ دل تیز، یعنی، مثلِ شمع
مہ ز سر تا ناخنِ پا، رزقِ یک شب گیر ہے
آب ہو جاتے ہیں، ننگِ ہمتِ باطل سے مرد
اشک پیدا کر اسد، گر آہ بے تاثیر ہے

★

فریبِ صنعتِ ایجاد کا تماشہ دیکھ
نگاہ عکس فروش و خیال آئینہ ساز
ہنوز اے اثرِ دید، ننگِ رسوائی
نگاہ فتنہ خرام و درِ دو عالم باز
زبسکہ جلوۂ صیاد حیرت آرا ہے
اڑی ہے صفحۂ خاطر سے صورتِ پرواز
ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز
اسد سے ترکِ وفا کا گماں وہ معنی ہے
کہ کھینچیے پرِ طائر سے صورتِ پرواز

★

کہوں کیا گرم جوشی مے کشی میں شعلہ رویاں کی ؟
کہ شمعِ خانۂ دل، آتشِ مے سے فروزاں کی
ہمیشہ مجھ کو طفلی میں بھی مشقِ تیرہ روزی تھی
سیاہی ہے مرے ایام میں لوحِ دبستاں کی
مجھے اپنے جنوں کی بے تکلف پردہ داری تھی
ولیکن کیا کروں، آوے جو رسوائی گریباں کی
ہنر پیدا کیا ہے میں نے حیرت آزمائی میں
کہ جوہر آئینے کا ہر ایک، ہے چشمِ حیراں کی
ہوا شرمِ تہی دستی سے وہ بھی سرنگوں آخر
بس اے زخمِ جگر، اب دیکھ لی شورش نمکداں کی
بیادِ گرمیٔ صحبت بے رنگِ شعلہ دہکے ہے
چھپاؤں کیونکر، غالب سوزشیں داغِ نمایاں کی

★

★

خوابِ جمعیتِ مخمل ہے پریشاں مجھ سے
رگِ بستر کو ملی شوخیٔ مژگاں مجھ سے
کنجِ تاریک وکمیں گیریٔ اختر شمری
عینکِ چشم بنی روزنِ زنداں مجھ سے
بستنِ عہدِ محبت ہمہ نادانی تھا
چشمِ نکشودہ رہا عقدۂ پیماں مجھ سے
آتش افروزیٔ یک شعلۂ ایما تجھ سے
چشمک آرائیٔ صد شہرِ چراغاں مجھ سے
اے اسد دسترسِ وصلِ تمنا معلوم
کاش ہو قدرتِ برچیدنِ داماں مجھ سے

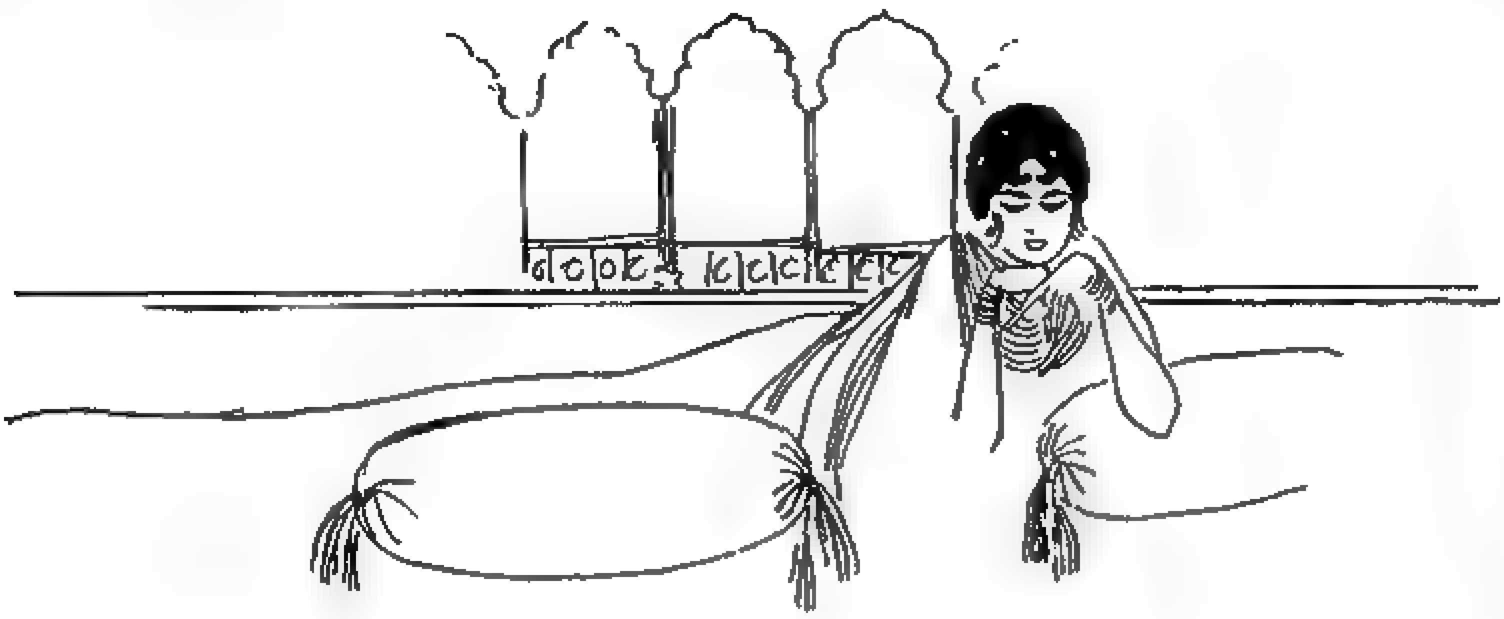

جائے کہ پائے سیلِ بلا درمیاں نہیں
دیوانگاں کو واں ہوسِ خانماں نہیں
کس جرم سے ہے چشم تجھے حسرتِ قبول
برگِ حنا مگر مژۂ خوں فشاں نہیں
ہر رنگِ گردش آئنہ ایجادِ درد ہے
اشکِ سحاب، جز بوئے داغِ خزاں نہیں
جز عجز کیا کروں بہ تمنائی بےخودی
طاقت حریفِ سختیِ خوابِ گراں نہیں
عبرت سے پوچھ دردِ پریشانیِ نگاہ
یہ گردِ وہم جز بہ سرِ امتحاں نہیں
گل غنچگی میں غرقۂ دریائے رنگ ہے
اے آگہی فریبِ تماشا کہاں نہیں
برقِ بجانِ حوصلہ آتش فگن اسدؔ
اے دل فسردہ طاقتِ ضبطِ فغاں نہیں

آتے ہیں پارہ ہائے جگر درمیانِ اشک
لائے ہے لعلِ بیش بہا کاروانِ اشک
ظاہر کرے ہے جنبشِ مژگاں سے مدعا
طفلانہ ہاتھ کا ہے اشارہ زبانِ اشک
رونے نے طاقت اتنی نہ چھوڑی کہ ایک بار
مژگاں کو دوں فشارِ پئے امتحانِ اشک
دل خستگاں کو ہے طربِ صد چمن بہار
باغِ بجوں تپیدن و آبِ روانِ اشک
سیلِ بنائے ہستیِ شبنم ہے آفتاب
چھوڑے نہ چشم میں تپشِ دل نشانِ اشک
ہنگامِ انتظارِ قدومِ بتاں اسدؔ
ہے بر سرِ مژہ نگراں دیدبانِ اشک

★

اثر سوزِ محبت کا قیامت بے محابا ہے
کہ رگ سے سنگ میں تخمِ شرر کا ریشہ پیدا ہے
نہاں ہے گوہرِ مقصود جیبِ خود شناسی میں
کہ یاں غوّاص ہے تمثال اور آئینہ دریا ہے
عزیزو ذکرِ وصلِ غیر سے مجھ کو نہ بہلاؤ
کہ یاں افسونِ خواب، افسانۂ خوابِ زلیخا ہے
تصور، بہرِ تسکینِ تپیدن ہائے طفلِ دل
بہ باغِ رنگ ہائے رفتہ گلچینِ تماشا ہے
بسعیِ غیر ہے قطعِ لباسِ خانہ ویرانی
کہ تارِ جادۂ رہ، رشتۂ دامانِ صحرا ہے
مجھے شب ہائے تاریکِ فراقِ شعلہ رویاں میں
چراغِ خانۂ دل، سوزشِ داغِ تمنا ہے
ترے نوکر ترے در پر اسد کو ذبح کرتے ہیں
ستمگر، ناخدا ترس، آشنا کش، ماجرا کیا ہے؟

★

رات دِل گرمِ خیالِ جلوۂ جانانہ تھا
رنگ رُوئے شمع، برقِ خرمنِ پروانہ تھا
شب کہ تھی کیفیتِ محفل بہ یادِ رُوئے یار
ہر نظر، داغِ مَی خالِ لبِ پیمانہ تھا
ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہو گیا
تو کہے، صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا
دیکھ اس کے ساعدِ سیمیں و دستِ پُر نگار
شاخِ گل جلتی تھی مثلِ شمع گل پروانہ تھا
شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالب ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

★

دل سراپا وقفِ سودائی نگاہِ تیز ہے
یہ زمیں مثلِ نیستاں سخت ناوک خیز ہے
ہو سکے کیا خاک دست و بازوئے فرہاد سے؟
بے ستوں، خوابِ گرانِ خسروِ پرویز ہے
ان ستم کیشوں کے کھائے ہیں زلیس، تیرِ نگاہ
پردۂ بادام، یک غربالِ حسرت بیز ہے
خونچکاں ہے جادہ، مانندِ رگِ سودائیاں
سبزۂ صحرائے الفت، نشترِ خونریز ہے
ہے بہارِ تیز رو، گلگونِ نکہت پر سوار
یک شکستِ رنگِ گل صد جنبشِ مہمیز ہے

★

دلِ بیمار از خود رفتہ تصویرِ نہالی ہے
کہ مژگاں ریشہ دارِ نیستانِ شیر قالی ہے
سرورِ نشۂ گردش اگر کیفیت افزا ہو
نہاں ہر گرد بادِ دشت میں جامِ سفالی ہے
ہوا آئینہ جامِ بادہ عکسِ روئے گلگوں سے
نشانِ خالِ رخ داغِ شرابِ پرتگالی ہے
اسدؔ اٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

★

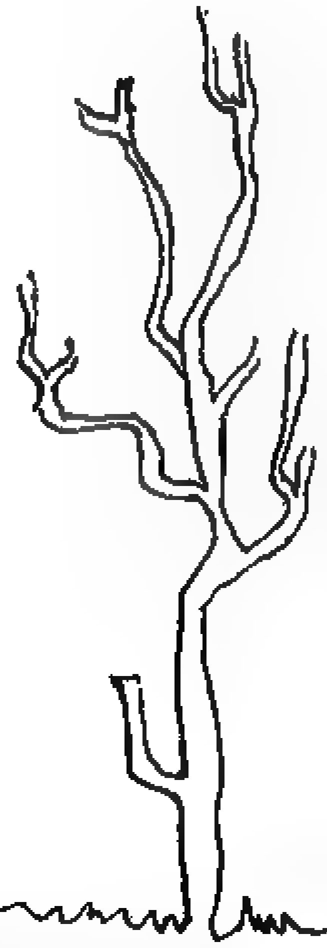

کس کا خیال آئینۂ انتظار تھا
ہر برگِ گل کے پردے میں دل بے قرار تھا
کس کا جنونِ دید، تمنا شکار تھا
آئینہ خانہ، وادیِ جوہر غبار تھا
جوں غنچہ و گل، آفتِ فالِ نظر نہ پوچھ
پیکاں سے تیر کے جلوۂ زخم آشکارا تھا
دیکھی وفائے فرصتِ رنج و نشاطِ دہر
خمیازہ، یک درازیِ عمرِ خمار تھا
صبحِ قیامت ایک دمِ گرگ تھی اسدؔ
جس دشت میں وہ شوخِ دو عالم شکار تھا

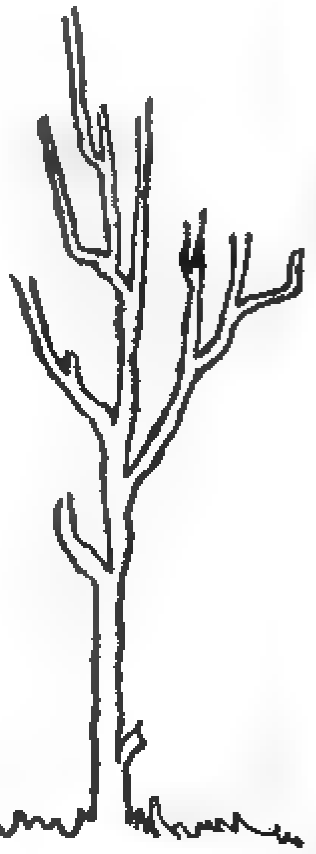

قطعات

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس — یوں کہا آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب؟
بال و پر دو چار دکھلا کر، کہا صیاد نے — یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

★

★

اٹھا اک دن بگولا سا جو کچھ، میں، جوشِ وحشت میں
پھرا آسیمہ سر، گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے
نظر آیا مجھے اک طائرِ مجروح پَر بستہ
ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے
کہا میں نے کہ او گمنام، آخر ماجرا کیا ہے؟
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستم گر آفتِ جاں سے؟
ہنسا کچھ کھِل کھِلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا
تو یہ رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے
کہا، میں، صید ہوں اس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آ کر باغِ رضواں سے
اُسی کے زلف و رُخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو
نہ مطلب کفر سے ہے، اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے
بچشمِ غور جو دیکھا، مرا ہی طائرِ دل تھا
کہ جل کر ہو گیا یوں خاک، میری آہِ سوزاں سے

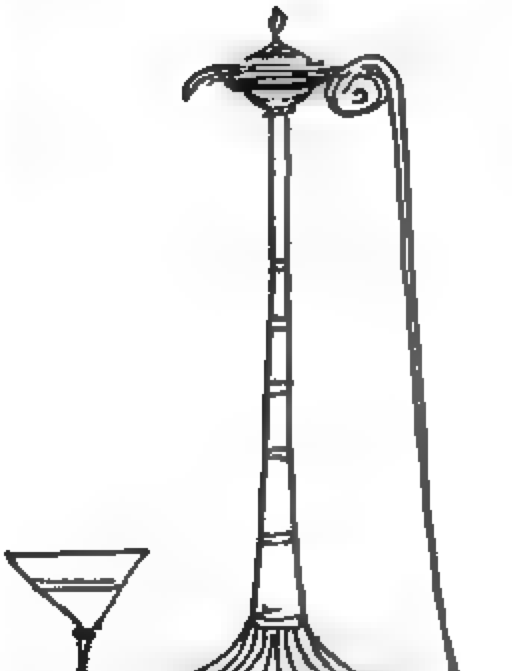

رُباعیات

ہر چند کہ دوستی میں کامل ہونا — ممکن نہیں یک زبان و یک دل ہونا
میں تجھ سے اور مجھ سے تو پوشیدہ — ہے مفت نگاہ کا مقابل ہونا

★

سامانِ ہزار جستجو، یعنی، دل — ساغر کشِ خونِ آرزو، یعنی، دل
پشت و رُخِ آئینہ ہے، دین و دنیا — منظور ہے دو جہان سے تو، یعنی، دل

★

اے کثرتِ فہم بے شمار اندیشہ — ہے اصل خرد سے شرم سار اندیشہ
یک قطرۂ خوں و دعوتِ صد نشتر — یک وہم و عبادتِ ہزار اندیشہ

★

دل سوزِ جنوں سے جلوۂ منظر ہے آج
نیرنگِ زمانہ، فتنہ پرور ہے آج
یک تارِ نفس میں، جوں طنابِ صناع
ہر پارۂ دل، بہ رنگِ دیگر ہے آج

★

★

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری — کہتے ہیں وہ مجھے رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو، جو کہ ہووے صوفی؟ — شیعی کیوں کر ہو، ماوراءالنہری؟

★

اے روشنیٔ دیدہ شہاب الدین خاں — کٹتا ہے، بتاؤ، کس طرح سے رمضاں؟
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک؟ — سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں؟

★

گر جوہر امتیاز ہوتا ہم میں — رسوا کرتے نہ آپ کو عالم میں
ہیں نام و نگیں، کمین گہِ نقب شعور — یہ چور پڑا ہے خانۂ خاتم میں

متفرقات

سات جلدوں کا پارسل پہنچا — واہ کیا خوب برمحل پہنچا

★

ان دل فریبیوں سے نہ کیوں اس پہ پیار آئے — روٹھا جو بے گناہ، تو بے عذر من گیا

★

خوشی جینے کی کیا، مرنے کا غم کیا — ہماری زندگی کیا اور ہم کیا

★

اک گرم آہ کی، تو ہزاروں کے گھر جلے — رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسدؔ — ہر رات، شمع، شام سے لے تا سحر جلے

★

نہ پوچھ حال اس انداز اس عتاب کے ساتھ
لبوں پہ جان کبھی آ جائے گی جواب کے ساتھ

مجھے کبھی تاکہ تمنا سے ہو نہ مایوسی
ملو رقیب سے، لیکن ذرا حجاب کے ساتھ

لگاؤ اس کا، ہے باعثِ قیامِ ہستی کا
ہوا کو لاگ کبھی ہے کچھ حباب کے ساتھ

★

وفا جفا کی طلب گار ہوتی آئی ہے
ازل کے دن سے یہ اے یار ہوتی آئی ہے

جوابِ جنّتِ بزمِ نشاطِ جاناں ہے
مری نگاہ جو خونبار ہوتی آئی ہے

دل و دماغِ وفا پیشگاں کی خیر نہیں
جگر سے آہ شرر بار ہوتی آئی ہے

★

نسیمِ صبح جب کنعاں میں بوئے پیرہن لائی
پئے یعقوب ساتھ اپنے نویدِ جان و تن لائی

وقارِ ماتمِ شب زندہ دارِ ہجر رکھنا تھا
سپیدی صبحِ غم کی، دوش پر رکھ کر کفن لائی

★

ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

★

پیر و مرشد معاف کیجیے گا
میں نے حنا کا کچھ نہ لکھا حال

★

درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

قادر نامہ

(قادر، اللہ) اور (یزداں) ہے خدا
ہے (نبی، مرسل، پیمبر) رہنما

پیشوائے دیں کو کہتے ہیں (امام)
وہ رسول اللہ کا قائم مقام

ہے (صحابی) دوست، خالص (ناب) ہے
جمع اُس کی، یاد رکھ (اصحاب) ہے

بندگی کا، ہاں، (عبادت) نام ہے
نیک بختی کا (سعادت) نام ہے

کھولنا (افطار) ہے، اور روزہ (صوم)
(لیل) یعنی رات، دن اور روز (یوم)

ہے (صلوٰۃ)، اے مہرباں، اسمِ نماز
جس کے پڑھنے سے ہو راضی بے نیاز

جا نماز اور پھر (مُصَلّا) ہے وہی
اور (سجّادہ) بھی گویا ہے وہی

(اِسم) وہ ہے، جس کو تم کہتے ہو نام
(کعبہ، مکّہ) وہ، جو ہے (بیت الحرام)

گرد پھرنے کو کہیں گے ہم (طواف)
بیٹھ رہنا گوشے میں ہے (اعتکاف)

پھر (فلک، چرخ) اور (گردُوں) اور (سپہر)
آسماں کے نام ہیں، اے رشکِ مہر

(مہر) سورج، چاند کو کہتے ہیں (ماہ)
ہے محبّت (مِہر) لازم ہے نباہ

(غَرب) پچھم، اور پورب (شَرق) ہے
(اَبر) بدلی، اور بجلی (برق) ہے

آگ کا (آتش) اور (آذر) نام ہے
اور انگارے کا (اخگر) نام ہے

(تیغ) کی ہندی اگر تلوار ہے
فارسی پگڑی کی بھی (دستار) ہے

نیولا (راسُو) ہے اور (طاؤس) مور
(کَبک) کو ہندی میں کہتے ہیں چکور

(تُخم) ہے تُکا اور ٹھلیا ہے (سَبو)
(آب) پانی، (بحر) دریا، نہر (جُو)

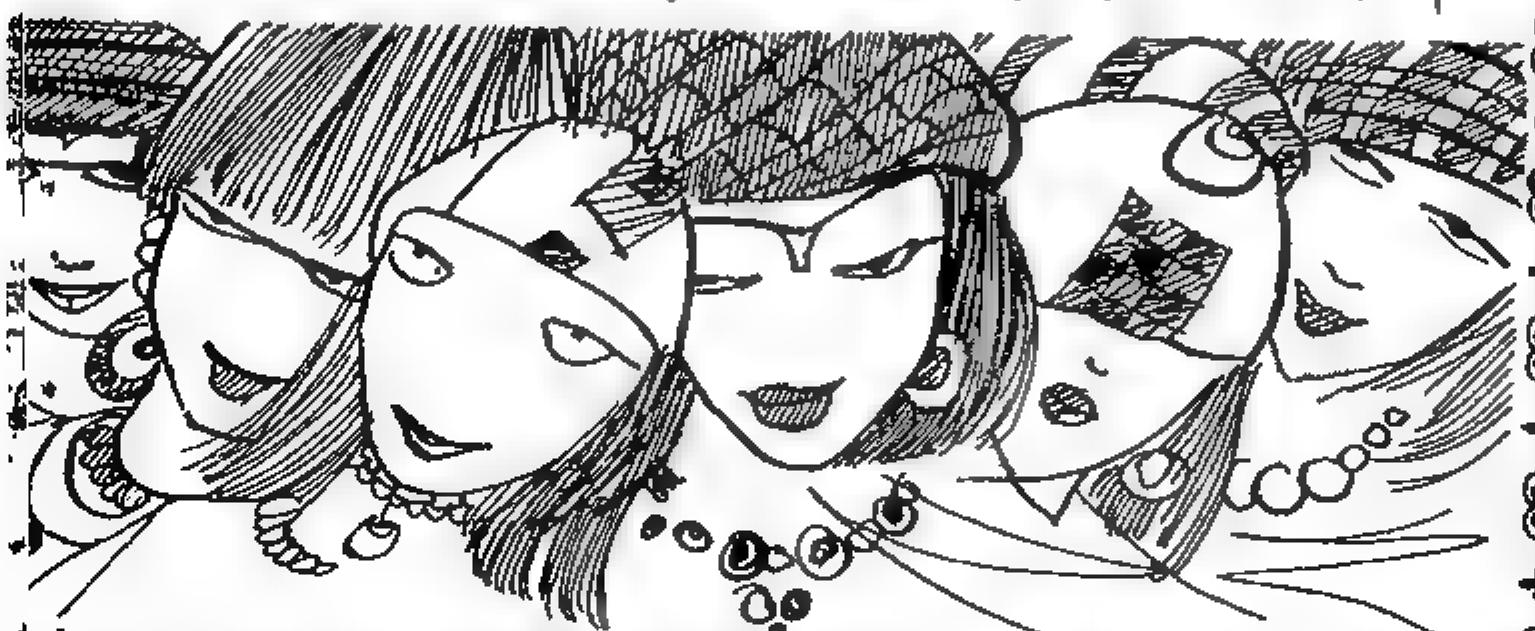

(چاہ) کو کہتے ہیں ہندی میں کنواں — (دُود) کو ہندی میں کہتے ہیں دُھواں
دُودھ جو پینے کا ہے وہ (شِیر) ہے — (طِفل) لڑکا اور بوڑھا (پیر) ہے
(سینہ) چھاتی، (دست) ہاتھ، اور (پای) پانو — (شاخ) ٹہنی، (برگ) پتّا، (سایہ) چھانو
(ماہ) چاند، (اختر) ہیں تارے، رات (شب) — دانت (دنداں)، ہونٹ کو کہتے ہیں (لب)
(اُستخواں) ہڈّی ہے، اور ہے (پوست) کھال — (سگ) ہے کتّا اور گیدڑ ہے (شغال)
(تِل) کو کُنجد اور (رُخ) کو گال کہہ — گال پر جو تِل ہو اُس کو (خال) کہہ
کینکڑا (سرطاں) ہے، کچھوا (سنگ پُشت) — (ساق) پنڈلی، فارسی مُٹھی کی (مُشت)
ہے (شِکم) پیٹ اور بغل (آغوش) ہے — کہنی (آرنج)، اور کندھا (دوش) ہے
ہندی میں (عقرب) کا بچھو نام ہے — فارسی میں بھَوں کا (اَبرو) نام ہے
ہے وہی (کژدُم) جسے (عقرب) کہیں — (نیش) ہے وہ، ڈنک جس کو سب کہیں
ہے، لڑائی (حرب) اور جنگ ایک چیز — (کعب) ٹخنا اور (شتالنگ) ایک چیز
ناک (بینی)، (پرّہ) نتھنا، (گوش) کان — کان کی لَو (نرمہ) ہے، اے مہرباں
(چشم) ہے آنکھ، اور (مژگاں) ہے پلک — آنکھ کی پُتلی کو کہیے (مردُمک)
مُنھ پہ گر جُھرّی پڑے (آژنگ) جان — فارسی چھینکے کی تو (آونگ) جان
مَسّا (آژخ) اور چھالا (آبلہ) — اور ہے دائی جنائی (قابلہ)
اونٹ (اُشتر)، اور (اُشغر) سیہ ہے — گوشت ہے (لحم) اور چربی (پیہ) ہے
ہے (زَنَخ) ٹھوڑی، (ذَقَن) بھی ہے وہی — (خاد) ہے چیل، اور (زَغَن) بھی ہے وہی
پھر (غلیواز) اُس کو کہیے جو ہے چیل — چیونٹی ہے (مور) اور ہاتھی ہے (پیل)
لومڑی (روباہ)، اور (آہو) ہرن — (شمس) سورج، اور (شعاع) اس کی کرن
(اسپ) جب ہندی میں گھوڑا نام پائے — (تازیانہ) کیوں نہ کوڑا نام پائے
(گربہ) بلّی، (موش) چوہا، (دام) جال — (رِشتہ) تاگا، (جامہ) کپڑا، (قحط) کال
(خر) گدھا اور اُس کو کہتے ہیں (الاغ) — (دیگداں) چولھا، جسے کہیے (اُجاغ)
ہندی چڑیا، فارسی (کنجشک) ہے — مینگنی جس کو کہیں، وہ (پشک) ہے
(تابہ) ہے بھائی، توے کی فارسی — اور (تیہو) ہے لوے کی فارسی
نام مکڑی کا (کلاش) اور (عنکبوت) — کہتے ہیں مچھلی کو (ماہی) اور (حُوت)

(پَشّہ) مچھر، اور مکھی ہے (مگس) — (آشیانہ) گھونسلا، پنجرہ (قفس)
بھیڑیا (گُرگ) اور بکری (گوسپند) — (میش) کا ہے نام بھیڑ، اے خود پسند
نام (گُل) کا پھول، (شبنم) اوس ہے — جس کو نقّارہ کہیں وہ (کوس) ہے
(سَقف) چھت ہے (سنگ) پتھّر، اینٹ (خِشت) — جو بُرا ہے، اُس کو ہم کہتے ہیں (زِشت)
(خار) کانٹا، (داغ) دھبّا، (نغمہ) راگ — (سِیم) چاندی، (مِس) ہے تانبا، (بخت) بھاگ
(زر) ہے سونا، اور (زرگر) ہے سُنار — (مَوز) کیلا، اور ککڑی ہے (خِیار)
(رِیش) داڑھی، مُوچھ (سَبلَت) اور (ثُروت) — (اَحمق) اور (نادان) کو کہتے ہیں (ادت)
زندگانی ہے (حیات) اور (مرگ) موت — (شُوے) خاوند، اور ہے (اَنباغ) سَوت
(جُملہ) سب، اور نصف (آدھا)، (ربع) پاؤ — (صَرصَر) آندھی، (سَیل) نالا، (باد) باؤ
ہے (جَراحت) اور زخم اور گھاؤ (رِیش) — بھینس کو کہتے ہیں بھائی (گاؤمیش)
(ہفت) سات، اور (ہشت) آٹھ، اور (بِیست) بیس — (سِی) اگر کہیے تو ہندی اُس کی تیس
ہے (چِہل) چالیس، اور (پنجہ) پچاس — (ناامیدی) یاس اور (اُمّید) آس
(دوش) کل کی رات، اور (امروز) آج — (آرد) آٹا اور (غلّہ) ہے اناج
چاہیے ہے ماں کو (مادر) جاننا — اور بھائی کو (برادر) جاننا
پھاوڑا (بیل) اور درانتی (داس) ہے — فارسی (کاہ) اور ہندی گھاس ہے
سبز ہو جب تک اُسے کہیے (گیاہ) — خشک ہو جاتی ہے تب کہتے ہیں (کاہ)
(چکیدہ) پڑا یا ہو کیسہ) کا تھیلی ہے نام — فارسی میں دھبّے کا (تیلی) ہے نام
(اَغلَگندُو) جھنجھنا، (نِیرو) ہے زور — (بادفر) پھرکی ہے اور ہے (دُزد) چور
(اَنگبیں) شہد، اور (عَسَل) یہ اے عزیز — نام کو ہیں تین پر ہے ایک چیز
(آرُوغ) اور (آروغ) کی ہندی ڈکار — (مَے) شراب، اور پینے والا (مَے گُسار)
رُوئی کو کہتے ہیں (پَنبہ) سُن رکھو — آم کو کہتے ہیں (اَنبہ) سُن رکھو
(خانہ) گھر ہے اور کوٹھا (بام) ہے — قلعہ (دِز) کھائی کا (خندق) نام ہے
ہے بنولا (پنبہ دانہ) لا کلام — اور تَربُز (ہِندوانہ) لا کلام
گر (دریچہ) فارسی کھڑکی کی ہے — (سرزنش) بھی فارسی جھڑکی کی ہے
ہے کہانی کی (فسانہ) فارسی — اور شعلے کی (زبانہ) فارسی

(لعل دو آتش) اُسی کا نام ہے
(پِست) اور ستّو کو کہتے ہیں (سَوِیق)
(تار) تاگا، (پود) بانا، یاد رکھ
(بوسہ) چُمّی، چاہنا ہے (خواستن)
خوش رہو، ہنسنے کو (خندیدن) کہو
ہے (ہراسیدن) بھی ڈرنا، کیوں ڈرو؟
ہے گزرنے کی (گذشتن) فارسی
وہ (سُرودن) ہے جسے گانا کہیں
(زیستن) کو جانِ من، جینا کہو
دوڑنے کی فارسی ہے (تاختن)
(دوختن) سینا، (دَریدن) پھاڑنا
(کاشتن) بونا ہے، اور (کِشتن) بھی ہے
ہے ٹپکنے کی (چکیدن) فارسی
کودنا (جستن)، (بُریدن) کاٹنا
دیکھنا (دیدن)، (رمیدن) بھاگنا

جو کہ بے چین اور بے آرام ہے
(ژرف) اور گہرے کو کہتے ہیں (عمیق)
(آزمودن) آزمانا یاد رکھ
کم ہے (اندک) اور گھٹانا (کاستن)
گر ڈرو، ڈرنے کو (ترسیدن) کہو
اور (جنگیدن) ہے لڑنا، کیوں لڑو؟
اور پھرنے کی ہے (گشتن) فارسی
ہے وہ (آوردن) جسے لانا کہیں
اور (نوشیدن) کو تم پینا کہو
کھیلنے کی فارسی ہے (باختن)
(کاشتن) بونا ہے، (رُفتن) جھاڑنا
کاتنے کی فارسی (رِشتن) بھی ہے
اور سُننے کی (شنیدن) فارسی
اور (لیسیدن) کی ہندی چاٹنا
جان لو، (بیدار بودن) جاگنا

(آمدن) آنا، بنانا (ساختن) ڈالنے کی فارسی (انداختن)
(سوختن) جلنا، چمکنا (تافتن) ڈھونڈنا (جُستن) ہے، پانا (یافتن)
باندھنا (بَستن)، (کُشادن) کھولنا (داشتن) رکھنا ہے، (سُختن) تولنا
تولنے کو اور (سنجیدن) کہو پھر خفا ہونے کو (رنجیدن) کہو
فارسی سونے کی (خفتن) جانئے مُنہ سے کچھ کہنے کو (گفتن) جانئے
کھینچنے کی ہے (کشیدن) فارسی اور آ گئے کی (رسیدن) فارسی
اونگھنا پوچھو، (غنودن) جان لو مانجھنا چاہو (زَدُودن) جان لو
ہے قلم کا فارسی میں (خامہ) نام ہے غزل کا فارسی میں (چامہ) نام
کس کو کہتے ہیں غزل ارشاد ہو ہاں، غزل پڑھئے، سبق گر یاد ہو

غزل

صبح سے دیکھیں گے رستا یار کا جمعے کے دن، وعدہ ہے دیدار کا
وہ چُرا دے باغ میں میوہ، جسے پھاند جانا، یاد ہو، دیوار کا
پُل ہی پر سے پھیر لائے ہم کو لوگ ورنہ، تھا اپنا ارادہ پار کا

شہر میں چھڑلوں کے میلے کی ہے بھیڑ　　آج ، عالم اور ہے ، بازار کا
لال ڈِگی پر کرے گا جا کے کیا ؟　　پُل پہ چل ، ہے آج دِن اِتوار کا
گر نہ ڈر جاؤ تو دِکھلاؤں تمہیں　　کاٹ ، اپنی کاٹھ کی تلوار کا

واہ بیٹے ، لڑکے پڑھی اچھی غزل
شوق ابھی سے ہے تجھے اشعار کا

لو سُنو کل کا سبق ، آ جاؤ تم　　پُوزی (افسار) اور دُمچی (پاردُم)
چھلنی کو (غربال ، پَرویزن) کہو　　چھید کو تم (رخنہ) اور (رَوزن) کہو
(چہ) کے معنی کیا ، (چگویم) کیا کہوں　　(من شوم خاموش) میں چُپ ہو رہوں
(باز خواہم رفت) میں پھر جاؤں گا　　(نان خواہم خورد) روٹی کھاؤں گا
فارسی کیوں کی (چرا) ہے یاد رکھ　　اور گھٹالا (دَرا) ہے ، یاد رکھ
(دَشت ، صحرا) اور جنگل ایک ہے　　پھر (سہ شنبہ) اور منگل ایک ہے
جس کو (ناداں) کہیے ، وہ انجان ہے　　فارسی بینگن کی (بادنجان) ہے
جس کو کہتے ہیں جمائی (فازہ) ہے　　جو ہے انگڑائی ، وہی (خمیازہ) ہے
(بارہ) کہتے ہیں کرَطے کو ، ہم سے پوچھ　　پاڑ ہے (تالار) ، ایک عالم سے پوچھ
جس طرح گہنے کی (زیور) فارسی　　اُس طرح ہنسلی کی (پَرگر) فارسی
بھِڑ کی ، بھائی ، فارسی (زنبور) ہے　　ڈبیا (آنبر) ہے اور (انبور) ہے
فارسی (آئینہ) ہندی آرسی　　اور ہے کنگھے کی (شانہ) فارسی
ہینگ (اَنگوزہ) ، اور (آرزیر) رانگ　　(ساز) باجا ، اور ہے آواز (بانگ)
(زوجہ) جورو (پَزنہ) بہنوئی کو جان　　(خَشم) غصّہ اور بدخوئی کو جان
لوہے کو کہتے ہیں (آہن) ، اور (حدید)　　جو نئی ہو چیز ، اُسے کہیے (جدید)
ہے (نوا) آواز ، ساماں اور اُول　　(نرخ ، قیمت) اور (بہا) یہ سب ہیں مُول
(سیر) لہسن ، (تُرب) مولی (ترہ) ساگ　　کھا (بخور) ، (برخیز) اٹھ (بگریز) بھاگ
روئی کی پولی کا ہے (پاغُند) نام　　(دُوک) تکلے کو کہیں گے لا کلام
(گیتی) اور (گیہاں) ہے دُنیا ، یاد رکھ　　اور ہے (نَدّاف) دُھنیا یاد رکھ
(کوہ) کو ہندی میں کہتے ہیں پہاڑ　　فارسی (گُلخن) ہے ، اور ہندی ہے بھاڑ

تکیہ (بالش)، اور بچھونا (بسترا) | اصل (بستر) ہے، سمجھ لو تم ذرا
بسترا بولیں سپاہی اور فقیر | ورنہ (بستر) کہتے ہیں برنا و پیر
(پیر) بوڑھا، اور (برنا) ہے جواں | جان کو البتہ کہتے ہیں (رَواں)
اینٹ کے گارے کا نام (آژند) ہے | ہے (نصیحت) بھی وہی جو (پَند) ہے
(پَند) کو (اَندرز) بھی کہتے ہیں، ہاں | (اَرض) ہے، پر (مرز) بھی کہتے ہیں، ہاں
کیا ہے (اَرض) اور (مرز) تم سمجھے ہو؟ زمیں | (عُنق) گردن، اور پیشانی (جبیں)
(آس) چکی، (آسیا) مشہور ہے | اور (فوفل) چھالیا مشہور ہے
ہانسلی (سنے) اور (جلاجل) جھانجھ ہے | پھر (سُتروَن) اور (عَقیمہ) بانجھ ہے
(کُحل) سُرمہ، اور سلائی (میل) ہے | جس کو جھولی کہیے، وہ (زنبیل) ہے
پایا قادر نامہ نے آج اختتام | اِک غزل تم اور پڑھ لو، والسلام

غزل

شعر کے پڑھنے میں کچھ حاصل نہیں | مانتا، لیکن ہمارا دل، نہیں
علم ہی سے قدر ہے انسان کی | ہے وہی انسان جو جاہل نہیں
کیا کہیں کھائی ہے حافظ جی کی مار؟ | آج ہنستے آپ جو کھِل کھِل نہیں
کس طرح پڑھتے ہو رُک رُک کر سبق؟ | ایسے پڑھنے کا تو میں قائل نہیں

جس نے قادرنامہ سارا پڑھ لیا
اُس کو آمد نامہ کچھ مشکل نہیں

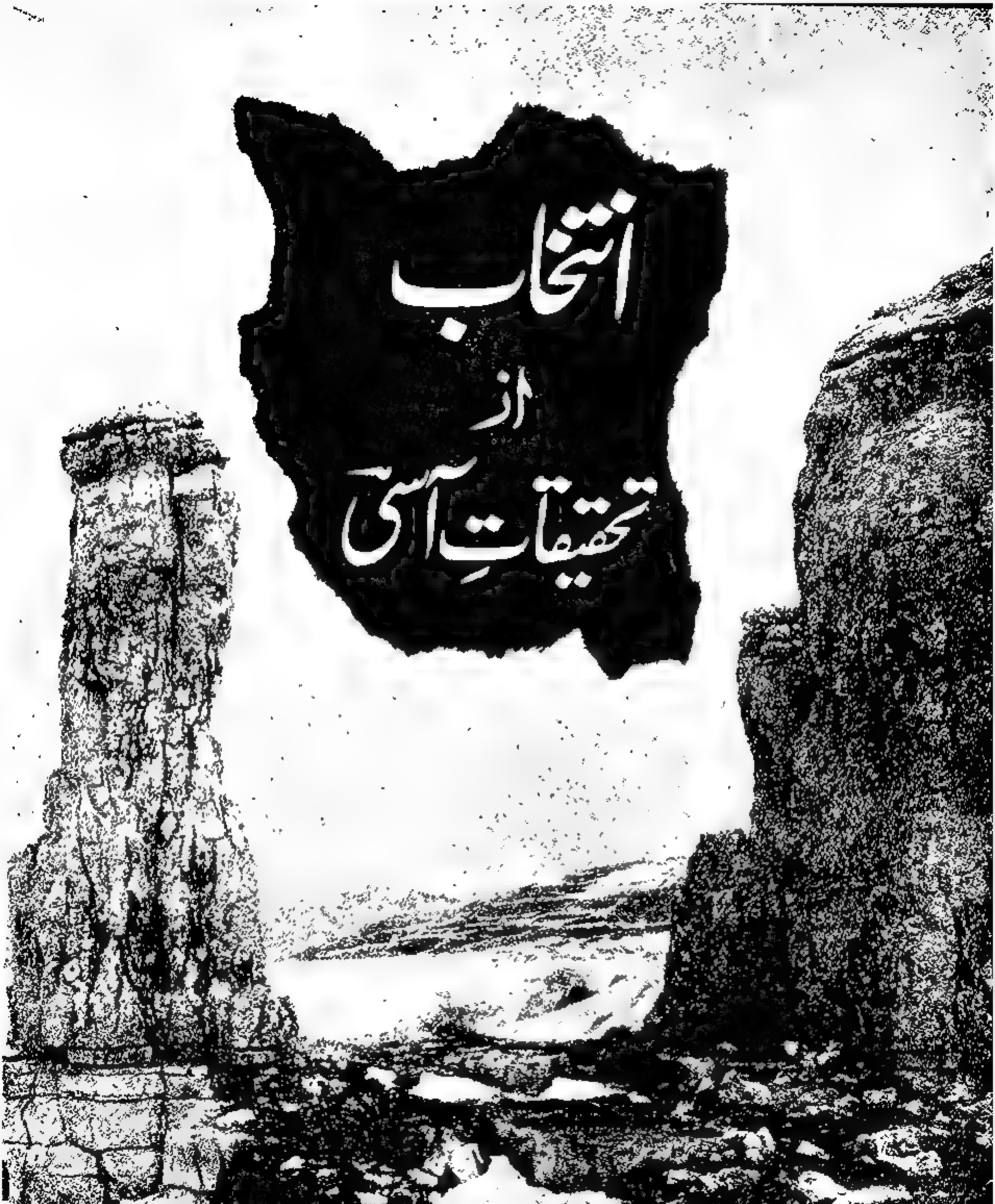
انتخاب
از
تحقیقاتِ آسی

حضرت آسی لکھنوی شارحین غالب میں سے ایک ہیں۔ غالب کی فن و شخصیت کو اجاگر کرنے کے لئے انہوں نے اپنی قابلیت اور شاعرانہ صلاحیت کے خوب خوب جوہر دکھلائے ہیں چنانچہ مندرجہ ذیل کلام غالب کے بارے میں ان کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ کلام انہوں نے ایک قلمی بیاض سے حاصل کیا ہے ۔ یہ کلام غالب کا ہی ہے اس امر کے لئے بیاض کے علاوہ اور کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ہے۔

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرتِ ماہ ؟
ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

تم ہو بت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے ؟
تم خداوند بھی کہلاؤ، خدا اور سہی

حُسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا
کعبہ ایک اور سہی قبلہ نما اور سہی

کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب ؟
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی آبِ بقا اور سہی

مجھ سے غالب یہ بھلائی نے غزل لکھوائی
ایک بے دادِ گر رنج فزا اور سہی

★

بھولے ہوئے جو غم ہیں انھیں یاد کیجیے
تب جا کے اُن سے شکوۂ بے داد کیجیے
خود جان دے کے روح کو آزاد کیجیے
تا کی خیالِ خاطرِ جلّاد کیجیے
حالانکہ اب زباں میں نہیں طاقتِ فغاں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ فریاد کیجیے

بس ہے دلوں کے واسطے اک جنبشِ نگاہ
اجڑے ہوئے گھروں کو پھر آباد کیجیے
کچھ درد مند منتظرِ انقلاب ہیں
جو شاد ہو چکے انھیں ناشاد کیجیے
شائد کہ پاس باعثِ افشائے راز ہو
لطف و کرم بھی شاملِ بے داد کیجیے
بیگانۂ رسومِ جہاں ہے مذاقِ عشق
طرزِ جدید ظلم کچھ ایجاد کیجیے

★

★

درد ہو دل میں تو دوا کیجیے
دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجیے
ہم کو فریاد کرنی آتی ہے
آپ سنتے نہیں تو کیا کیجیے
ان بتوں کو خدا سے کیا مطلب؟
توبہ توبہ خدا خدا کیجیے
رنج اٹھانے سے بھی خوشی ہوگی
پہلے دل درد آشنا کیجیے
عرضِ شوخی نشاطِ عالم ہے
حسن کو اور خود نما کیجیے
دشمنی ہو چکی بقدرِ وفا
اب حقِ دوستی ادا کیجیے
موت آتی نہیں کہیں غالب
کب تک افسوس زیست کا کیجیے

جوں شمع ہم اک سوختہ سامانِ وفا ہیں
اور اس کے سوا کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہیں
اک سرحدِ معدوم میں ہستی ہے ہماری
سازِ دلِ شکستہ کی بے کار صدا ہیں
جس رخ پہ ہوں ہم سجدہ اسی رخ پہ ہے واجب
گو قبلہ نہیں ہیں مگر اک قبلہ نما ہیں
مت ہو جیو اے سیلِ فنا ان سے مقابل
جانبازِ الم نقش بہ دامانِ بقا ہیں
ہر حال میں ہیں مرضیِ صیاد کے تابع
ہم طائرِ پر سوختہ، رشتہ بپا ہیں
اے وہم طرازانِ مجازی و حقیقی
عشاق فریبِ حق و باطل سے جدا ہیں
ہم بے خودیِ شوق میں کر لیتے ہیں سجدے
یہ ہم سے نہ پوچھو کہ کہاں ناصیہ سا ہیں
اب منتظرِ شورِ قیامت نہیں غالب
دنیا کے ہر اک ذرے میں سو حشر بپا ہیں

وضعِ نیرنگیِ آفاق نے مارا ہم کو
ہو گئے سب ستم و جور گوارا ہم کو
دشتِ وحشت میں نہ پایا کسی صورت سے سراغ
گردِ جولانِ جنوں تک نے پکارا ہم کو
عجز ہی اصل میں تھا حاملِ صد رنگِ عروج
ذوقِ پستیِ مصیبت نے ابھارا ہم کو
ضعف مشغول ہے بے کار بہ سعیِ بے جا
کر چکا جوشِ جنوں اب تو اشارا ہم کو
صورِ محشر کی صدا میں ہے فنونِ امید
خواہشِ زیست ہوئی آج دوبارا ہم کو
تختۂ گور سفینے کے مماثل ہیں اسد
بحرِ غم کا نظر آتا ہے کنارا ہم کو

★

لطفِ نظّارۂ قاتل دمِ بسمل آئے
جان جائے تو بلا سے، پہ کہیں دل آئے
ان کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری؟
دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے
وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو، اے شیخ
ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے
آئیں جس بزم میں وہ لوگ پکار اٹھتے ہیں
لو وہ برہم زنِ ہنگامۂ محفل آئے
دیدہ خونبار ہے مدّت سے ولے آج ندیم
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون میں شامل آئے
سامنا حور و پری نے کیا ہے نہ کریں
عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے
اب ہے دلّی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ
آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے

★

حسن بے پروا گرفتارِ خود آرائی نہ ہو
گر کمیں گاہِ نظر میں دل تماشائی نہ ہو
ہیچ ہے تاثیرِ عالمگیریٔ ناز و ادا
ذوقِ عاشق اگر اسیرِ دامِ گیرائی نہ ہو
خود گدازِ شمع آغازِ فروغِ شمع ہے
سوزشِ غم درپئے ذوقِ شکیبائی نہ ہو
تار تار پیرہن ہے اک رگِ جانِ جنوں
عقلِ غیرت پیشہ حیرت سے تماشائی نہ ہو
بزمِ کثرت عالمِ وحدت ہے بینا کے لیے
بے نیازِ عشق اسیرِ زورِ تنہائی نہ ہو
ہے محبت رہزنِ ناموسِ انساں اے اسدؔ
قامتِ عاشق پہ کیوں ملبوسِ رسوائی نہ ہو

★

کٹے تو شب کہیں کاٹے تو سانپ کہلاوے
کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے؟
لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے؟
نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کیا
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے؟
وہ داد و دیدِ گرانمایہ شرط ہے ہمدم
وگرنہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے؟

★

ہم سے خوبانِ جہاں پہلو تہی کرتے رہے
ہم ہمیشہ مشقِ از خود رفتگی کرتے رہے

کثرت آرائی خیالِ ماسوائی وہم تھی
مرگ پر غافل گمانِ زندگی کرتے رہے

داغ ہائے دل، چراغِ خانۂ تاریک تھے
تا مغاکِ قبر پیدا روشنی کرتے رہے

شورِ نیرنگِ بہارِ گلشنِ ہستی نہ پوچھ
ہم خوشی اکثر رہینِ ناخوشی کرتے رہے

رخصت اے تمکینِ آزارِ فراقِ ہمرہاں
ہو سکا جب تک غمِ واماندگی کرتے رہے

★

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں

نہیں کرنے کا میں، تقریر ادب سے باہر
میں بھی ہوں محرمِ اسرار کہوں یا نہ کہوں

شکر سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو
اپنی ہستی سے ہوں بیزار کہوں یا نہ کہوں

اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتاریٔ دل
جب نہ پاؤں کوئی غمخوار کہوں یا نہ کہوں

دل کے ہاتھوں سے کہ ہے دشمنِ جانی میرا
ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں

میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غماز
گوش ہیں در پسِ دیوار کہوں یا نہ کہوں

آپ سے وہ میرا احوال نہ پوچھے تو اسدؔ
حسبِ حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں

★

★

سکوت و خامشی اظہار حالِ بے زبانی ہے
کمینِ درد میں پوشیدہ رازِ شادمانی ہے
عیاں ہے حال و قالِ شیخ سے اندازِ دلچسپی
مگر رندِ قدح کش کا ابھی دورِ جوانی ہے
ثباتِ چند روزہ کار فرمائے غم و حسرت
اجل سرمایہ دارِ دورِ عیش و کامرانی ہے
گدازِ داغِ دل شمعِ بساطِ خانہ ویرانی
تپش گاہِ محبت میں فروغِ جاودانی ہے
وفورِ خود نمائی رہزنِ ذوقِ جلوہ آرائی
بہ وہمِ کامرانی جذبۂ دل کو شادمانی ہے
دلِ حرماں لقب کی داد سے لے چرخِ بے پروا
یگانوت دادۂ رخصت و متاعِ کامرانی ہے

★

★

وجہ مایوسیٔ عاشق ہے تغافل ان کا
نہ کبھی قتل کریں گے نہ پشیماں ہوں گے
دل سلامت ہے تو صدموں کی کمی کیا ہم کو
اُن سے اُن سے تو بہت جان کے خواہاں ہوں گے
منتشر ہو کے بھی دل جمع رکھیں گے یعنی
ہم بھی اب پیروِ گیسوئے پریشاں ہوں گے
گردشِ بخت نے مایوس کیا ہے لیکن
اب بھی ہر گوشۂ دل میں کئی ارماں ہوں گے
ہے ابھی خوں سے فقط گرمیٔ ہنگامۂ اشک
پر یہ حالت ہے تو نالے شرر افشاں ہوں گے
باندھ کر عہدِ وفا اتنا تنفر ہے ہے!
تجھ سے بے مہر کم اے عمر گریزاں ہوں گے
اس قدر بھی دلِ سوزاں کو نہ جان افسردہ
ابھی کچھ داغ تو اے شمع فروزاں ہوں گے
عہد میں تیرے کہاں گرمیٔ ہنگامۂ عیش ؟
گل میری قسمت وانجام کے پرخنداں ہوں گے
خوگرِ عیش نہیں ہیں ترے برگشتہ نصیب
ان کو دشوار ہیں وہ کام جو آساں ہوں گے
موت پھر زیست نہ ہو جائے یہ ڈر ہے غالب
وہ مری نعش پہ انگشت بدنداں ہوں گے

★

★

بدتر از ویرانہ ہے فصلِ خزاں میں صحنِ باغ
خانۂ بلبل، بغیر از خندۂ گل، بے چراغ

پتہ پتہ اب چمن کا انقلاب آمودہ ہے
نغمۂ مرغِ چمن زا، ہے صدائے بوم و زاغ

ہاں بغیر از خوابِ مرگ آسودگی ممکن نہیں
رختِ ہستی باندھو، تا حاصل ہو دنیا سے فراغ

شورِ طوفانِ بلا ہے، خندۂ بے اختیار
کیا ہے گل کی بے زبانی، کیا ہے یہ لالے کا داغ

چشمِ پُرنم وہ، زمانہ منقلب ہے، اے اسدؔ
اب یہی ہے بس یہی شادی سے پُر ہونا ایاغ

★

★

آفت آہنگ ہے کچھ نالۂ بلبل ورنہ
پھول ہنس ہنس کے گلستاں میں فنا ہو جاتا

کاش ناقدر نہ ہوتا ترا اندازِ خرام
میں غبارِ سرِ دامانِ فنا ہو جاتا

یک شبہ فرصتِ شوخی ہے اک آئینۂ غم
رنگِ گل کاش گلستاں کی ہوا ہو جاتا

مستقل مرکزِ غم پر ہی نہیں تھے ورنہ
ہم کو اندازۂ آئینِ وفا ہو جاتا

دستِ قدرت ہے مرا خشت بہ دیوارِ فنا
گر فنا بھی میں نہ ہوتا تو فنا ہو جاتا

حیرت اندوزیٔ اربابِ حقیقت مت پوچھ
جلوہ ایک روز تو آئینہ نما ہو جاتا

★

غالب کے انتقال کی پہلی خبر

دہلی کے اکمل الاخبار میں

غالب کے انتقال کی خبر سب سے پہلے دہلی کے اکمل الاخبار میں شائع ہوئی تھی اور پھر اسی اخبار کے ذریعے پورے ملک میں پھیلی تھی۔ یہ خبرِ انتقال بھی تھی اور غالب کے حضور میں خراجِ عقیدت بھی — ذیل میں ہم یہ پوری خبر مع عنوان کے شائع کر رہے ہیں۔ اس سے صرف غالب کی عظمت کا ہی اندازہ نہیں ہوگا بلکہ یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ آج سے سو برس پیشتر اردو اخبارات کی زبان کتنی مرصّع اور کتنی مخلص تھی۔

—— مہمان

غالب کی وفات

"فغاں اس زمانہ غدار سے، آہ روزگار ناہنجار سے۔ ہر روز نیا رنگ دکھاتا ہے، ہر دم دامِ غم والم میں پھنساتا ہے اس محیطِ آفت کی موج بلا خیز ہے، اس وادیٔ ہولناک کی ہوا فتنہ انگیز ہے۔ اس کا آب سراب، اس کی راحت جزوِ جراحت۔ اس کی رافت سرمایۂ صداقت، اس کی شکر زہر آلود، اس کی امید آرزوئے فرسودہ۔ ہر روز محلِ حیات کو صرصرِ ممات سے گراتا ہے، ہر دم محفلِ سرور سے صدائے ماتم اٹھاتا ہے.... پھول اُدھر کھلا اِدھر گر پڑا۔ لالہ لباسِ رنگین میں یہی داغ دل پر رکھتا ہے۔ غنچہ خونِ جگر سے پرورش پاتا ہے۔ بلبل نوحہ گرِ چمن ہے اور مرغِ سحر خواں اسیرِ محن....

کیا عجب گو آسماں درپئے آزار ہے۔ بھلا اس سے کیا توقع آسودگی جس کا خود گردش پر مدار ہے۔ دیکھو بیٹھے بٹھائے کیا آفت اٹھائی ہے کس منتخبِ روزگار کی جدائی دکھائی ہے۔ نخلِ برومند سے معانی کو بادِ خزاں سے گرایا مہرِ سپہرِ سخن دانی کو خاک میں ملایا، جو خسرو کے بعد ملکِ سخن کا خسرو مالکِ رقاب تھا۔ اس کا نامۂ عمر طے ہوا جو میدانِ سخنوری کا شہسوار مالک رقاب تھا۔ اس کا رخشِ زندگی پے ہوا۔ ان حضرت کی کن کن خوبیوں کا ذکر کیا جائے۔ دریا کوزے میں کیوں کر سمائے۔ حسنِ خلق میں اخلاق کی کتاب۔ جمیم الاشفاقی میں لاجواب خوبیٔ تحریر میں بے نظیر۔ صافی ضمیر جادو تقریر فارسی زبان میں لاثانی اردوئے معلّی کے بانی۔ افسوس جس کا شہبازِ خیال طائرِ سدرہ شکار ہو وہ پنجۂ گرگِ اجل میں گرفتار ہو.... اس غم سے سب کی حالت تباہ ہے روز یہی اس مصیبت میں سیاہ ہے اب توضیح اجمال و تفصیلِ مقال ہے۔ واضح ہو کہ جناب مرحوم دو تین مہینے سے صاحبِ فراش رہے۔ ضعف و نقاہت کے صدمے سہے۔ آٹھ دن انتقال سے پہلے کھانا پینا ترک فرمایا۔ اس دنیائے فانی سے بالکل دل اٹھایا۔

تا آنکہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء.... روز دوشنبہ کو دوپہر ڈھلے اس خورشیدِ اوجِ فضل و کمال کو زوال ہوا...."

(اکمل الاخبار۔ ۱۷ فروری ۱۸۶۹)

متین طارق

غالب کے دو صاحبِ طرز شاگرد

مجھے پانچ سال کی عمر میں مکتب کے حوالے کر دیا گیا۔ الف، بے، تے یاد ہو گئی۔ لکھنا آ گیا۔ حروف کو ملانا سیکھ گیا۔ چھوٹے چھوٹے جملے پڑھنے لگا تو اُردو کی پہلی کتاب، پھر دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب پڑھنے کو ملی۔ چوتھی کلاس تک پہنچتے پہنچتے "سوادِ اُردو" سے پالا پڑا۔ ان کتابوں میں مضامینِ نثر کے علاوہ بڑی دلآویز اور سبق آموز نظمیں پڑھنے کو ملیں جن کا اختتام عموماً کسی نہ کسی نصیحت پر ہوتا تھا۔ یہ نظمیں اس طرح شروع ہوتی تھیں:

نہر پر چل رہی ہے پن چکّی
دُھن کی پوری ہے کام کی پکّی

لاڈلا بیٹا تھا اک ماں باپ کا
جان ماں کی اور ایمان باپ کا

ایک لڑکی بگھارتی تھی دال
دال کرتی تھی عرض یوں احوال

ایک کچھوے کے آ گئی جی میں
کیجیے سیر و گشت خشکی میں

گھنگھور گھٹا تُلی کھڑی تھی
پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی

ایک گھوڑا تھا نہایت عیب دار
اپنے سایہ سے بدکتا بار بار

پایا تھا ایک گدھے نے کہیں پوستینِ شیر
سوچا کہ اس کی آڑ میں کچھ کھیلیے شکار

یہ تھی ہماری پہلی پہلی ملاقات ان نظموں کے مصنّف حضرت مولانا اسمٰعیل میرٹھی سے۔

پانچویں اور چھٹی کلاس میں بھی جو کتابیں "ادیبِ اُردو" وغیرہ پڑھیں وہ بھی مولانا صاحب موصوف کی ہی تالیف کردہ تھیں جن میں دیگر شعراء کا کلام بھی درج تھا۔

چھٹی کلاس میں ایک دن مولوی صاحب تشریف لائے۔ کتاب کھولی اور بہت ہی لہک لہک کر تحت اللفظ میں ایک غزل پڑھ ڈالی۔ مطلع آپ بھی سنیے۔

اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
اب وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

غزل پڑھنے کے بعد فرمایا کہ ہمارے ضلع مظفر نگر کی مغربی سرحد پر دریائے جمنا بہتا ہے۔ جمنا کے اُس پار سات آٹھ میل کی دوری پر ایک مقام ہے پانی پت۔ یہ مقام دو ہزار برس پرانی تاریخ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ کورکشیتر کا تاریخی مقام بھی اسی کے قریب ہے جہاں کوروں اور پانڈوں کی جنگ ہوئی تھی۔ ابراہیم لودی کی فوجوں نے اسی پانی پت کے میدان میں بابر کی فوجوں سے لوہا لیا تھا۔ اسی میدان میں اکبر کی فوج نے رانا سانگا جیسے جری اور بہادر سپہ سالار کو شکست دی تھی۔ احمد

شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ہندوستانی شور بیر جوانوں نے اسی میدان میں دادِ شجاعت دی تھی ——— مشہور بزرگ حضرت بو علی شاہ قلندر اسی خاک میں دفن ہیں۔ ۱۸۳۶ء میں اسی پانی پت کے محلہ انصاریان میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ الطاف حسین نام رکھا گیا۔ یہی لڑکا بڑا ہو کر شاعر اور ادیب بن گیا۔ حالی تخلص رکھا۔ یہ غزل جو میں نے سنائی ہے خواجہ الطاف حسین حالی کے فکر کا نتیجہ ہے۔

۱۸۴۵ میں جب حالی کی عمر نو سال کی تھی باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بڑے بھائی خواجہ امداد حسین اور اور بڑی بہن نے تعلیم و تربیت اپنے ذمہ لی۔

دستور کے مطابق قاری حافظ ممتاز علی صاحب کے مکتب میں قرآن شریف حفظ کیا۔ پھر سید جعفر علی صاحب سے فارسی اور حاجی ابراہیم حسین صاحب سے عربی کا درس لینا شروع کیا۔ پھر ایک سال تک دہلی میں مولوی نوازش علی صاحب، مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری اور مولوی امیر احمد صاحب جیسے باکمال اور صاحبِ فن استادوں سے عربی پڑھی۔ ۱۸۵۶ میں معمولی سی تنخواہ پر کلکٹر حصار کے دفتر میں نوکری کر لی۔ ۱۸۵۷ میں غدر کے ہنگامہ کے باعث نوکری چھوڑ کر پانی پت واپس آ گئے ——— ۱۸۶۳ میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نواب جہانگیر آباد ضلع بلند شہر نے خواجہ صاحب کو اپنے لڑکے کا اتالیق مقرر کیا۔ نواب صاحب جید عالم تھے۔ اردو فارسی کی نظم و نثر کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے اور بہت عمدہ نقاد تھے نواب صاحب نے حالی کو مفتی صدرالدین آزردہ، مرزا غالب حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ اربابِ علم و فن سے ملایا۔ نواب حالی جیسے علم دوست سخن فہم اور سخن شناس شخصیت کی صحبت

مولانا نظم طباطبائی کی نظر میں

کلامِ غالب کی غلطیاں

غالب کے اس شعر پر

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

مولانا نظم طباطبائی کا یہ اعتراض ہے کہ "جو" کا 'واؤ' وزن سے ساقط ہو گیا ہے۔ "دو جیم" جمع ہو گئے اور عیب تنافر پیدا ہو گیا۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دوسرے مصرع میں 'آیا' 'ہوا' کے معنی میں ہے جو فارسی کا محاورہ ہے اور اُردو میں اس طرح نہیں بولتے۔

جوہرِ تیغ بہ سرچشمۂ دیگر معلوم
ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اُگاتا ہے مجھے

ایران میں زہراب اہلِ زبان پیشاب کو بھی کہتے ہیں۔ اس لفظ سے بچنا چاہیے تھا۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

اس شعر میں غالب نے جس مقام پر 'نہ' کہا ہے یہاں 'نہیں' کہنا چاہیے تھا یا "ہے" کو ترک کیا ہوتا۔ اس سبب سے کہ 'نہ' کے ساتھ فعل منفی میں 'ہے' بولنا خلافِ محاورہ ہے اور قدیم اُردو میں بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ ▼▲

نے حالی کو حالی بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مزید برآں غالب کی شاگردی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور حالی مرزا کے دوسرے شاگردوں اور ہم عصروں سے بہت جلد آگے بڑھ گئے اور بالآخر خود اُستادی کا درجہ حاصل کر لیا۔

۷۷ برس کی عمر میں ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ کو پانی پت میں انتقال فرمایا اور حضرت شاہ شرف الدین بو علی قلندر کی کی درگاہ کے صحن میں حوض کے کنارے دفن ہوئے۔

اُردو شاعری کے رسم و رواج کے مطابق اوّل اوّل حالی نے بھی غزلیں کہیں اور عاشقانہ مضامین باندھے لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال ذہن نشین ہو گیا کہ عاشقانہ مضامین اکثر مخربِ اخلاق ہوتے ہیں اس لئے ان کے بجائے اخلاقی اور تمدنی مضامین باندھنے چاہئیں اور مناظرِ قدرت کوہ و دشت، صحرا و بیابان اور برق و باراں کا سماں دکھانا چاہیئے۔ ان اصلاحی خیالات کے بعد خواجہ صاحب کے یہاں غزل کا اسٹائل ہی بدل گیا۔ مولانا حالی نے غزل میں عاشقانہ جذبات کے ساتھ اس کثرت سے اخلاقی، قومی اور سیاسی خیالات کا اظہار کیا کہ وہ بالکل ایک نئی چیز بن گئی۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:

ایسی غزلیں سُنی نہ تھیں حالی
یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض

قوم کی بدحالی سے متاثر ہو کر انتہائی دردانگیز اور پُرتاثیر نظم "مدّ و جزرِ اسلام" لکھی جسے مسدس حالی بھی کہتے ہیں ــــــ حالی جدید اُردو ادب کے امام ہی نہیں معمار بھی ہیں۔

غالب کے دوسرے صاحبِ طرز شاگرد، بچوں کے ادب کے بادا آدم حضرتؒ مولانا اسمٰعیل میرٹھی ہیں۔ جنہوں نے آج سے پہلے کی کم سے کم تین نسلوں کو اُردو لکھنا پڑھنا سکھایا۔

دہلی سے چالیس میل دُور شمال مشرق کی جانب سڑکِ اعظم کے کنارے شہر میرٹھ آباد ہے۔ یہ شہر بھی خدا جانے کتنی کہانیاں سنا سکتا ہے۔ کوروں پانڈوں کا دارالخلافہ ہستناپور آج ضلع میرٹھ ہی کا ایک قصبہ ہے۔ ۱۸۵۷ میں جنگِ آزادی کی ابتدا اسی شہر سے ہوئی۔

اسی شہر میرٹھ کے محلہ مشائخان میں ایک ذی عزت شخص شیخ پیر بخش کے یہاں ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ کو ایک بچہ کی ولادت ہوئی۔ محمد اسمٰعیل نام رکھا گیا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۱۸۶۰ میں انسپکٹر مدارس کے دفتر میں کلرک کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ ۱۸۶۷ سے ۱۸۷۰ تک سہارن پور ضلع اسکول میں صدر مدرس فارسی کے عہدے پر فائز رہے، ۱۸۷۱ میں تبدیل ہو کر واپس میرٹھ آگئے۔ پہلے ضلع اسکول میں اور پھر نارمل اسکول میں فارسی کے معلم رہے۔ ۱۸۸۷ میں اسی عہدے پر آگرہ نارمل اسکول میں تبدیل ہو گئے، جہاں بارہ برس تک مقیم رہے۔ ۱۸۹۹ میں پنشن لے کر میرٹھ واپس آگئے۔ قیامِ آگرہ کے زمانے میں بچوں کے لئے کتابوں کا ایک سلسلہ لکھا جو عرصہ تک یوپی کے اسکولوں میں داخلِ نصاب رہا۔ یکم نومبر ۱۹۱۱ کو انتقال ہوا۔

جن لوگوں نے اُردو شاعری کو نئی ڈگر پر ڈالا اُن میں مولانا محمد اسمٰعیل کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ قادرالکلامی محاورہ بندی، برجستگی اور آمد طبیعت کا خاصہ تھا اس لئے قومی ترقی کے لئے جدّ و جہد، صبر و محنت، اتفاق و اتحاد ہمت اور استقلال کی ضرورت پیش آئی تو ان عنوانات پر بکثرت نظمیں لکھیں۔ لیکن مولانا کا اصل کارنامہ اُن کی وہ

نظمیں ہیں جو اُنہوں نے بچّوں کے لئے لکھیں۔ بچّوں کی ذہنیت اور نفسیات کا گہرا مطالعہ کر کے ایک ناقابلِ تقلید اور عدیم المثال طرز میں پند و نصائح کے موضوعات اس طریقے سے پیش کئے کہ بچّے کی سادہ طبیعت خود بخود اس کی طرف مائل ہو جائے اور نصیحت اس کے دل پر نقش کالحجر بن کر رہ جائے۔ مولانا نے تمثیلات کے پردے میں اخلاقی مضامین و مطالب اس طرح ادا کئے کہ دوسرے کے بس کی بات نہ تھی اور یہی ان کے صاحبِ طرز ہونے کی دلیل ہے۔

ایک حکایت بیان فرماتے ہیں کہ ایک کچھوا خشکی میں جا رہا تھا۔ ایک خرگوش نے اس کو دیکھا اور طنزاً کہا۔

میاں کچھوے تمہاری چال ہے یہ
یا کوئی شامت اور وبال ہے یہ
یوں قدم پھونک پھونک دھرتے ہو
گویا آتو زمیں پہ کرتے ہو

یہ طعنہ سُن کر کچھوے کو جوش آگیا اور اُس نے کہا:

یوں زبانی جواب تو کیا دوں
شرط بَد کر چلو تو دکھلا دوں
تم تو ہو آفتاب میں ذرہ
پر مٹا دوں گا آپ کا غرّہ

خرگوش کو غصہ تو بہت آیا لیکن کیا کرتا، با دلِ نخواستہ یہ ذلّت گوارا کر لی اور کہا:

ہے مناسب کہ امتحاں ہو جائے
تاکہ عیب و ہنر عیاں ہو جائے

الغرض ایک حد ٹھیرا کر دونوں روانہ ہوئے۔ چونکہ خرگوش کو اپنی تیز رفتاری پر ناز تھا اس لئے:

ایک دو کھیت چوکڑی بھر کے
اپنی چستی پہ آفریں کر کے
کسی گوشے میں سو گیا جا کر
فکر کیا ہے چلیں گے سستا کر
اور کچھوا غریب آہستہ
چلا سینے کو خاک پر گھستا
سوئی گھنٹے کی جیسے چلتی ہے
یا بتدریج چھاؤں ڈھلتی ہے
یوں ہی چلتا رہا بہ استقلال
نہ کیا کچھ اِدھر اُدھر کا خیال
کام کرتا رہا جو پے در پے
کر گیا رفتہ رفتہ منزل طے

لیکن خرگوش پڑا سوتا رہا اس لئے:

جب کھلی آنکھ تو سویرا تھا
سخت شرمندگی نے گھیرا تھا

یہاں تک نظم پڑھنے کے بعد بچّے نے انتہائی لطف حاصل کیا۔ بے حد مزا آیا اُسے، اور مولانا نے کہ بڑے ماہرِ نفسیات تھے اندازہ لگایا کہ یہی وقت ہے نصیحت کرنے کا۔ اس لئے فوراً شعر کہا:

صبر و محنت میں ہے سرافرازی
سُست کچھوے نے جیت لی بازی
نہیں قصّہ یہ دل لگی کے لئے
بلکہ عبرت ہے آدمی کے لئے

پند و نصیحت کے اس انداز پر قربان ہو جائیے۔ مولانا کے صاحبِ طرز ہونے پر کون کافر ہے جو ایمان نہ لے آئے گا۔

بابائے اردو
مولوی عبدالحق

جب غالب نے اپنی ہتک عزت کا دعویٰ کیا

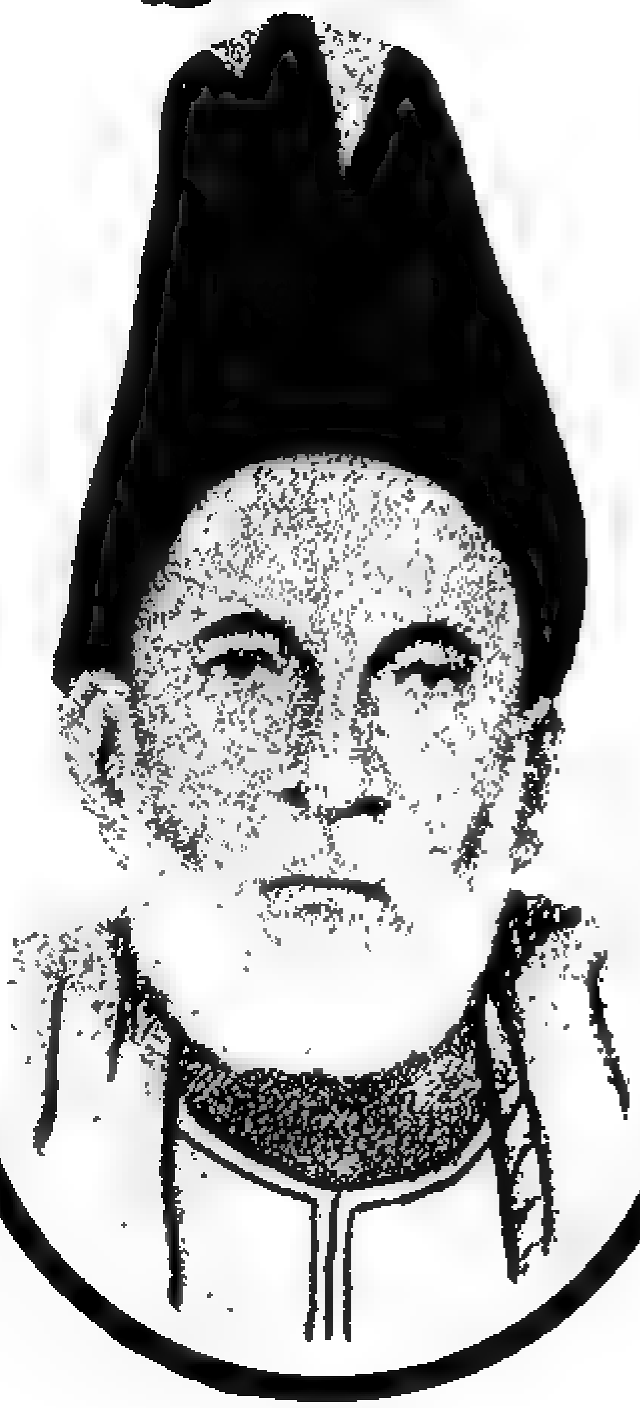

غدر کے بعد دلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور کوئی دل بہلانے کا سامان نہ تھا، مرزا نے فارسی لغت کی مشہور کتاب "برہان قاطع" کو دیکھنا شروع کیا، اس کے مؤلف محمد حسین کے اجداد تبریز سے آئے تھے اور اگرچہ وہ خود ہندوستان میں پیدا ہوئے اور ساری عمر دکن میں رہے مگر "تبریزی" کہلاتے تھے۔

مرزا کو اس کتاب میں غلطیاں نظر آئیں؛ جنھیں انھوں نے ایک مختصر کتاب کی صورت میں مرتب کیا اور اس کا نام "قاطع برہان" رکھا" چنانچہ ایک خط میں صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:-

"اس درماندگی کے دنوں میں........
"برہان قاطع" میرے پاس تھی اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزارہا لغت غلط، ہزارہا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارات پادر ہوا۔ میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور "قاطع برہان" اس کا نام رکھا ہے۔

یہ کتاب بہ قول مولانا حالی ۱۸۶۰ء (۱۲۷۶ھ) میں پہلی بار، اور ۱۸۶۱ء (۱۲۷۷ھ) میں بہ اضافۂ دیگر مضامین و فوائد 'درفش کاویانی' کے نام سے دوبارہ چھپی اس پر مرزا کی بڑی مخالفت ہوئی اور جواب میں "محرق قاطع" "ساطع برہان" "قاطع قاطع" اور "مؤید برہان" کتابیں لکھی گئیں۔

"ساطع برہان" کے جواب میں "نامۂ غالب" اور "مؤید برہان" کے جواب میں "تیغ تیز" خود مرزا نے دو رسالے لکھے، اور "محرق قاطع" کے جواب "دافع ہذیان" "لطائف غیبی" اور "سوالات عبدالکریم" تین رسالے مرزا کے دوستوں نے شائع کیے مگر "قاطع قاطع" کا جواب نہ خود مرزا نے لکھا اور نہ کسی اور نے۔

خواجہ حالی نے اس سے متعلق "یادگار غالب" میں

ایک لطیفہ لکھا ہے، فرماتے ہیں:-

"مولوی امین الدین کی کتاب 'قاطع قاطع' کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا۔ کیونکہ اس میں فحش اور ناشائستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا حضرت! آپ نے اس کا جواب نہیں لکھا"؟ مرزا نے کہا" اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے"؟

"تیغ تیز" میں بھی مرزا نے لکھا ہے کہ ایسے ادنیٰ درجے کے آدمی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنا میری شان کے خلاف ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر وہ اس خیال پر قائم نہ رہے، بلکہ انہوں نے مولوی امین الدین پر" ازالہ حیثیت عرفی" کی نالش کر دی اور ۲۴ دسمبر ۱۸۶۷ء کو عرضی دعویٰ داخل عدالت کر دیا۔ خواجہ حالی اس مقدمے کے متعلق" یادگارِ غالب" میں لکھتے ہیں:-

"مرزا نے ایک فارسی رسالے کے مؤلف پر جو" قاطع برہان" کے جواب میں لکھا گیا تھا اور فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ ازالہ حیثیت عرفی کی نالش بھی کی تھی مگر جب کامیابی کی امید نہ رہی تو آخر کار انھوں نے راضی نامہ داخل کر دیا۔ اثنائے تحقیقات میں دلی کے بعض اہلِ علم عدالت میں اس بات کے استفسار کے لئے بلائے گئے تھے کہ جو فقرے مدعی نے دعوے کے ثبوت میں پیش کئے ہیں۔ آیا فی الواقع فحش و دشنام مفہوم ہوتا ہے، یا نہیں؟

انھوں نے غریب ملزم کو سزا سے بچانے کے لئے ان فقروں کے ایسے معنی بیان کئے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو۔ ان مولویوں کا مرزا سے ملنا جلنا تھا، کسی نے پوچھا حضرت! انھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی"؟ مرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا:-

بہ ہر چہ در نگری جز بہ جنس مائل نیست
عیار بے کسیِ من شرافت نسبی است

اس مقدمے کی پوری مسل کی نقل اب اتفاق سے دستیاب ہو گئی ہے۔ جس کے مطالعے سے اس مقدمے کے تمام حالات بہ خوبی واضح ہو جاتے ہیں۔ اس مقدمے کے دوران میں مولوی ضیاء الدین کی پیشی کے وقت کسی نے حاکم عدالت کے کان میں کہہ دیا کہ "یہ بڑے معزز آدمی ہیں انھیں کرسی ملنی چاہیئے"! چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس زمانے میں دہلی سے جو انگریزی اخبار "مفصلائٹ" نکلتا تھا اس میں ۱۲ مارچ ۱۸۶۸ء کو ایک خط چھپا تھا، جس کا مکتوب نگار بڑے تعجب سے لکھتا ہے:-

"میں سخت حیران و پریشان ہوں کہ اسسٹنٹ کمشنر نے مولوی ضیاء الدین کو کس بنا پر کرسی دی۔ اس رعایت سے غالب کے ساتھ ناانصافی ہوئی۔ وہ سوسائٹی میں نہایت معزز ہیں، لفٹیننٹ گورنر کے دربار میں انھیں مولوی ضیاء الدین سے اونچے درجے پر بٹھایا گیا تھا"

غالب کا یہ مقدمہ خارج کر دیا گیا تھا۔

غالب
دو شعر - دو شمارے

غلام رسول مہر

درتہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانۂ
تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

کسی شاعر کے کلام پر نقد و تبصرہ کے سلسلے میں ایک دستور یہ بھی ہے کہ اس کے بعض اشعار کا موازنہ اساتذۂ شہیر کے بعض اشعار سے کیا جائے، لیکن ظاہر ہے کہ اسے فضیلت و برتری کی مستند دستاویز نہیں سمجھا جا سکتا۔ بعض اشعار میں ایک استاد کا دوسرے پر سبقت لے جانا بالکل ممکن، بلکہ اغلب ہے، مگر من حیث الکل ترجیح کا فیصلہ یوں نہیں ہو سکتا۔ میں تو اس کا بھی قائل ہوں کہ ایک نوآموز اتفاقاً ایسا شعر کہہ سکتا ہے، جس کی مثال اکابر کے کلام میں بھی شاید ہی مل سکے۔

"آبِ حیات" میں ایک واقعہ مرقوم ہے کہ ایک دن مرزا رفیع سودا مشاعرے میں بیٹھے تھے۔ لوگ باری باری اپنی غزلیں پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحبزادے نے، جس کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی، غزل پڑھی۔ مطلع یہ تھا:

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

گرمیِ کلام سے سودا بھی چونک پڑے۔ پوچھا "کس نے مطلع پڑھا؟" لوگوں نے صاحبزادے کی طرف اشارہ کیا۔ سودا نے بہت تعریف کی۔ کئی مرتبہ مطلع پڑھوایا اور کہا "میاں لڑکے جوان تو ہوتے نظر نہیں آتے۔" خدا کی قدرت کہ انہیں دنوں میں لڑکا جل کر مر گیا۔

یہاں سوال سودا کی پیش گوئی یا اس کے ثبات و حکمت کا نہیں، سوال صرف یہ ہے کہ بارہ تیرہ برس کے لڑکے نے ایسا مطلع کہہ دیا جو مشاق اور مسلّمہ استاد کے لئے بھی باعثِ فخر تھا۔ سودا بھی ایسے مطلع کو اپنی شان سے فروتر نہ سمجھتے۔

غرض اس قسم کا موازنہ کسی ایک کی فضیلتِ کُلی کا معیار نہیں بن سکتا، لیکن یہ طریقہ محاسن و دقائقِ شعر کی توضیح کے لئے بہت موزوں ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اگر ایک نقاد ایسے موازنے میں ایک استاد کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے تو اسے بہر حال مسلّم مانا جائے۔ ممکن ہے کسی دوسرے صاحبِ ذوق کو دوسرے استاد ہی کا کلام بہتر نظر آئے اور وہ اسی کی خوبیوں کے مختلف پہلو پیش کر دے، مگر اس طرح محاسنِ اشعار کے نکات بخوبی بروئے کار آجاتے ہیں اور یہ امر بجائے خود مفید و نفع بخش ہے۔

زندگی میں انسان کو گوناگوں تجربے ہوتے ہیں۔ ارباب غور و فکر انہیں تجربات سے بنیادی اصول و حقائق وضع کر لیتے

ہیں، لیکن یہ چیز دقیقہ سنجی اور دور اندیشی کی محتاج ہے اور دقیقہ سنج نظر سے ہر انسان بہرہ مند نہیں ہوتا۔

تقریباً ہر فرد اس حقیقت سے آگاہ ہوگا کہ انسان نے سر پر بھاری بوجھ اٹھا رکھا ہو تو اس کے چلنے میں اختیار کی جگہ اضطرار رونما ہو جاتا ہے۔ وہ بوجھ سے دبا ہوا پاؤں اٹھاتا ہے تو سنبھل کر نہیں رکھ سکتا اور گراں باری اسے راستے کے نشیب و فراز یا کسی دوسری آزار رساں چیز کی دیکھ بھال کی مہلت بھی نہیں دیتی۔ چناں چہ ایسے آدمی کے لئے ٹھوکروں سے بچے رہنا یا سنگ ریزوں اور کانٹوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے لیکن جس شخص کے سر پر کوئی بوجھ نہ ہوگا، وہ اس قسم کے ہر خطرے سے مامون رہے گا۔ کیچڑ سے دامن بچائے گا۔ سنگ ریزے اور کانٹے راستے میں دیکھے گا تو اٹھا کر ایک طرف پھینک دے گا تا کہ بے خبری میں کسی دوسرے کے پاؤں زخمی نہ ہوں۔

یہ عام تجربہ ہے، مگر اس سے صرف مرزا غالب ہی کا دل و دماغ ایک اعلیٰ درجے کا اصول پیدا کر سکا۔ وہ کہتا ہے:

براہِ کعبہ زادم نیست، شادم کہ سبکباری
بہ رفتن پائے بر خارِ مغیلانم نمی آید

'میں نے کعبے کا قصد کر رکھا ہے، سفر میں جو ضروری چیزیں درکار ہوتی ہیں، وہ پاس نہیں، تاہم خوش ہوں کہ اگر وہ چیزیں پاس ہوتیں تو سر پر بھاری بوجھ اٹھانا پڑتا اور راستے کی آزار رساں چیزوں سے بچتے ہوئے سفر طے نہ کیا جا سکتا۔ اب بوجھ سے آزاد ہوں اور ببول کے کانٹوں سے بچتا ہوا آگے بڑھ رہا ہوں۔'

یوں یہ اصول سامنے آ گیا کہ دنیا کی کوئی بھی حالت نہ علی الاطلاق اطمینان بخش ہے اور نہ علی الاطلاق غیر اطمینان بخش، ایک پہلو اطمینان کا ہے، تو ساتھ بے اطمینانی بھی موجود ہے۔ جس کے پاس زادِ راہ ہو، اس کے لئے جراحتِ پا کے خطرے

غالب پر یہ بھی —
لکھا گیا ہے —

اس میں شک نہیں کہ غالب ایک اچھے شاعر اور ادیب تھے لیکن وہ فرشتہ نہیں تھے انسان تھے غلطیاں ان سے بھی ہوئیں۔

ڈاکٹر مسیح الزماں

★

اگر ہم معترضوں کے ساتھ پورے طور پر اتفاق نہ بھی کریں تو اتنا ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ (دیوان غالب میں) کتنے ہی شعر ایسے ہیں جو لفظی بھول بھلیاں سے زیادہ نہیں۔

مالک رام

★

غالب کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے کوئی خوبی اس میں نہ تھی۔ حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ تنگ دل ایسا تھا کہ سارے بھائی بندوں کی حق تلفی کرنے میں اس کو عار نہ تھا۔ جس روز ذوق مر گیا تو خوش ہو کر کہتا تھا آج بھٹیاروں کی بولی بولنے والا مر گیا۔ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا صہبائی شعر کہنا کیا جانے، نہ اس نے شراب پی، نہ معشوقوں کے ہاتھ سے جوتیاں کھائیں۔ نہ جیل خانہ میں پڑا۔ طامع ایسا تھا کہ ایک ایک قصیدہ دس دس جگہ بیچتا تھا۔

مولوی ذکاء اللہ دہلوی

موجود ہیں۔ بے زاد آدمی کو ایسا کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا، البتہ بے زاد ہونا بجائے خود جس تشویش کا باعث ہے، اس سے وہ بچ نہیں سکتا۔

اساتذہ ایک دوسرے کے کلام سے استفادہ بھی کرتے رہتے ہیں، جسے حق ناشناس لوگ سرقہ قرار دے لیتے ہیں۔ بعض اوقات یہ استفادہ علم و شعور پر مبنی ہوتا ہے۔ مثلاً کسی استاد کا کوئی شعر دیکھا تو خیال ہوا کہ مضمون اچھا ہے، مگر ایسے انداز میں نہیں بندھ سکا، جس سے اس کی تمام خوبیاں پوری طرح نمایاں ہو جاتیں۔ چناں چہ بعض نکات کا اضافہ کر کے اسے دوبارہ باندھا اور اس کی شان بدرجہا بلند تر کر دی۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر کو کوئی پرانا مضمون باندھتے وقت یاد ہی نہ رہے کہ یہ پہلے بندھ چکا ہے۔ تمام متأخرین متقدمین کے کلام کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور مختلف مضامین ان کے ذہن میں محفوظ ہوتے جاتے ہیں۔ پھر ہر شاعر اپنے مشاہدے، احساس اور تخیل سے نئے نئے مضامین پیدا کرتا ہے۔ بعض اوقات اس کے حافظے سے کوئی پرانا مضمون نکل کر اچانک سامنے آجاتا ہے۔ اگر ایسا کوئی مضمون متقدم کے کلام سے بہتر طریق پر بندھ جائے تو سمجھنا چاہیے کہ اصل مضمون متأخر کا ہو گیا، لیکن اگر بہتر نہ بندھ سکے تو ماننا پڑے گا کہ ایک استاد کے کلام کو بگاڑ دیا۔

مرزا غالب کے کلام میں بھی استفادے کی مثالیں ملتی ہیں، جس طرح تمام دوسرے اساتذہ کے ہاں ایسی مثالیں موجود ہیں، مگر میری نظر سے اب تک مرزا غالب کا کوئی شعر نہیں گزرا، جو استفادے پر مبنی ہو، لیکن بدرجہا بہتر انداز میں نہ بندھا ہو خواہ مرزا کا استفادہ علم و شعور پر مبنی سمجھا جائے یا اسے لاشعور کا نتیجہ قرار دیا جائے۔

پہلا شعر:

مرزا غالب کا ایک مشہور شعر ہے:

نہ لٹتا دن کو تو کیوں رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

نفسِ مضمون میں اس سے ملتا جلتا ایک شعر نظیری نیشاپوری کا بھی ہے:

بہ عریانی ازاں شادم کہ از تشویش آزادم
گریبانے ندارم تا کسے از دستِ من گیرد

دیکھیے، دونوں کا بنیادی مضمون ایک ہے، یعنی دنیا کا ساز و سامان اور علائق انسان کے لیے تشویش و اضطراب کا سرچشمہ ہیں، ان علائق سے آزاد رہنا باعثِ اطمینان ہے لیکن دونوں کے بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نظیری کہتا ہے "میرے پاس لباس تک نہیں، لہٰذا تشویش سے فارغ البال ہوں۔ اگر کوئی چیز پاس ہوتی تو یہ اندیشہ رہتا کہ چھین لی جائے گی۔ اب ایسی کسی صورت کے وقوع کا امکان ہی نہیں۔"

تاہم یہ ادعائے محض ہے۔ مرزا غالب نے ادعا کافی نہ سمجھا۔ وہ کہتے ہیں: "میرے پاس ساز و سامان تو تھا، مگر دن کے وقت رہزن لوٹ کر لے گیا اور میں قلاش محض رہ گیا۔ جب تک سامان تھا، خبرداری کی تشویش موجود تھی۔ رات کے وقت اطمینان کی نیند نہیں آتی تھی، کیوں کہ چوری کا اندیشہ لاحق رہتا تھا، اب رات کو بے خبر سوتا ہوں اور رہزن کو دعا دیتا ہوں کہ اگر وہ دن کے وقت سب کچھ ہتھیا نہ لیتا تو میرے لئے رات کو بے خبر ہو کر سونا کیوں کر ممکن تھا؟

پھر مرزا کی دقیقہ سنجی کے کمالات دیکھیے:

(۱) انھوں نے دو شخص پیدا کیے، جو سامان لے جا سکتے تھے، ایک رہزن، جو دن دہاڑے زور و قوت سے سب کچھ لوٹتا ہے، دوسرا چور، جو رات کو چھپ چھپا کر سامان اٹھاتا ہے۔

(۲) یقیناً رہزن اور چور دونوں موجب تشویش ہیں، لیکن رہزن دن کو لوٹتا ہے، اس لئے نیند میں خلل انداز نہیں

ہوسکتا۔ چور رات کو چوری کرتا ہے اور اس کے متعلق اندیشہ رات کی نیند حرام کر دیتا ہے۔

(۳) انسان رات ہی کو سوتا ہے اور اسے اطمینان اور فارغ البالی کی سب سے بڑھ کر ضرورت رات ہی کو پیش آتی ہے رہزن نے دن کو دستِ تغلب دراز کیا اور رات کے لئے اطمینان کا سامان فراہم کر دیا۔ لہٰذا مرزا کے نزدیک وہ دعا کا مستحق ٹھہرا

(۴) پھر مرزا نے یہ پورا واقعہ اس انداز میں پیش کیا گویا یہ ہو چکا ہے، یہ نہیں کہ "ہونے والا ہے۔

اس طرح نظیری کے مقابلے میں پورے واقعہ کو ایک وقوعی اور عامتہ الورود صورت دے دی اور مضمون کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ گویا اگر استفادہ بھی کیا تو اس شان سے کہ مضمون نظیری کا نہ رہا، اپنا بنالیا۔

دوسرا شعر:

مرزا غالب کا ایک شعر ہے:

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اس سے ملتا جلتا ایک شعر نظیری کا بھی ہے، جس میں وہ "کام نہنگ" تک استعمال کر گیا ہے۔ کہتا ہے:

تمنائے گہر سرگشتہ ام دارد بہ دریائے
کہ در ہر گام صد جا راہ بر کامِ نہنگ افتد

یعنی گوہر کی آرزو مجھے اس سمندر میں سرگرداں لئے پھرتی ہے جہاں راستہ اس درجہ خطرناک ہے کہ قدم قدم پر سیکڑوں نہنگ منہ کھولے بیٹھے ہیں۔

یقیناً مضمون نہایت اچھوتا ہے اور اس حقیقت کا آئینہ دار کہ انسان انتہائی مشکلات سے گزرے بغیر کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ اور کسی بلند و شایاں مقصد نہیں پہنچ سکتا۔ گوہر کی آرزو میں سرگشتگی یعنی تردّد و بے قراری انسان کو تمام مشکلات سے بے پروا کر دیتی ہے۔

مرزا غالب نے اس مضمون میں اتنی جدتیں پیدا کرلیں کہ اسے اپنا مستقل مضمون بنالیا، مثلاً فرمایا:

۱۔ ہر موج ایک جال لئے ہوئے ہے اور مشاہدہ اس کا شاہد ہے۔

۲۔ یہ جال کیسے ہیں؟ ڈوریوں سے تیار نہیں ہوئے، بلکہ سیکڑوں مگرمچھ منہ کھول کر بیٹھ گئے۔ اس طرح ان کے تسلسل و تواتر سے ہر جال کے حلقوں نے ترکیب پائی۔

۳۔ خطرات و مہالک کا یہ نہایت دہشت ناک منظر پیشِ نظر لا کر سوچتے ہیں کہ قطرے کو اسی ماحول میں گوہر بننا ہے۔ وہ جب تک ان تمام خطروں کو صبر و استقامت سے انگیز نہ کرے گا، اس کے لئے درجۂ کمال پر پہنچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۴۔ تمام خطرات بیان کر دیئے، مگر معیّن طریق پر یہ نہ بتایا کہ عملِ ارتقا میں قطرے پر کون کون سی آفتیں آئیں گی۔ اس لئے کہ ان کا تعیّن ہو ہی نہیں سکتا تھا اور عدم تعیّن کی حالت میں بھی شعر پڑھنے والا خود خطرات کا اندازہ کر سکتا ہے۔ حقیقتاً عدم تعیّن زیادہ لطف انگیز ہے۔

"مرزا غالب کا صرف یہی کارنامہ نہیں کہ انہوں نے ہماری نظم و نثر کے خزانے میں بیش بہا اضافہ کیا بلکہ ان کی عظیم الشان شخصیت اور مثالی زندگی بھی ہماری قومی روایات کا بیش بہا زیور ہے۔"

شیخ محمد اکرام

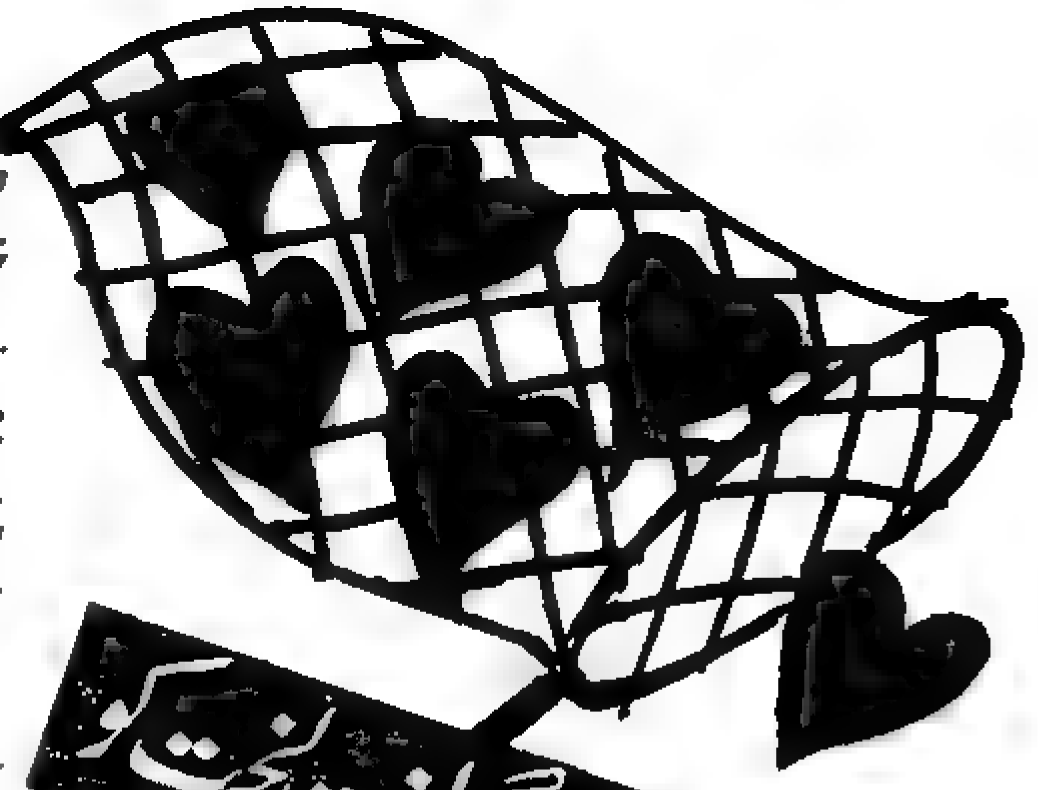

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو

عابد رضا بیدار

میر ناصر علی نے "صلائے عام" کے پرچے جون ۱۹۲۴ء میں "یادِ رفتگاں" کے عنوان سے غالب کو بھی یاد کیا ہے —— لکھتے ہیں:

"... قاسم جان کی گلی میں نواب ضیاء الدین خان بہادر رئیس لوہارو، کی شاندار کوٹھی سی جس کے صحن میں ہاتھی بندھا رہتا تھا۔ اس کوٹھی کی شکل بدل گئی...

... بلی ماراں میں نواب امین الدین خان بہادر ان کے بھائی کی بہت وسیع کوٹھی تھی۔ اس کوٹھی کے صحن میں بھی ہاتھی بندھا رہتا تھا۔ ان کوٹھیوں میں سے ریاست لوہارو کا قدیم سے بڑا نام تھا۔ آخر الذکر کوٹھی میں نواب علاء الدین احمد خان بہادر نے شطرنج کلب کی طرح ڈالی جس میں اکثر حکام انگریزی شریک ہوتے تھے۔ اب لوہارو خاندان کے اکثر اصحاب

لال دروازے رہتے ہیں۔ نواب علاء الدین احمد خان بہادر کو عربی و فارسی میں کمال تھا۔ راقم نے مقامات حریری آپ سے بلی ماروں کی کوٹھی میں پڑھی۔ دونوں کوٹھیوں کے درمیان موڑ پر جناب غالب مرزا نوشہ کا کوٹھا تھا۔ میرے والد مجھے حضرت کی خدمت میں اس غرض سے لے گئے کہ اسے گلستان پڑھا دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ پڑھانا تو مشکل ہے، کہو تو دوسری گلستاں لکھ دی جائے۔ حضرت کو ان دنوں ضعف بہت تھا۔ چارپائی پر لیٹے رہتے تھے بہت کم اٹھ کر بیٹھتے تھے۔ والد نے کہا کہ آپ کے دیوان میں جو چھپا ہے، آپ کے اکثر شعر چھپنے سے رہ گئے —— چناں چہ ایک شعر والد نے سنایا۔ وہ شعر تو مجھے یاد نہیں، مگر حضرت نے اس کی شرح جو بیان کی وہ کچھ کچھ یاد ہے۔ فرمایا کہ کبھی یہ شعر ایک کالی عورت کی تعریف میں ہے کہ سانولی رنگت جو اس کی ہے یہ سر کے بالوں کا عکس ہے کہ بدن کی صفائی آئینہ کی طرح اس درجہ کی ہے کہ سر کے بالوں کے عکس سے سیاہی دکھائی دیتی ہے۔"

مولانا مہر کی "غالب" کو پڑھ کر مورخ، اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے مولانا مہر کو ایک طویل خط لکھا تھا جو مہر صاحب نے لاہور میں اپنے اخبار "انقلاب" کے ۱۹۲۷ء کے کسی پرچہ میں شائع کیا۔ اس خط میں غالب کے ایک شاگرد جمشید علی خاں اختر دہلوی کا ذکر بھی کیا۔ تلامذہ غالب میں یہ نام بالکل نیا تھا۔ اس کے بعد غالب اور غالب کے ایک شاگرد داؤد ابراہیم خلیل، محرر عدالت شاہ آباد ضلع آرہ (بہار) کی مراسلت درج کی۔ خلیل نے مرزا کے

پاس اپنا دیوان بغرضِ اصلاح بھیجا۔ واپسی میں دیر ہوئی تو تقاضے کا خط بھیجا اور یہ بھی لکھا کہ شعری اصلاح ہی بڑا کرم ہے مزید برآں ڈاک کا خرچ ہو سو وہ استاد کو زیر بار کرنا نہیں چاہتے اس فارسی خط کے جواب میں غالب نے اردو میں جو جواب دیا وہ دلچسپی سے خالی نہیں —— فرماتے ہیں:

"جناب منشی ابراہیم خلیل تخلص کو غالب کمینۂ بازاری فرومایہ کا سلام۔ خط کی پشت پر جواب لکھنے سے غرض یہ ہے کہ جس عبارت پر سہ کا ہندسہ ہے۔ اس کو ملاحظہ فرمائیے جس شخص کا سیکڑوں روپیہ مہینہ کا صرف ہو اس کو دو چار آنوں میں زیر باری کا لفظ لکھنا گالی دینے سے بدتر ہے، یا کوئی دوکان دار کسی اپنے بھائی دوکان دار کو لکھے۔ بہر حال بموجب آپ کی رائے کے زیر بار نہیں ہوتا اور آپ کا مجموعہ اشعار بیرنگ بھیجتا ہوں" ۱۲

(عفو کا طالب، غالب۔ جمعہ ۴، جنوری ۱۸۶۱ء)

اس خط کو نقل کرنے کے بعد مولانا اکبر خاں نے اپنی اور ایک مجاہد جنگ آزادی، محمود خاں نجیب آبادی کے تعلق کی حکایت بیان کی ہے:

"میرے والد مرحوم و مغفور اپنی جوانی کے عالم میں ۶۵ء یا ۶۶ء میں مراد آباد میں غالب سے ملے تھے اور مرزا بہت تپاک اور عزت سے پیش آئے تھے۔ والد مرحوم جب اپنی ملاقات کا ذکر کرتے تھے تو غالب کو "مرزا نوشہ" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت میں نجیب آباد نے بھی خصوصی حصّہ لیا تھا۔ نواب محمود خاں مرحوم مغفور نے ۱۸ مہینے یعنی ڈیڑھ سال تک نجیب آباد کی فوجوں نے انگریزی فوجوں کا مقابلہ کیا اور اپنی خود مختارانہ حکومت کو اس ضلع پر قائم رکھا۔ آم سوت کی آخری لڑائی میں نجیب آباد کی جنگی قوت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد نواب محمود خاں مرحوم نے لڑائی کا ارادہ ترک کر دیا اور نجیب آباد سے نگینہ۔ نگینہ سے بریلی اور بریلی سے ترائی کے علاقے میں ہوتے ہوئے نیپال چلے گئے۔"

"۔۔۔۔ نیپال میں چند ماہ قیام کرنے کے بعد واپس آئے اور رام پور اپنے ننھیال میں آکر فروکش ہوئے۔ نواب محمود خاں کی گرفتاری کے لئے گورنمنٹ رام پور کی طرف سے انعامی اشتہار تھا۔ رام پور والوں کی اس شرافت کا نجیب آباد کے ہر پٹھان کو اقرار ہے کہ باوجود واقفیت نواب محمود خاں کو گرفتار کرانے کے لئے کوئی مخبری نہیں کی۔۔۔ آخر میں نواب محمود خاں کے ایک پروردہ کو نواب محمود خاں کے رام پور میں ہونے کا علم ہوا اور اس نے ازراہ نمک حرامی رام پور کی جامع مسجد کے دروازے میں مراد آباد کی پولیس کو لاکر نواب محمود خاں کو گرفتار کرایا۔ جب نواب محمود خاں اپنے آپ کو پولیس کی حراست میں دیکھ کر پولیس افسر کی ہدایت کے موافق اس پالکی میں سوار ہونے لگے جو جامع مسجد کے دروازے پر لاکر رکھ دی گئی تھی تو انہوں نے نشاندہی

کرنے والے نمک حرام کو اس کا نام لے کر مخاطب کیا اور کہا:

زہر غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

یہ شعر اس مذکورہ واقعہ کی وجہ سے اس نواح میں بہت مشہور ہے۔۔۔"

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ غالب کے شعر ان کی زندگی ہی میں خاصی مسافت طے کر لیتے تھے اور اب سے بہت پہلے لوگ ان کی ترکیبیں بھی اپنانے لگے تھے۔

دہلی کے ایک شاعر تھے، میرزا حسنو، حسن تخلص تھا، ایسے صاف اور سادہ و پُرکار کہنے والے تھے کہ ان پر اگلوں کا شبہ گزرتا تھا۔ ان کے ایک دیوان کا مخطوطہ مجھے شروع میں حبیب گنج (علی گڑھ) میں ملا۔ اس پر کوئی پتہ نشان نہیں تھا، میں نے اسے "سحر البیان" والے حسن کا دیوان سمجھ لیا اور ایک مجلّہ میں اس کا تعارف بھی کرا دیا (۱۹۵۲ء)۔ مگر کچھ دن بعد رام پور ہی میں ان ہی صاحب کا ایک صاف، خوش خط اور بڑا مکمل دیوان دستیاب ہو گیا جس سے یہ واضح ہوا کہ یہ تو میرزا حسنو ہیں جو رام پور آ گئے تھے اور ۱۲۸۲ھ میں رام پور آ گئے تھے اور ۱۲۸۲ھ میں رام پور ہی میں ان کا انتقال ہوا، یعنی غالب سے تین سال پہلے — غالب کی طرح یہ بھی نواب یوسف علی خاں (رام پور) کے متوسلین میں سے تھے۔ میرزا نوشہ کے ہم عصر تھے، شاید کچھ مراسم بھی ہوں۔ مرزا غالب کے سلسلے میں ان کا ایک شعر دیوان مذکور میں اسی طرح نظر سے گزرا:

رہا ہے کون اگلوں میں حسن یا میرزا نوشہ
یہ دو باقی تھے رندوں میں سو بن کر پارسا بیٹھے

رسالہ "دہلی سوسائٹی" کے شمارۂ دوم (۱۸۶۶ء) میں غالب کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ میں نے املا اسی طرح رہنے دی ہے:

"کیفیت جلسۂ عام دہلی سوسائٹی واقعہ ۲ فروری ۱۸۶۶ء جناب کرنیل ہلٹن صاحب بہادر چیرمین۔۔۔ (۱) پہلے سکریٹری (پیارے لال) نے کیفیت جلسہ گزشتہ پڑھ کر سنائی۔ اس کو سب صاحبوں نے تصدیق کیا۔ (۲) سکریٹری نے ایک جلد "درفش کاویانی" مصنفہ و مرسلہ نواب اسداللہ خاں صاحب غالب پیش کی۔ تجویز ہوئی کہ نواب صاحب کو خط شکریہ سوسائٹی کی طرف سے تحریر ہو۔ چناں چہ دوسرے روز خط خدمت میں نواب صاحب ممدوح کے بھیجا گیا۔"

اس رپورٹ سے "درفش کاویانی" کی اشاعت کا مہینہ متعین ہوتا ہے اس لئے یہ اطلاع بھی اہم ہے۔ بقیہ کارروائی اس طرح درج ہے:

"کیفیت جلسۂ عام دہلی سوسائٹی واقع ۷ اپریل ۱۸۶۶ء روز شنبہ۔۔۔۔ (۲): سکریٹری نے رائے نواب اسداللہ خاں صاحب بہادر غالب اور مرزا الٰہی بخش صاحب بہادر اور منشی حکم چند اور مولوی سبحان بخش صاحب اور مرزا فاضل بیگ کی درباب دو کتابوں کے جو محکمۂ ڈائرکٹری مدارس پنجاب سے سوسائٹی میں آئی تھیں پڑھ کر سنائی اور سوسائٹی کا روبکار بھی بنام ڈائرکٹر صاحب بہادر حاضرین جلسہ کے روبرو پڑھا۔ سب صاحبوں نے اسے منظور فرمایا اور روبکار معہ رائے صاحبان مذکورہ بالا کے ڈائرکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں روانہ کیا گیا۔"

۶ مارچ کے جلسہ میں میجر فلر ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کی بھیجی ہوئی دو کتابوں کا تذکرہ آیا تھا جو انہوں نے سوسائٹی کے پاس بغرض اظہار رائے روانہ کی تھیں مگر کارروائی میں کتابوں کے نام مذکور نہیں ہیں۔ لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اجلاس میں ان پر کچھ بحث ضرور ہوئی تھی اور سکریٹری نے یہ تجویز کیا تھا کہ ان پر رائے مرتب کرنے کے لئے ایک ذیلی کمیٹی ترتیب دی جائے تو مناسب ہوگا۔ یہ تجویز اس وقت تو طے نہیں ہوئی اور نہ رسالۂ مذکور میں اس کا اشارہ ملتا ہے لیکن بعد میں یہ کمیٹی ضرور بنی جس کے اراکین کے نام اوپر مذکور ہوئے ہیں۔

سوسائٹی کے بانی کولڈ اسٹریم کے دہلی سے چلے جانے کی وجہ سے وہ اس سوسائٹی سے بھی الگ ہوگئے۔ ان کے رخصت ہونے پر سوسائٹی مذکور کی طرف سے ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ اس پر چالیس کے قریب معززین کے دستخط ہیں۔ ممکن ہے یہ سب مذکورہ سوسائٹی کے اراکین ہی ہوں۔ جن لوگوں کی مواہیر اس کاغذ پر ثبت ہیں اس میں "نواب اسد اللہ خاں غالب" کی مہر بھی ہے جو آخر سے چوتھا نام ہے۔

۵ مئی ۱۸۶۶ء کو بھی اس سوسائٹی کا ایک جلسہ ہوا جس میں علائی (نواب علاء الدین خاں صاحب) نے "زبان اُردو" پر ایک طویل اور بڑا دلچسپ مضمون بھی پڑھا تھا۔ غالب کے ضمن میں بھی انہوں نے جو کچھ ذکر کیا وہ یہ تھا:

"... شرفائے شاہ جہاں آباد میں ایسے طبع آزمایان خوش فکر اور ایسے سخن وران کامل گزرے ہیں کہ ان کا کلام پاکیزہ موجود اور مرتب اور ہم پلّہ اساتذۂ ایران معتبر ہے۔ اکثر ان حضرات سے رہ گزار عالم بقا ہوئے اور بعض اس وقت میں بھی موجود ہیں ..... ادام اللہ زماں ظلہم میں یہاں ان کے اسماء درج صحیفہ کرتا ہوں: جرأت وانشا و رنگین و نصیر و معروف و ناسخ، شہید و مسرور و احسان یہ لوگ کچھ پہلے شمار کئے جاتے ہیں۔ افضل المتاخرین واکمل المتقدمین، اوستادی، عمّی میرزا اسد اللہ خاں غالب اور حضرت عمّی مخدومی مطاعی نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیّر رخشاں اور عزیزی واخی ثاقب سخن ور و سالک رضوان سلّمہم اللہ تعالیٰ... یہ بڑے نامی سخن سنجان زبان اردو اور شیریں کلامان ریختہ ہیں..."

"یہاں سے لازم ہے کہ مسودات و رواج نثر اُردو کے رواج کی حقیقت جس سے اصل رواج اردو مراد ہے، لکھے ... اگرچہ اہل لکھنؤ نے اپنی زبان کی آراستگی میں کوشش اچھی کی اور بہت پاکیزہ شیوہ و رنگ پر نثر ہائے اردو لطیف لکھتے ہیں مگر اس شہر میں بھی اچھے لوگ باقی ہیں اور ان کی عبارات اردو پاکیزہ و دلچسپ ہیں۔ بایں ہمہ یہ ایک شیوۂ خاص مذاق انگیز جو حضرت اوستادی و عمّی مولانا غالب نے نکالا ہے کسی کو نصیب نہیں حق یوں ہے کہ طرح بنائے ریختہ حضرت ہی نے ڈالی ہے اور خود ہی موجد اور خود ہی مکمل اس کے ہیں..."

خطوط غالب اور ان کی اہمیت کے بارے میں غالباً یہ پہلا اشارہ ہے اور اس کی اہمیت یوں بھی زیادہ ہے کہ خود غالب کی زندگی میں ان پر مضمون ایک جلسۂ عام میں پڑھا گیا۔

زندگی کی طرح موت بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے موت کے طریقے بھی الگ ہیں۔ قدرتی موت، خودکشی کی موت، حادثہ کی موت۔ بیمار جب مرجاتا ہے تو عزیز واقارب بہانے تراشتے ہیں کہ فلاں ڈاکٹر سے رجوع کیا ہوتا۔ فلاں طبیب سے رجوع کیا ہوتا۔ مریض کو یہ بیماری تھی۔ یہ بیماری نہیں تھی۔ مرنے والا مرجاتا ہے اور اس کے پیچھے یہ مسئلہ کھڑا ہوجاتا ہے کہ کاش نہ مرتا اور مرگیا تو کیوں؟

بڑے لوگوں کی موت کے اسباب کے بارے میں قیاس آرائیاں غریب کی موت کی بہ نسبت زیادہ کی جاتی ہیں۔ مثلاً میسولینی اور نیتاجی کی موت بہرحال آج تک معمہ بنی ہوئی ہے۔

غالب کی صد سالہ برسی کے دوران غالب کی موت کے بارے میں بھی طرح طرح کی رائے ظاہر کی گئی ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ موت کا سبب کثرت شراب ہے۔ کچھ کا قول ہے کہ غربت کے طفیل وہ زندگی سے مایوس ہوکر چل بسے۔ کچھ کا خیال ہے کہ وہ طبعی عمر کو پہنچ کر مرے تھے۔ ایک دریافت دہلی کے ایک مشہور ڈاکٹر عبدالجلیل کی بھی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ غالب کی موت ذیابطیس (DIABETES) کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ڈاکٹر جلیل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ کے سربراہ ہیں۔ وہ ایک زمانہ میں ہندوستان کی طرف سے انجمن اقوام متحدہ میں میڈیکل اسپیشلسٹ بھی رہے ہیں۔ ڈاکٹر جلیل نے فرمایا ہے کہ اگرچہ عالم شباب میں مرزا غالب ملیریا اور مختلف بیماریوں کا شکار ہوئے تھے لیکن ایام ضعف میں ان کی موت کی ذمہ دار صرف ذیابطیس جیسی مہلک بیماری ہے جس کی تاب نہ لاکر وہ کافی لاغر ہوگئے تھے۔ ان کو پیشاب میں کافی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا۔ راتوں کی نیندیں حرام ہوگئیں اور اسی عالم میں ان کی موت ہوگئی۔

ڈاکٹر جلیل کا خیال ہے کہ غالب کی موت صرف اسی جاں سوز علالت سے ہوئی اور آخرش غالب پر ذیابطیس غالب آگیا۔ ڈاکٹر جلیل نے کہا ہے کہ میرے پاس ایسی ٹھوس دستاویز ہیں جو ثابت کرسکتی ہیں کہ غالب کی موت صرف ذیابطیس کی وجہ سے ہوئی۔" ڈاکٹر عبدالجلیل کا کہنا ہے کہ غالب ہمیشہ ہمیشہ اقتصادی و معاشی بحران میں مبتلا رہے شراب اور سخاوت نے ان کو اسی مرض میں پریشان کرکے مالی مشکلوں کا احساس دلایا جس کی وجہ سے وہ وقت سے قبل ہی بڑھاپے کے در پر دستک دینے لگے۔ اور پریشان کن و مایوس کن واقعات سے تنگ آکر علاج و معالجہ کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہوسکے اور آہستہ آہستہ اسی غم میں سسکتے سسکتے ذیابطیس کے مستقل مہمان ہوگئے۔

ڈاکٹر عبدالجلیل صاحب نے غالب کی موت کے اس نئے سبب کا انکشاف بعض انگریزی اخبارات میں ایک بیان دے کر کیا ہے لیکن آخر وہ کیا ٹھوس ثبوت ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غالب کی موت ذیابطیس سے ہوئی تھی ابھی تک منظر عام پر نہیں آئے ہیں۔ ●●

جب غالب کے نام پر پورے ملک کو اپریل فول بنایا گیا

اپریل ۱۹۲۷ء میں غالب کے نام پر ماڈل اسکول بھوپال کے ہیڈ مولوی محمد ابراہیم خلیل نے پورے ملک کو اپریل فول بنایا تھا۔ انہوں نے غالب کے نام سے ایک بڑی مرصّع غزل کہہ کر اپنے اسکول کے میگزین "گوہر تعلیم" میں شائع کر دی تھی اور غزل کے ساتھ یہ نوٹ لکھ دیا تھا کہ انھیں یہ غزل کتب خانۂ یار محمد خاں کے بوسیدہ اوراق میں ملی تھی۔ اس کے بعد یہ رسالہ "ہمایوں" لاہور میں شائع ہوئی اور ہمایوں کے حوالے سے خواجہ حسن نظامی نے اس کو اپنے اخبار "منادی" میں شائع کر دیا ——

گویا اس طرح آج تک مولوی محمد ابراہیم خلیل غالب کے نام پر ہم سب کو اپریل فول بنا رہے ہیں کیونکہ یہ غزل نسخۂ عرشی میں بھی شامل ہے۔

—— مدیران

اپریل فول غزل

بھولے سے کاش وہ اِدھر آئیں تو شام ہو
کیا لطف ہو جو ابلقِ دوراں بھی رام ہو

تا گردشِ فلک سے یونہی صبح و شام ہو
ساقی کی چشم مست ہو اور دورِ جام ہو

بیتاب ہوں، بلا سے کن انکھیوں سے دیکھ لیں
اے خوش نصیب کاش قضا کا پیام ہو

کیا شرم ہے؟ حریم ہے، محرم ہے رازدار
میں سر بکف ہوں، تیغِ ادا بے نیام ہو

میں چھیڑنے کو، کاش اسے گھور لوں کہیں!
پھر شوخ دیدہ برسرِ صد انتقام ہو

وہ دن کہاں کہ صرفِ تمنا ہو لب شناس
ناکام بدنصیب کبھی شاد کام ہو

گھس مل کے چشم شوق قدم بوس ہی سہی
وہ بزمِ غیر ہی میں ہوں، پر اژدھام ہو

اتنی پیوں کہ حشر میں سرشار ہی اٹھوں
مجھ پر جو چشمِ ساقیِ بیت الحرام ہو

پیرانہ سال غالبِ میکش کرے گا کیا؟
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

فیض احمد فیض
کے آئینے میں غالب کا عکس

مختار زمن

غالب پر مشہور اردو شاعر فیض احمد فیض سے مسٹر مختار زمن نے ایک انٹرویو لیا تھا۔ انٹرویو انگریزی میں تھا۔ ذیل میں ہم اس کا ترجمہ شائع کر رہے ہیں۔ یہ انٹرویو اس لئے دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی کہ فیض احمد فیض نے غالب کو ایک بالکل انوکھے انداز میں دیکھا ہے۔ انہوں نے غالب کو بیسویں صدی کی قدروں کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور غالب کی ایک نئی تصویر دنیا کے سامنے پیش کی ہے۔

——— مدیران

زمن: ۔ فیض صاحب، مرزا غالب کا شمار صف اوّل کے شعراء میں ہوتا ہے، دیوان غالب جب پڑھیئے اس میں تازگی محسوس ہوتی ہے کیا آپ کو اس خیال سے اتفاق ہے؟ اور اگر ہے تو آپ کی رائے میں غالب کی عظمت اور اس کے کلام میں تازگی اور تنوع کا راز کیا ہے؟

فیض: ۔ تنوع اور تازگی عظیم شاعری کی خصوصیات ہیں۔ اگرچہ ہر بڑے شاعر کی عظمت کے اسباب یکساں نہیں ہوتے لیکن بعض خصوصیات مشترک ہوتی ہیں۔ غالب کی عظمت کا راز بھی حقائق کاملہ سے ہم آہنگی میں مضمر ہے۔

زمن: ۔ آپ "حقیقت" کی کیا تعریف کرتے ہیں؟

فیض: ۔ میں "حقیقت" کو ادبی معنی میں استعمال کر رہا ہوں یعنی سماج کے کسی خاص دور میں انسانیت کا نچوڑ، اسے آپ اس دور کی روح کا نام بھی دے سکتے ہیں، سماجی احساس بھی کہہ سکتے اور حقیقت پسندی کے عنوان سے بھی پکار سکتے ہیں۔ ایک ہی خیال کو ادا کرنے کی یہ مختلف

صورتیں ہیں، جیسا کہ ایک نقاد نے کہا ہے:
"ایک بڑا مصنف ایک خاص دور کے حقائق اور انسانیت کا مرقع پیش کرتا ہے، اسی لئے ان شعرا کے کلام میں جنہوں نے بھرپور انسانی تجربات کی روح کو تاریخ کے کسی بھی عہد میں اپنے قابو میں کر لیا۔ آج بھی وہی تازگی پائی جاتی ہے جو ان کے زمانے میں تھی۔ اس لئے کہ انسانی تجربات کا سلسلہ ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہے اور بڑے قدیم شعرا کے تجربات ہمارے دور کے تجربات ہی کی ایک کڑی ہوتے ہیں۔ یہ تجربات کیا ہیں؟ اپنے ساتھیوں کی آس اور یاس، حصول اور نا امیدی، درد اور خوشی، جسے نہ صرف ہم سمجھ سکتے ہیں بلکہ واقعی یا تخیل میں ہم خود بھی ان تجربات میں شریک و سہیم ہوتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے یہ بات غالب کے سلسلے میں ہمارے لئے تو خاص طور پر صحیح ہے۔ اس کی شاعری نے جاگیرداری نظام کے سماجی اور سیاسی انحطاط کے آخری دور کا احاطہ کیا۔ سترھویں صدی عیسوی کے وسط سے انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک اردو شاعری کے کلاسیکی دور میں جو تجربات ہوئے، اس کی شاعری میں ان کا نچوڑ موجود ہے۔ ولی سے لے کر اس کے اپنے زمانے تک اردو کے تمام بڑے شعرا کا جو "موڈ" تھا غالب نے اسے مجتمع کر کے اس پر اور سان رکھ دی۔ اگر آپ اس تمام "موڈ" کو ایک فقرے میں ادا کرنا چاہتے ہیں تو اسے جاگیردارانہ جذباتیت کا نام دے سکتے ہیں۔

زمن:۔ تو کیا آپ کے خیال میں اس دور کے شعرا، جن میں غالب بھی شامل ہے، جاگیردارانہ نظام کے پرستار اور اس کے استحکام کے خواہاں تھے۔

فیض:۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ شعرا اس تہذیب، ان اقدار اور اس پورے نظام زندگی کو دم توڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے جس کے وہ عادی تھے۔ لیکن ان کی نظر ان بنیادی سیاسی اسباب پر نہ تھی جو اس انحطاط کے ذمہ دار تھے اور نہ وہ اب تک اس صورت اور سماجی نظام کے ڈھانچے کو دیکھ سکتے تھے جو اس نظام کی جگہ لے رہا تھا جس کے وہ عادی تھے۔ ان کے اس موڈ میں تین اہم خصوصیات نظر آتی ہیں۔

(۱) جانی پہچانی چیزوں سے لگاؤ اور محبت جو ان کی نظروں کے سامنے ختم ہو رہی تھیں اور سماجی اقدار کو بدل رہی تھیں۔ اس صورت حال نے ان کے دل میں سوز و گداز اور درد و ملال کا عنصر پیدا کر دیا۔

(۲) حال کے خلاف بے اطمینانی، بدگمانی اور عدم اعتماد جس کا مطلب تھا افراتفری اور بعضوں کے لئے اقتصادی بدحالی۔ اس سے جو فلسفیانہ عناصر پیدا ہوئے وہ یہ ہیں: ماورائیت، دنیا کی انسانی زندگی کی بے ثباتی کا خیال جان و مال کو پرکاہ اور دنیادی عز و جاہ کو بیکار محض سمجھنا۔

(۳) اور آخر میں امید و بیم۔ امید خصوصاً غالب کا حصہ ہے۔ مگر عام طور ان دیکھی چیزوں اور نہ معلوم مستقبل کے متعلق خوف کا پایا جانا عام

موڈ تھا۔

غالب اس عہد میں آخیر میں پیدا ہوا۔ اس نے پرانے تجربات کا نچوڑ پیش کیا مگر ساتھ ہی اس نے ایک نئے ڈھنگ کا تعارف بھی کرایا۔ اس لئے کہ قدرت کے رحم میں ایک نیا دور جنم لے رہا تھا۔ یہی وہ بات ہے جو غالب کو دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے

زمن:۔ کیا آپ غالب کے طرز ادا اور طریقۂ بیان پر بھی کوئی تبصرہ کریں گے؟

فیض:۔ ہاں ضرور، میں نے جو کچھ اب تک کہا ہے وہ غالب کا جذباتی اور تجرباتی پہلو ہے۔ لیکن دوسرا پہلو اس کی خاص طرز ادا ہے۔ یعنی اس کی شاعری کی تشکیل اور قاعدہ، شاعروں کو کئی وجوہ سے اشاریت اور پہلو دار طرز ادا اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اوّل تو یہ کہ اپنے تجربہ کو بلاواسطہ اور صاف و سیدھے طریقے سے بیان کرنا بعض مواقع پر سیاسی مصلحتوں کے خلاف ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ نئے نئے تجربوں کے مقابلے میں جانے پہچانے طریقوں کے ذریعہ اظہار خیال کرنا زیادہ آسان ہے۔ تیسرے یہ کہ شاعر کے لئے حقیقت داخلی اور جذباتی شے ہوتی ہے۔ لیکن غالب کے یہاں اس داخلی اور ذاتی طریقۂ کار میں سماجی احساس کا عنصر بھی ملتا ہے۔ اسی لئے اس کا کلام تنگ نظر اور اپنی ذات تک محدود ہونے کے بجائے کل سماج کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ غالب کی طرز ادا کا ذکر کرتے وقت یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس نے منجملہ اور باتوں کے اردو شاعری کو انانیت اور خود فریبی کے پنجے سے آزاد کرایا ــــــ اس نے استعارے کا نیا استعمال یعنی TRANSFERED EPITHET شروع کیا (جیسے جنت نگاہ و فردوس گوش) اچھی شاعری کی وہ خصوصیت، یعنی تشبیہہ و استعارے سے مضمون آفرینی غالب کے یہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

ان سب کے علاوہ غالب نے مشاعروں کی ستم رانی سے شاعری کو نجات دلائی۔ اس لئے کہ اس نے وہ لفظی شعبدہ بازیاں ترک کر دیں جو مشاعروں کے ان سامعین پر جن کا ردعمل معلوم و معروف ہے اثر اندازی کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ اس طور پر اس نے "بلند سنجیدگی" کی شاعری کا راستہ ہموار کیا۔

ہم شاعروں میں غالب وہ پہلا شخص ہے جس نے شاعر کا مرتبہ بحیثیت ایک "غیر سرکاری سماجی قانون ساز" کے پہچان لیا۔ حالانکہ شاعر کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ شاعر محض ایک درباری مصاحب یا عام تماشہ گر کی قسم کا ذرا بہتر نمونہ ہے۔

زمن:۔ غالب کے قصائد کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

فیض:۔ اس کے قصیدے محض روزی پیدا کرنے کا ذریعہ تھے۔ اس کا تعلق اس کی عظیم شاعری سے نہیں۔

زمن:۔ فیض صاحب، کیا آپ اکثر غالب کا کلام پڑھتے ہیں؟ اور کیا آپ کی اپنی شاعری پر اس کا کوئی اثر پڑا ہے؟

فیض:۔ دیوان غالب کا ایک نسخہ ہمیشہ میرے سرہانے رہتا ہے۔ میں اکثر، بلکہ بعض حالات میں روزانہ

اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔ یہ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ غالب کا متنبّی ہوگیا۔ میں اپنی شاعری میں اسے شعوری اور غیر شعوری طور پر استعمال کرتا ہوں

زمن :۔ فیض صاحب سیاسی طور پر برِّعظیم ہند و پاک تقسیم ہوگیا۔ لیکن ہمارے ثقافتی ورثے اور تہذیبی روایت کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔؟ اب ہم اس سلسلے میں کس منزل پر کھڑے ہیں۔؟

فیض : دراصل سوال یہ ہے کہ ہمارے ثقافتی اور سیاسی مسائل اور بنیادی گتھیوں کا حل کیسے تلاش کیا جائے؟ لیکن ابھی تک کوئی بھی اس مہم کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کا اطلاق غالب ہی پر نہیں ہوتا۔ یہ تو ہمارے کلچرل کی پوری تاریخ کا معاملہ ہے۔ ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ ہمارے کلچر اور ثقافت کی تاریخ کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ لیکن آپ جہاں سے بھی شروع کریں ہند کی تاریخ کا ایک حصہ ہماری تاریخ کا بھی حصہ ہے۔ اور ہماری تاریخ کا ایک حصہ ہند کی تاریخ سے منطبق ہے۔ یہی بات ایران اور عرب کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے۔

ثقافتی ورثے تاریخ اور جغرافیہ سے متعلق ہوتے ہیں اور وہی کلچر کی حدود ہیں۔ جغرافیائی حدود اٹل ہوتی ہیں لیکن تاریخ کی حدود کے ڈانڈے ضروری نہیں کہ جغرافیہ سے ملیں۔ ہمارے جغرافیہ کی عمر ۲۰ سال ہے مگر ہماری تاریخ پانچ ہزار سال پرانی ہے۔

میرا خیال ہے ہمیں اپنی ثقافتی اور تاریخی ہستیوں سے متعلق اہم تاریخوں کا ایک کلینڈر مرتب کرنا چاہیئے۔ یہ ایک وسیع میدان ہے جو خسرو سے اقبال تک پھیلا ہوا ہے۔ جس میں ابوالفضل فیضی میر اور غالب بھی شامل ہیں اور تان سین سے روشن آرا بیگم تک پھیلا ہوا ہے۔ ہمیں اپنے بڑے بڑے فنکاروں، مصوروں، معماروں اور فلسفیوں کو یاد رکھنا چاہیئے۔ جنھوں نے ہمارے کلچر کو مالا مال کیا ہے۔

غالب زندگی بھر آتش بجاں اور سرگرم نالہ ہائے شرر بار رہے۔ اس صورت حال نے آگ اور اس کے تعلقات کو ان کے مزاج میں کچھ اس طرح داخل کیا کہ وہ غیر شعوری طور پر ان سب کی پرستش کرنے لگے اور آتش پرستی ان کی شخصیت کا ایک بنیادی جز بن کر ان کے فن کا بھی ایک حصہ بن گئی۔ چنانچہ اپنی ذہنی کیفیت کے بیان اور زندگی کے مختلف معاملات و مسائل کی ترجمانی میں انھوں نے آگ اور آتش وغیرہ کے اشاروں سے بڑا کام لیا ہے اور ان اشاروں اور علامتوں نے اظہار و ابلاغ میں ان کی بڑی مدد کی ہے۔ ان کی شاعری میں ان اشاروں اور علامتوں کی حیثیت مستقل پیکروں کی ہے اور انھوں نے مجموعی طور پر ان کے فن میں ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا کر کے اس کو انفرادی شان سے ہمکنار کیا ہے۔

——— ڈاکٹر عبادت بریلوی

نادم سیتاپوری

لکھنؤ کی دو رنڈیاں

زہرہ ـــــ اور ـــــ مشتری

غالب کی بڑی سخت دشمن تھیں

غالب کی زندگی کا آخری دور اپنی ادبی ہنگامہ آرائیوں کے اعتبار سے ایک اہم زمانہ خیال کیا جاتا ہے۔ "قاطع برہان" کی اشاعت کے بعد "ناطع القاطع، محرق قاطع، ساطع برہان، اور مؤید برہان" کا سلسلہ جو شروع ہوا تو لکھنؤ کی ادبی فضاؤں میں بھی تموج پیدا ہو گیا۔ اودھ میں آتش و ناسخ کا رنگ پہلے سے اتنا چھایا ہوا تھا کہ غالب کے ماننے والے انگلیوں پر گنے جاتے تھے۔ مخالفت کا زور اتنا تھا کہ ریاض خیرآبادی جیسے مرنج و مرنجان قسم کے بزرگ نے "دمشتق سخن" کی ابتدا ہی دیوانِ غالب کے جوابی دیوان سے کی جس کی ایک غزل کے مقطع کا آخری مصرعہ یہ تھا:

میں ہوں ریاض مجھ اسد دہلوی نہیں

ریاض کے اس دیوان کا لطیفہ بھی بہت دل چسپ ہے۔ میرے نانا سید ناظر حسین ناظر (وکیل سیتاپور) ریاض کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ ریاض جب غالب کے جواب میں یہ دیوان مکمل کر چکے تو ناظر سے ذکر کیا کہ میں نے غالب کے جواب میں پورا دیوان کہہ دیا ہے۔ کسی وقت تمہیں بھی دکھاؤں گا۔ ناظر بڑے ہی پُر مذاق اور بدیہہ گو شاعر تھے۔ بولے! خوب — آپ اور غالب! سبحان اللہ کیا کہنا؟

ان کے کلرک منشی چُنی لال مرحوم وہیں قریب بیٹھے ہوئے مقدمات کی مثلیں ترتیب دے رہے تھے۔ ناظر نے فی البدیہہ کہا ؎

فلک کو دیکھتا ہوں غالب اور ریاض احمد
خدا کی شان ہے ناظر حسین و چُنی لال

زہرہ اور مشتری اسی خیرآباد (ضلع سیتاپور) کی دو طوائفیں تھیں جنھوں نے غالب کی زندگی میں ان کے خلاف ایک اچھا خاصا ادبی محاذ قائم کر رکھا تھا۔ ان دونوں بہنوں کے تنقیدی مضامین "اودھ اخبار" وغیرہ میں شائع ہوا کرتے تھے مالک رام صاحب نے ان کا ضمنی تذکرہ "ذکرِ غالب" میں کیا ہے — تحریر فرماتے ہیں:

"یوں معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی دو رنڈیوں قمری جان مشتری (عرف منجھو) اور امراؤ جان زہرہ (عرف بی چھٹن) نے بھی اس معرکے میں حصہ لیا تھا۔ یہ دونوں اچھی خاصی تعلیم یافتہ اور

مذکور الصدر آغا علی شمس کی شاگرد تھیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شمس نے خود اعتراض لکھ کر ان دونوں کے نام سے شائع کردیے تھے۔ پنڈت کشن لال طالب دہلوی نے ان دونوں سے متعلق بہت سے قطعے لکھے تھے۔ ان میں سے ایک شعر تھا۔

شعاعِ شمس زہرہ مشتری ہے
بڑی تو خیر ہے چھوٹی ٹھڑی ہے

"تذکرۂ خمخانۂ جاوید" نے ان مضامین کا اصل مصنف زہرہ و مشتری کے استاد آغا علی شمس کو قرار دیا ہے اور شمس کے ذکر میں لکھا ہے:

"انھیں دنوں میں آپ (شمس) نے بھی مرزا (غالب) کے خلاف اخباروں میں زہرہ و مشتری کے نام سے مضامین شائع کئے تھے مگر چاند پر خاک ڈالنے سے کیا ہوتا ہے۔"

لیکن "خمخانۂ جاوید" کا یہ قیاس صحیح نہیں ہے کیوں کہ ۲۵ جون ۱۸۶۷ کے 'اودھ اخبار' (لکھنؤ) میں غالب کے خلاف جو مضمون شائع ہوا تھا وہ آغا علی شمس ہی کے نام سے تھا زہرہ و مشتری کے نام سے شائع کرانے کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا جب خود شمس پس پردہ رہ کر معرکہ آرائی کرتے ————

مالک رام صاحب نے لکھا ہے:

"اسی دوران میں میر آغا علی شمس لکھنوی نے اردو اخبار، ۲۵ جون ۱۸۶۷ میں ایک مضمون لکھا جس میں مرزا کے بعض اشعار پر اعتراض کئے تھے اس کا جواب سخن نے اردو نثر میں اور باقر نے فارسی نثر میں لکھا۔"

ظاہر ہے کہ آغا علی شمس نے غالب کی مخالفت پس پردہ نہیں کی تھی پھر یہ کہنا کہ زہرہ و مشتری کے مضامین شمس کے لکھے ہوئے تھے کسی طرح قرینِ قیاس نہیں ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ زہرہ و مشتری نے یہ مضامین شمس کے ایما اور مشورے سے لکھے ہوں گے۔ اس کے علاوہ جہاں تک

ان دونوں بہنوں کی علمی و ادبی قابلیت اور شعری صلاحیتوں کا تعلق ہے پورے وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں بہنوں نے نظم و نثر میں جو لکھا ہے وہ ان کی ذاتی قابلیت اور ذہنی صلاحیت کا نمونہ ہیں اور ان میں ان کے استاد شمس کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا اس دور کے کسی استاد سے اس کے لائق شاگرد کو مل سکتا ہے۔

"تذکرۃ النساء" کے مؤلف درگا پرشاد نادر نے بھی زہرہ و مشتری کے حالات میں ان ادبی معرکہ آرائیوں کا ذکر کیا ہے جو غالب کے خلاف اس زمانے میں سرگرم کار تھیں۔ نادر نے لکھا ہے:

"زہرہ تخلص، امراؤ جان نام ہے۔ بی چھٹن جس کا عرف ورد ادور شہر لکھنؤ میں بیچ بازار چوک مقام ہے۔ میرزا آغا علی شمس (کذا) شاگرد خاص ہے ...... امیر اللہ تسلیم کے دیوان کلیات میں ایک خط فارسی بنام زہرہ و مشتری شائع ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں موہنہ پھٹ اپنے ایسے شفیق استاد سے منحرف بھی ہوگئیں چنانچہ وہ رقعہ بجنسہ نذر احباب ہے۔

عطارد رقم زہرہ و مشتری ———— بہ اوج سخن نوری و انوری مرزا آغا علی شمس برہم شدند —— بنوعے پریشان و پرغم شمارا بدیں پایہ و اعتبار۔ رسا بند شمس فلک افتخار و گرنہ لبے قحبہ در لکھنو ست۔ کرد این قدر عزت و آبرو ست بناز بد بر خود کہ اندر زمن۔ شمار شما ہست در اہل فن۔ بہرکیف یہ رنڈیاں نہایت موہنہ زور مشہور ہیں۔ اکثر اردو زبان کے اخباروں میں ان کے مباحثے مشہور ہیں۔ اچھے اچھے استادوں پر طعن کرتی ہیں...... دیکھو ایک جھگڑا ان کا "اشرف الاخبار" دہلی مطبوعہ ۱۰ جولائی ۱۸۶۷ میں یہ ہے:

"مشفق مہربان محمد میرزا خان صاحب "اشرف الاخبار"

دہلی زاد عزاً بعد اشتیاق ملاقات کے یہ عرض ہے کہ آغا علی شمس جو منطق میں آج کل اپنے سے بہتر کسی کو نہیں جانتے اور ادب اور ریاضی و نجوم میں کسی کو نہیں مانتے! انھوں نے لکھنؤ میں "زہرہ و مشتری" دو رنڈیوں کو علم موسیقی و عروض و قافیہ تعلیم کیا ہے اور ان کو خدمت اساتذہ میں گستاخ کر دیا ہے چنانچہ آپ نے "اودھ اخبار" نمبر ۲۶ میں ان کی غزلیں اور باتیں استادی منشی حبیب الدین صاحب سوزاں کے جواب میں دیکھیں اور زیارت غزل آغا صاحب کی بھی۔ جو جواب استاد مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالبؔ میں لکھی ہے کی ہوگی۔ اور یقین ہے کہ طبع حق پسند و حق شناس پر حقیقت ان کی شرافت اور اہلیت اور علم و فضل اور سخن فہمی کی کھل گئی ہوگی اور حسرت مناظرہ دل سے نکل گئی ہوگی۔ ہر چند میں جانتا ہوں کہ آپ کا مذہب صلح کل ہے اور مجادلہ و مناقشہ و مباحثہ سے آپ کو نفرت بالکل ہے لیکن اگر ان سب باتوں سے قطع نظر فرما کر میری خاطر سے صرف ان غزلوں کو اپنے اخبار میں طبع فرما دیجیے تو سخن وران حق پسند کو سخن دانی آغا (شمس) معلوم ہو اور حقیقت ان کی سخن فہمی کی معلوم ہو۔ فقط

اور ہاں حضرت کو (یعنی غالبؔ کو) زہرہ و مشتری کی تقریر اور آغا علی شمس کی تحریر سنائی اور دکھائی تھی انھوں نے ہنس کر یہ قطعہ انوری کا پڑھا اور یہ بات فرمائی ——— بھائی کیا کروں مجھ کو فلک بے مہر اور کواکب بہرے لینا نہیں ہے مجھے ان کا کہنا۔ قطعہ انوری نے مراہست از کواکب فیض نے مراہست از فلک بہرہ (اس کا دوسرا شعر فحش ہے اس واسطے درج کتاب ہونا نہیں ہوا)

امام باندی (عرف چھوٹی بی) طوائف کی یہ دونوں لڑکیاں اپنی ماں اور خالہ کے ساتھ بچپن ہی میں خیرآباد سے لکھنؤ چلی گئی تھیں۔ وہیں کی شائستہ محفلوں میں پلیں بڑھیں اور وہیں پروان چڑھیں۔ فارسی اور اردو کے علاوہ فن شعر کی تکمیل میر آغا علی شمس (شاگرد ملک الشعرا قاضی محمد صادق خاں اختر) سے کی جو اپنے دور کے ایک باکمال بزرگ گذرے ہیں۔ مولانا حسرت موہانی نے شمس کی مثنوی طلعۃ الشمس کی ابتدا میں ان کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں۔

"سید آغا علی نام، شمس تخلص۔ اصل ان کی خراسان میں ہے۔ ابھی کمسن ہی تھے کہ والدین نے انتقال کیا۔ گیارہ سال کی عمر میں راجہ کندن لال اشکی نے ان کو اپنا پسر خواندہ قرار دیا۔ خوشنویسی کی مشق شمس نے انھیں سے کی تھی۔ انھیں کی وساطت سے نواب محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے ان کو رنگین رقم مشکیں قلم (اور) خان بہادر کا خطاب عطا ہوا اور وقائع نگاری کی خدمت سپرد کی گئی۔ کچھ روز تک زمرۂ مصاحبین شاہی میں بھی شامل رہے نواب فخر الدولہ زخمی بھی ان کی امیرانہ پرورش کرتے تھے۔ راجہ کندن لال کے بعد عرصہ تک نواب محمد تقی خاں شاگرد مرزا سلیم کی سرکار سے توسل رہا لیکن آخر حصہ عمر ان کا انقلاب زمانہ کے ہاتھوں تنگدستی میں بسر ہوا۔ زہرہ و مشتری مشہور طوائفان لکھنؤ کو فارسی پڑھاتے تھے اور انھیں کے مکان میں رہا کرتے تھے۔ بی مشتری کے نکاح کر لینے اور خانہ نشین ہونے کے بعد کانپور چلے گئے۔ اور وہیں انتقال کیا..... ملک الشعرا اختر کے شاگرد تھے تحقیق الفاظ و صحت زبان میں کمال حاصل تھا۔ کتب درسیہ عربی و فارسی کی تکمیل مولوی فضل حق خیرآبادی، مولوی اوحد الدین بلگرامی، مولوی سبحان علی لکھنوی، مولوی سلامت اللہ کشفی، شاہ عبد العزیز دہلوی، میرزا قتیل اور مفتی میر عباس سے کی تھی۔ دیوان اردو فارسی کے علاوہ ان کی ہندی چیزوں کا بھی مجموعہ قابل دید ہے۔ گلستان سعدی کے جواب میں ایک کتاب 'سنبلستان' لکھی گئی۔"

امراؤ جان (عرف چھٹکن صاحبہ) زہرہ اور بی قمر جان

(عزت منجھو صاحبہ) مشتری) لکھنؤ کی ڈیرے دار طوائفیں تھیں۔
ان کی ماں (امام باندی) میرے بزرگوں کی زمین داری میں بمقام سیتاپور، آباد تھی لیکن جب اس کی بہن (غالباً خالہ زاد) الٰہی بخش نے خیرآباد کے چکلہ دار سے نکاح کر لیا تو طوائفوں کا یہ خاندان سیتاپور سے خیرآباد منتقل ہو گیا جو اس زمانے میں نوابین اودھ کی نظامت (کمشنری) کا درجہ رکھتا تھا۔ زہرہ و مشتری خیرآباد ہی میں پیدا ہوئیں لیکن بچپن ہی میں انھیں خیرآباد کو خیرباد کہنا پڑا کیوں کہ جس چکلہ دار سے ان کی خالہ نے نکاح کر لیا تھا وہ معتوب و معزول کر دیا گیا۔ ان دونوں بہنوں کی مکمل تعلیم و تربیت لکھنؤ کی اس علمی و ادبی فضا میں ہوئی جہاں بڑے بڑے شرفاء اپنے بچوں کو علم مجلس سکھانے کے لئے طوائفوں کے گھر بھیجا کرتے تھے۔ درسی تعلیم اور فن شعر تو ان دونوں بہنوں نے میر آغا علی شمس جیسے محقق دوراں اور فاضل اجل سے سیکھا۔ موسیقی اور رقص کی ریکھ دیکھ حیدر علی قوال اور استاد گھسیٹ خاں نے کی۔ جان عالم نواب واجد علی شاہ کا دور حکومت تھا۔ لکھنؤ ہی نہیں دونوں بہنوں کی دھوم سارے ہندوستان میں مچ گئی اور وہ بھی اس شان سے کہ زہرہ و مشتری دو جداگانہ ہستیاں ہونے کے باوجود کچھ اس طرح لازم و ملزوم کر دی گئیں کہ آج زہرہ و مشتری کے ذکر میں کوئی تفریق نظر نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کسی ایک ہی منفرد ہستی کا نام ہے حالانکہ شعرائے اردو فارسی کے تمام تذکروں میں ان دونوں کا ذکر علٰحدہ علٰحدہ کیا گیا ہے۔ "تذکرۂ بہارستانِ ناز" جو ان دونوں بہنوں کی زندگی میں چھپا تھا۔ اس میں دونوں کا ذکر موجود ہے۔

"زہرہ — تخلص۔ امراؤ جان نام۔ بی چھٹن صاحبہ مشہور، شعرگوئی میں مشتاق۔ شوخ طبعی میں شہرہ دُور دُور۔ میر آغا علی شمس کی شاگرد ہیں اور انھوں نے ہی بتایا ہے 'میری' کا شہرہ اظہر من الشمس ہے۔ زہرہ کی زبان کو انھوں نے چمکایا ہے۔ شاگرد اگر اچھا ہو تو فخر استاد ہے۔ زہرہ کی بدولت میاں شمس کی ہر دم سب کو یاد ہے۔ اب بی مشتری کی تحریر سے معلوم ہوا کہ پانچ برس سے اس شاعرہ نے کسی رئیس عالی خاندان سے عقد کر لیا۔ اپنا دامن تر گوہر ہائے توبہ و استغفار سے بھر لیا۔ شعرگوئی کو بھی ترک کر دیا۔ دیکھئے اچھوں کی صحبت نے اچھا ہی اثر دیا۔ خدا کرے چھچک کی عادت نہ اختیار کر لے۔ ہمیشہ کے لئے پردہ نشینی ہی اپنا شعار کرے۔

اس کے بعد زہرہ کے اردو کلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے۔

دوسری جگہ مشتری کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے:

"مشتری تخلص۔ موسوم بہ قمر جان معروف بہ منجھو لکھنؤ کی رہنے والی۔ شاعری میں خیال بے مثالی۔ طبیعت نہایت تیز، فکر رسا ہے، میاں شمس کی تعلیم یافتہ ہے۔ ماشاء اللہ جیسے استاد کی مشہور طبیعت ہے ویسی ہی زہرہ و مشتری کو شہرت ہے۔ اور کیوں نہ ہو جب تعلیم میں استاد صاحب اس قدر خیال سے تبائیں تو شاگرد کیوں کر نہ گھر گھر شہرت پائیں واقعی یہ کہ حضرت شمس نے ان دونوں پر کال آتش کو ایسا چمکایا ہے کہ فلک پر زہرہ و مشتری، کا رنگ اُڑایا ہے اگر چندے اسی طرح تعلیم پائیں گی تو بی مشتری اپنے تئیں فلک پہ پہنچائیں گی۔ سات برس کی عمر سے اس شاعرہ کو شوق نوشت و خواند ہے۔ یہ ستارہ جلوہ ریزی حضرت شمس سے سامانِ ظاہری سے درست اور اللہ کی دی ہوئی کچھ جائداد ہے۔ مسجد، امام باڑہ، باغ، مکان قدیم الایام بمقام خیرآباد ہے۔ اور فارسی نظم و نثر اور تاریخ گوئی ان کے سوا مشق خط خفی و جلی سب میں طاق ہے۔ مگر پندار میں بھی شہرۂ آفاق ہے۔ غرض ایسے استاد شفیق کے سبب سے فن شعر کا کوئی دقیقہ نہیں باقی ہے۔ وہ کون بزم مشاعرہ ہے جہاں شمس و زہرہ و مشتری کی نہیں مشتاقی ہے۔ یہ شاعرہ ہر فن میں کامل کیوں نہ ہو اس کا استاد بھی تو صاحب کمال ہے۔ دیکھیے مشتری عطارد رقم کا ۲۳ برس کی عمر میں ایسا ہو جانا

استادگی صاحب کرانی پر دال ہے۔ سبحان اللہ کیا ذہن آسمان پیوند ہے کوئی جھوٹ سمجھے یا سچ۔ ایک کے دل کی دوسرے کو کیا خبر مگر ہمیں تو جی سے اس کا کلام پسند ہے ہاں اس قدر افسوس ہے کہ اس لیاقت علمی پر اپنے نزدیک بہت دور ہے۔ جس آدمی میں جوہر لیاقت بھی ہے اور انکسار بھی ہے وہ تو نورٌ علیٰ نور ہے ؎

بتوں نے حسن پر نخوت اگر سیکھی تو کیا سیکھی
نکورو ہو کے بد خصلت اگر سیکھی تو کیا سیکھی
مگر یہ جو اس کو نخوت ہے کب خالی از حکمت ہے۔

ہماری رائے میں یہ وہ ٹیکا ہے جس نے نظر بد سے اس کو بچا رکھا ہے المختصر جو انداز ہے اچھا ہے اب صفحہ "بہارستانِ ناز" اس غنچہ دہن کے اشعار سے گل بدامن ہے۔"

اس کے بعد مشتری کے بھی اردو و فارسی اشعار کا ایک اچھا خاصا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

یہ اقتباس کچھ کم ایک صدی ادھر کے ایک اردو تذکرے سے کیا گیا ہے۔ جو غالب کی حیات میں چھپ چکا تھا۔ اگر دو تین سال ترتیب و تدوین کے بھی شامل کرلئے جائیں تو یہ انداز بیان پورے سو برس ادھر کا ظاہر ہے جس میں جگہ جگہ زہرہ و مشتری ہی پر نہیں ان کے استاد شمس پر بھی چوٹیں کی گئی ہیں۔

اردو اور فارسی کے اکثر و بیشتر تذکروں میں "زہرہ و مشتری کے مختصر حالات ضرور ملتے ہیں لیکن جتنی بڑی کمی خان بہادر رضا علی وحشت مرحوم نے پوری کی ہے مجھے ابھی تک کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آئی وحشت مرحوم نے ان کے مختصر مگر محققانہ حالات ہی نہیں لکھے بلکہ ان کے بہت سے خطوط بھی فراہم کرکے ماہنامہ 'جادو' ڈھاکہ میں شائع کرادیئے۔ خواجہ احمد فاروقی صاحب نے ماہنامہ 'آج کل' (دہلی) کے خطوط نمبر

۱۹۵۴ء میں مشتری کا ایک اردو خط شائع کیا ہے جو انھیں محترمی قاضی عبدالودود صاحب (بیرسٹر پٹنہ) کی وساطت سے پہنچا ہے اسی خط کے سلسلہ میں فاروقی صاحب نے وحشت کے حوالے سے مشتری کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں:

"مشتری کے متعلق خان بہادر رضا علی وحشت نے لکھا ہے۔ مشتری سیتاپور ضلع خیرآباد (خیرآباد ضلع سیتاپور صحیح ہے) کی ایک مشہور رقاصہ تھی مگر ہمیشہ لکھنؤ میں رہی۔ نام قمرن جان تھا عرف بی منجھو علم موسیقی میں گھسیٹ خاں اور حیدر علی خاں قوال کی شاگرد تھی۔ شاعری کا سن شعور سے شوق تھا۔ آغا شمس کی شاگرد تھی۔ مشتری کا ایک دیوان فارسی موسوم بہ "خانۂ خیال" طبع ہوگیا ہے، یہ شعر بہت جلد کہتی تھی جب مہاراجہ مہندر سنگھ..... والی پٹیالہ لکھنؤ میں آئے مشتری نے سرِ محفل چند اشعار —— مدح میں نظم کئے اور اجازت لے کر ان کو پڑھا۔ مہاراجہ بہت محظوظ ہوئے اور ایک ہزار روپے انعام میں مرحمت فرمائے آخر میں تائب ہوکر ناچنا گانا چھوڑ دیا تھا اور سید اعجاز حسین اعجاز سے عقد شرعی کیا تھا جو مرنے کے بعد اس کی تمام جائداد کے مالک ہوئے جہاں حسن وجمال نے اس کے کمالات کو چار چاند لگا دئے تھے۔ صفات حمیدہ نے عزیزہ خلق کر دیا تھا۔ فن شعر سے جیسا اس کو اُنس تھا ویسی ہی وہ اہل فن کی قدردان تھی۔ اطراف ہند کے مشاہیر روشناس تھی..... لکھنؤ میں ناسخ ..... سے اس کا تعارف ہوا اور ..... دونوں کا تعلق بہ درجہ تعشق پہنچ گیا۔

عبدالغفور نساخ نے سخن شعرا میں لکھا ہے (صفحہ ۵۷۹)

مشتری تخلص۔ قمرن جان عرف منجھو طوائف۔ ساکنہ لکھنؤ شاگرد آغا علی شمس خوش طبع و خوش نویس و خوش گوار ہے۔ راقم الحروف سے اس شوخی مجسم سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی۔"

زہرہ عمر میں مشتری سے بڑی تھی مگر کسی تذکرے سے

زہرہ کا سن پیدائش معلوم نہیں ہوتا۔ تذکرہ 'بہارستانِ ناز' کی اشاعت (۱۲۸۱ھ) کے وقت مشتری کی عمر ۲۳ سال تھی۔ اس حساب سے مشتری کا سن ولادت ۱۲۵۸ھ نکلتا ہے۔

'مشاہیرِ نسواں' میں مشتری کا سن وفات ۱۳۱۵ھ لکھا ہوا ہے۔

"مشتری۔ لکھنؤ کی قمرن جان عرف منجھو طوائف کا تخلص ہے۔ یہ شاعرہ آغا علی شمس کی شاگرد تھی۔ بڑی اچھی طبیعت پائی تھی ۱۳۱۵ھ میں لقمۂ اجل ہوئی۔"

گویا بوقتِ وفات مشتری کی عمر ۵۷ سال تھی۔

مشتری کی ماں امام باندی (وفات ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) اگرچہ شاعرہ نہیں تھی لیکن اتنی حاضر جواب، پُرمذاق اور بذلہ سنج عورت تھی کہ بڑی بڑی محفلوں میں اچھے اچھے منھ کی کھا جاتے تھے۔ محترمی قاضی عبدالودود صاحب نے آغا علی شمس کی 'نقلِ محفل' کے حوالے سے امام باندی کا ایک لطیفہ نقل کیا ہے۔

"بحث تھی کہ آج ایک امام کی شہادت کا دن ہے اور دوسرے امام کی ولادت کا۔ خوش رہنا چاہیے یا مغموم؟ امام باندی نے بے ساختہ جواب دیا کہ منانا چاہیے 'نزدِ احمق المقدور شادی مرگ ہونا چاہیے'۔"

امام باندی، زہرہ اور مشتری کی حاضر جوابی اور بذلہ گوئی کے اتنے لطیفے مشہور ہیں کہ اگر انھیں قلمبند کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے لیکن ان کی شہرت کے ساتھ ساتھ ان کی صداقت بھی مشکوک ہو گئی ہے۔

مشہور تو یہی ہے کہ زہرہ و مشتری اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھیں لیکن مجھے اب تک زہرہ کی کوئی فارسی غزل، نظم، رُباعی یا قطعات دستیاب نہیں ہو سکے البتہ زہرہ کی اردو غزلیں جا بجا تذکروں اور گلدستوں میں اب بھی بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ مشتری کا فارسی اور اردو کلام تذکروں میں بھی موجود ہے اور کثرت سے 'شعر و سخن' کے گلدستوں میں بھی ہے۔ اس کے علاوہ مشتری کی فارسی غزلیات کا مجموعہ 'ترانۂ خیال' (معروف بہ دیوان مشتری) اور فارسی نثر کا مجموعہ 'خانۂ خیال' بھی ہیں۔ 'ترانۂ خیال' اور 'خانۂ خیال' دونوں مطبع گلزار محمدی (اکبری دروازہ چوک لکھنؤ) میں چھپے تھے۔ ان کے پہلے ایڈیشن میری نظر سے گذرے لیکن دوسرے ایڈیشن (۱۳۰۴ھ) میرے پیشِ نظر ہیں۔ مجموعۂ نثر فارسی 'خانۂ خیال' (نثر مشتری)، کی ضخامت صرف بیس صفحات ہے۔ آخر میں منشی شنکر دیال فرحت شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہر کی ایک نثری تقریظ بھی شامل ہے۔

●●

"جیسی مرزا کی طبیعت میں دَرّاکی اور ذہن میں جودت اور سرعتِ انتقال تھی اسی طرح ان کا حافظہ بھی نہایت ہی قوی تھا۔ ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا ہمیشہ کرائے کی کتابیں منگوا لیتے تھے اور ان کو دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے۔ مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر آجاتی تھی، ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے جن کی سند اہلِ زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔"

حالی ______________

شرح کلامِ غالب

مولانا حسرت موہانی

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

(شرح) نقش بمعنی تصویر: تصویر چوں کہ کاغذ پر ہوتی ہے اس لئے اسے فریادی کہا۔ کیوں کہ ولایت میں فریادی کاغذی پیرہن پہن کر عدالت میں جاتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ہستی چونکہ موجبِ ملال و آزار ہے۔ اس لئے تصویر بھی اپنے صانع کی بزبانِ حال شکایت کرتی ہے کہ مجھ کو ہست کرکے کیوں مبتلائے رنجِ ہستی کیا۔ (ماخوذ از عود ہندی) مقصودِ شاعر یہ ہے کہ ہستی بہر حال (یعنی ہستی تصاویر اعتبارِ محض ہو) موجب آزار ہے۔

کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

(شرح) یعنی شب ہائے ہجر کا کاٹنا ویسا ہی سخت ہے جیسا کہ فرہاد کو جوئے شیر لانا تھا۔ صبح کی سپیدی اور جوئے شیر میں جو مشابہت ہے وہ ظاہر ہے کاوکاو سے کاوش و کاہش مراد ہے۔

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

(شرح) یعنی عاشق کے شوقِ شہادت کی کشش کا یہ اثر ہے کہ دمِ شمشیر سینۂ شمشیر سے باہر نکلا پڑتا ہے۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

(شرح) یعنی ہماری تقریر ایسی ہے کہ اس کے مفہوم سے (باوجود کوششِ بسیار) کوئی آگاہی حاصل نہیں کرسکتا دامِ شنیدن بچھائے یعنی سن کر سمجھنا چاہئے۔

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِپا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

(شرح) آتش زیرِپا محاورۂ فارسی میں بے قرار کو کہتے ہیں۔ موئے آتش دیدہ یعنی بال جو آگ کو دیکھ کر حلقہ دار اور کم زور ہوگیا ہو اور اس میں حلقۂ زنجیر کی مشابہت پیدا ہوگئی ہو۔

مطلب یہ ہے کہ میرے جنونِ بے قرار کے مقابلے میں حلقہ ہائے زنجیر کی مضبوطی کی کچھ ہستی نہیں ہے۔ آتش زیرِپا کی رعایت سے غالبؔ نے حلقۂ زنجیر کو موئے آتش دیدہ کہا ہے۔

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

(شرح) تسبیح میں چوں کہ سو دانے ہوتے ہیں اس لئے ظاہر ہے شمارِ سبحہ سے "بیک کف بردنِ صد دل" کی یہ تمثیل ہے مطلب یہ ہے کہ محبوب کو شمارِ سبحہ اس وجہ سے پسند ہے کہ اس میں حسبِ خواہش و عاداتِ محبوب ایک ہی وار میں سو سو دل لے لینے کی مشابہت پائی جاتی ہے

بہ فیضِ بے دلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

(شرح) کشائش نے اپنا عمل کرنے کے لئے ہمارے عقدۂ مشکل و نومیدیٔ جاوید کو پسند کیا اور ہماری مشکل

آسان ہوگئی اس طور پر کہ ہم کو دُنیا کی جانب سے جو بے دلی ہوگئی ہے اس کے سبب سے صدمۂ نومیدی جاوید کا برداشت کرنا آسان ہوگیا ہے کیونکہ غایت بے دلی کی حالت میں اُمید و نااُمیدی یکساں ہوجاتی ہے۔

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

(شرح) مطلب یہ ہے کہ خواہشِ سیرِ گل سے اس بے درد کی بے مہری ظاہر ہوتی ہے کیوں کہ اس جفا پسند کو تماشائے گل صرف اس وجہ سے پسند ہے کہ گل اپنی سُرخی کی بنا پر "بسمل بخون غلطیدہ" سے مشابہ ہوتا ہے۔

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارک باد اسد، غم خوارِ جانِ درد مند آیا

(شرح) غم خوارِ جانِ درد مند یعنی عشق آیا ہے اور جراحت و الماس داغِ جگر بطور ہدیہ ہمراہ لایا ہے ایسے ہدیوں پر مبارک باد دے کر اپنی ایذا دوستی کا اظہار کیا ہے۔ الماس کے کھا لینے سے دل و جگر زخمی ہوجاتے ہیں۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

(شرح) چشمِ حاسد کی تنگی مشہور ہے۔ پس کہتا ہے کہ شاید صحرا بھی چشمِ حاسد کے مانند تنگ تھا کہ مجنوں کے سوا صحرا نوردی کا پھر کوئی مردِ میدان نہ نکلا۔

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

(شرح) سویدا کو داغ سے اور آشفتگی کو دود سے تشبیہہ دی ہے۔ مقصودِ شاعر یہ ہے کہ جس طرح دھوئیں

غالب شکن یگانہ چنگیزی

غالب کو ایک دیوتا یا آسمانی شخصیت کی طرح پیش کرکے دنیا کی مہذب قوموں کو ہندوستانی دماغوں پر ہنسنے کا موقع دیا جا رہا ہے۔ اس پر ذرا غور تو کریں۔ غالب کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ ہندوستان کا ایک بلند خیال، وقت پسند شاعر، جو بسا اوقات اپنے تخیلات کی بھول بھلیاں میں گم ہوجایا کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ پرلے سرے کا بے سُرا بھی ہے۔ پُرانا چور اور چور کے ساتھ گونگا بھی ہے۔ مضمون چُرانے کو چُراتا ہے مگر ہضم نہیں کرسکتا، تصرف کی قدرت نہیں رکھتا، چوری کھل جاتی ہے، زبان ایسی گونگی کہ نفسِ مطلب کو شاعرانہ زبان میں ادا نہیں کرسکتا۔ ٹھونس ٹھانس کر تک بندی کرلیتا ہے۔

افسوس ہے غالب نے چار دن بھی بہادر شاہ کے نمک کا پاس نہ کیا تخت اُلٹتے ہی انگریزوں کے وفادار نمک خوار بن گئے۔

کاش غالب شاعری کے پیچھے نہ پڑتے نثر ہی لکھا کرتے تو بہتر تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ نثر تو ایسی دل چسپ اور سلجھی ہوئی اور نظم بالکل گورکھ دھندا۔

شاعرانہ چوری اور قصیدہ گوئی کے علاوہ غالب میں ایک بڑا نقص یہ بھی تھا کہ وہ اپنے فطری جوہر، اپنی اعلیٰ دماغی قابلیت کا صحیح مصرف نہ لے سکے۔ تلون مزاجی کے ہاتھوں اُن کی ذہنی زندگی کا بیشتر حصہ حیرانی و سرگشتگی میں گزر گیا۔ آج وہ جلال اسیر کے معتقد ہیں تو کل شوکت بخارائی کے کبھی عرفی کی نقالی کرتے ہیں کبھی نظیری کی، کبھی بیدل کا پیالہ چاٹتے ہیں کبھی کسی کا کبھی کسی کا ــــ زمانہ دراز تک ان کی طبیعت نے کوئی خاص رنگ پکڑا ہی نہیں، کسی مرکز پر انہیں قرار آیا ہی نہیں۔ آئے دن رنگ بدلتے رہے۔

سے داغ پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح آشفتہ خاطری
اور پریشانی کے درد سے دل میں داغ سویدا کی صورت
قائم ہوتی ہے۔

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

(شرح) یعنی ہنوز مبتدی ہوں جس طرح لڑکے پہلے
آمد نامہ پڑھتے ہیں کہ رفت کے معنی گیا اور بود کے معنی تھا
وغیرہ۔ لطف یہ ہے کہ رفت و بود دونوں ماضی کے صیغے
ہیں جس سے مطلب یہ ہے کہ اب دل عیش و فراغت
سے بالکل محروم ہے۔

کہتے ہو نہ دیں گے دل ہم نے گر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

(شرح) ہم نے مدعا پایا یعنی ہم آپ کا مطلب سمجھ
گئے کہ آپ نے ہمارا دل پالیا ہے اور یہ باتیں کہ
"اگر ہم تیرا دل پائیں گے تو نہ دیں گے" دل پا لینے کے
بعد کی ہیں۔ یعنی جیسے لوگ کوئی گم شدہ چیز پاکر چھیڑنے
کے لئے مالک شے سے کہا کرتے ہیں۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا

(شرح) عشق ایک درد لا دوا ہے لیکن وہی عشق
دردِ زیست کی دوا بھی ہے کیوں کہ اسی سے طبیعت
نے زندگی کا مزا پایا ورنہ بغیر عشق کے زندگی گویا ایک
درد تھی۔

دوستدار دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

(شرح) ہمارا دل دشمن کا دوست ہے اس لئے کہ
اس نے جو آہ کی تو بے اثر اور نالہ کیا تو نارسا۔ بس
اس کا کیا اعتبار ہے۔ یہاں شاید دشمن سے دشمن
عشاق یا دشمنِ وفا غرضیکہ محبوب مراد ہے۔

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

(شرح) اہلِ حسن کی سادگی اور بے پروائی سے
مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنے مشتاقوں کی جرأت کو
آزمائیں یعنی یہ دیکھیں کہ ان کو سادہ سمجھ کر ارباب
اشتیاق جرأت گستاخی تو نہیں کرتے اس سے ظاہر
ہے کہ اس قسم کی سادگی کو درحقیقت پرکاری اور بیخودی
کو ہوشیاری سمجھنا چاہیے

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

(شرح) یعنی غنچے کو دیکھ کر ہم کو اپنا دل غم گشتہ
و خوں شدہ یاد آیا کہ اس کی بھی یہی ہیئت تھی۔

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

(شرح) آپ سے یعنی ناصح سے آپ کا لفظ بطور
طنز استعمال کیا گیا ہے۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

(شرح) اپنی نیستی کا حال بہ مبالغہ بیان کرتا ہے
کہ پہلے جب میں فنا کے عالم میں تھا تو بارہا میری
آہِ آتشیں سے بازوئے عنقا جل گیا کہ وہ بھی عدم میں تھا
لیکن اب تو میں اس درجے سے بھی پرے ہوں۔

عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

(شرح) عرض کیجئے یعنی پیش کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی

کا بیان یہ ہے کہ وحشت کا صرف خیال آیا تھا کہ اس کے اثر سے صحرا جل گیا۔ یعنی چوں کہ وحشت کی حالت میں صحرا نوردی کی نوبت ضرور آتی ہے اس لئے خیالِ وحشت سے صحرا جلنے لگا۔

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

(شرح) کارفرما یعنی حکم فرما۔ ہر کام کے لئے ایک کام لینے والا (کارفرما) اور بہت سے کام کرنے والے کارکن ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اوّل جو اس چراغاں یا داغوں کی بہار کا کارفرما تھا وہی نہ رہا۔ ورنہ تجھ کو اس چراغاں کی کیفیت دکھاتا۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

(شرح) شوق بہ معنی عشق۔ رقیب بہ معنی دشمن۔ مطلب یہ ہے کہ عشق سروسامان کا دشمن ہے۔ دیکھو کہ مجنوں تصویر میں بھی عریاں رہتا ہے۔ بقولِ غالب قیس کی تصویر بھی عریاں ہی کھینچی جاتی ہے۔

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پَرافشاں نکلا

(شرح) ''زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی'' یعنی تنگیٔ دل کو زائل نہ کیا۔

مطلب یہ ہے کہ تیر خود ضیق مقام سے گھبرا کر پَرافشاں اور سراسیمہ نکل گیا۔ تنگیٔ دل کی داد کیا دیتا۔ (عودِ ہندی) اس شعر میں زخمِ تیر کی توہین بہ سبب ایک رخنہ ہونے کے کی ہے۔

تصانیفِ غالب

میخانۂ آرزو	ترتیب	۱۸۳۷
گلِ رعنا	ترتیب	۱۸۳۸
دیوانِ اردو	طبعِ اوّل	۱۸۴۱
دیوانِ فارسی	"	۱۸۴۵
پنج آہنگ	"	۱۸۴۹
مہرِ نیمروز	"	۱۸۵۵
قادرنامۂ غالب	"	۱۸۵۶
دستنبو	"	۱۸۵۸
قاطعِ برہان	"	۱۸۶۱
کلیاتِ نظمِ فارسی	"	۱۸۶۳
مثنوی ابرِ گہربار	"	۱۸۶۴
لطائفِ غیبی	"	۱۸۶۴
نامۂ غالب	"	۱۸۶۵
درفشِ کاویانی (قاطعِ برہان طبعِ دوم)		۱۸۶۵
نکات و رقعاتِ غالب	فارسی	۱۸۶۷
تیغِ تیز	"	۱۸۶۷
سبدِ چین	"	۱۸۶۸
کلیاتِ نثرِ فارسی	"	۱۸۶۸
عودِ ہندی (مکاتیبِ اردو)		۱۸۶۸
اردوئے معلّیٰ (مکاتیبِ اردو)		۱۸۶۹
سبدِ باغِ دودر		۱۸۶۳
دعاء الصباح (مطبع نولکشور لکھنؤ تاریخ طباعت درج نہیں ہے۔)		
اسمائے فارسی	طبعِ اوّل	۱۸۶۴
سوالاتِ عبدالکریم	"	۱۸۶۴

یہ غالب کے جعلی شاگرد ہیں

مالک رام

کلام موزوں، عروض کے بغیر ناممکن ہے۔ عروض ایک وسیع اور پیچ دار فن ہے، ایسا وسیع اور پیچ دار کہ بعض اوقات بڑے بڑے پختہ کار اور مشاق شاعروں سے بھی عروض کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح معانی بیان، محاورہ روزمرہ، فصاحت و بلاغت کے ایسے بیسیوں باریک نکتے ہیں، کہ محض کتابیں پڑھ لینے سے وہ ذہن نشین نہیں ہو سکتے۔ ان تمام علوم میں مہارت پیدا کرنے کے لئے کسی اُستاد کے سامنے زانوے ادب تہہ کرنا صرف مناسب نہیں بلکہ اشد ضروری ہے۔

شاعری میں باقاعدہ استادی شاگردی کا سلسلہ فارسی زبان کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا۔ اُردو نے جہاں اور کئی چیزیں فارسی سے مستعار لیں، وہیں یہ رسم بھی لے لی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اسے مناسب حدود کے اندر رکھا جائے تو یہ بہت مفید ہو سکتی ہے۔ اگر اُستاد، شاگرد کے کلام پر فنی پہلو سے اصلاح دے، اُسے عروض کے نکات بتلائے، زبان کی انوٹوں اور نزاکتوں سے آگاہ کرے، فصاحت کے مدارج کی تعلیم دے، دوسرے لفظوں میں اگر وہ اپنے خیالات اور رجحانات شاگرد پر نہ ٹھونسے، بلکہ صرف اُس کی ذاتی قابلیتوں کی تربیت کرے اور اُس کی مخفی شاعرانہ قوتوں کے اُبھارنے میں اس کی مدد کرے، تو وہ شاگرد استاد سے استفادہ کرنے کے بعد ماہرِ فن ہو جائے گا۔

آپ دیکھیں گے کہ غالب کے شاگردوں میں بہت کم اپنے اُستاد کے رنگ میں کہنے والے ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ غالب اس نکتے کو خوب سمجھتے تھے، کہ چہرے مہرے کی طرح ہر شخص اپنا خاص مزاج اور مذاق بھی قدرت کی طرف سے لے کر آتا ہے۔ اِن میں سے کسی کو بھی بدلنے کی کوشش کرنا، اُسے مسخ کرنے کے مرادف ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ شاگرد کے کلام کے ظاہری دروبست اور فنی (لغوی) اسقام کی اصلاح کی جائے اور اس کے طرزِ سخن کو جوں کا توں قائم رہنے دیا جائے، تاکہ اس کی انفرادیت پختہ ہو جائے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمیں غالب کے شاگردوں میں اتنے زیادہ صاحبِ طرز شاعر ملتے ہیں۔ انور، تفتہ، ثاقب، حالی، رشکی، زکی، سالک، سحر، شاداں، شیفتہ، عارف، عرشی مجروح، ناظم، ان میں سے ہر ایک کا رنگ الگ ہے اور اپنی اپنی جگہ ہر ایک پختہ کار اور صاحبِ فن استاد ہے۔

بعض تذکرہ نویسوں نے غالب کے شاگردوں میں کچھ ایسے اصحاب کا ذکر کیا ہے، جو میرے نزدیک درست نہیں۔ اس لئے میں نے انہیں اس تذکرے میں شامل نہیں کیا۔ مثلاً ناسخ نے مرزا باقر علی خاں کامل کو غالب کا شاگرد لکھا ہے، حالانکہ وہ قربان علی خاں سالک کے شاگرد تھے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت نے نظام رامپوری کو غالب کا شاگرد بیان کیا ہے وہ شیخ علی بخش بیمار کے تلامذہ میں سے تھے۔ ضیغم حیدر آبادی اور حسرت موہانی نے فتنی بنواری لال شعلہ کو تلامذہ غالب میں شامل کر لیا ہے۔ وہ تفتہ اور بے صبر کے شاگرد تھے۔ ایک جدید تذکرہ (مشرقی بنگال میں اُردو) کے مصنف نے سید محمود آزاد (سید محمد

آزاد لوہاری دربار والے کے بڑے بھائی، کو غالب کا شاگرد لکھا ہے (ص ۷۲-۷۳) یہ بھی ٹھیک نہیں۔ قطع نظر اس سے کہ کسی تذکرہ نویس نے آج تک اس کا ذکر نہیں کیا۔ منجملہ اور باتوں کے صرف ایک ہی بات اس کی تغلیط کے لئے کافی ہے۔ قاطع برہان کے معرکہ میں آغا احمد علی احمد نے جو کتاب مؤید برہان کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے آخر میں "برادر عزیزم سید محمود المتخلص بشیدا سلمہ تعالیٰ" کی منظوم تقریظ او رتاریخ موجود ہے (اُن دنوں یہ شیدا تخلص کرتے تھے) بھلا یہ کیسے ممکن ہے، کہ آزاد اپنے استاد کے خلاف ایک کتاب اور اُس کے مصنف کے ساتھ اس طرح علانیہ اپنی عقیدت اور دوستی کا اظہار کرتے۔ پھر مزید ستم یہ ہے، کہ غالب کے سفر کلکتہ کے دوران میں سید محمود کی اُن سے ملاقات بیان کی ہے۔ سید محمود ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوتے اور غالب ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے واپس بھی آچکے تھے۔ اسی طرح بعض اور اصحاب کو بھی غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔

نواب کلب علی خاں خلد آشیاں نے ابتدا میں ایک فارسی نثر غالب کی خدمت میں اصلاح کے لئے بھیجی تھی۔ بدقسمتی سے اس پہلی اصلاح ہی پر ایک ناخوشگوار بحث چھڑ گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ اس کے بعد انہوں نے کوئی اور چیز میرزا کے پاس نہیں بھیجی۔ اسی طرح دربار رام پور کے میر منشی، سیل چند نے بھی ایک خاص موقع پر چند شعر کہے اور غالباً اُن پر غالب سے اصلاح بھی لی۔ لیکن نہ وہ شاعر تھے، نہ یہ اصلاح کا تعلق ہی کوئی چیز تھی۔ انہوں نے تفنن طبع سے چند شعر کہے اور غالب نے بھی اسی طرح اصلاح دے دی۔

غالب کے شاگردوں میں ایسے بھی شاعر تھے کہ

ان کا صرف تخلص ہی معلوم ہوسکا، نام اور کلام تک رسائی نہ ہوئی۔ مثلاً آزردہ وغیرہ۔ میں نے دانستہ سلسلہ میں اُن کا ذکر نہیں کیا کیونکہ محض فہرست کو لمبا کرنا مقصود نہیں تھا۔ بعض اصحاب ایسے تھے کہ ان کا نام اور تخلص دونوں معلوم ہوگئے۔ اگرچہ نہ مفصل حالات ملے نہ زیادہ کلام ہی ہاتھ لگا۔ مثلاً حسام۔ درد۔ ذکی۔ رابطہ۔ سالم وغیرہ کا۔

غالب کے تمام شاگردوں کی تعداد ۱۴۶ ہے لیکن ان میں سے یہ شاگرد بہت زیادہ مشہور ہوئے:

مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی اسمٰعیل، منشی ہرگوپال سکندر آبادی تفتہ، قاضی عبدالجمیل بریلوی جنوں، مولانا الطاف حسین انصاری پانی پتی حالی، حکیم اشفاق حسین مارہروی ذکی، نواب محمد مصطفیٰ خاں دہلوی شیفتہ، ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر، میرزا زین العابدین خاں دہلوی عارف، نواب علاؤ الدین احمد خاں دہلوی علائی، میر مہدی حسین مجروح، نواب محمد یوسف علی خاں بہادر، رام پور ناظم۔ ●

غالب نے بیسویں صدی کی آہٹ سن لی تھی

صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

غالب کو یہ شکایت تھی کہ اُن کے زمانے میں اُن کی قدر اتنی نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن انہیں یہ اعتماد تھا کہ جیسے جیسے زمانہ گزرے گا ان کے قدردانوں کی تعداد بڑھتی جائے گی اور یہ اعتماد اس بنا پر تھا کہ وہ اپنے آپ کو "گلشن ناآفریدہ" کی بلبل تصوّر کرتے تھے جس تصوّر کے نشاط کی گرمی سے وہ نغمہ سنج ہوتے تھے وہ پردہ مستقبل کا نغمہ تھا۔ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو خود شناس ہو اور اپنے فکر و فن کے اسرار و غوامض سے پوری طرح واقف ہو اس سلسلہ میں انہوں نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ صحیح ثابت ہوئی

غالب کے مزاج اور ذہن کا سانچہ کچھ ایسا تھا کہ وہ مروجہ طریقوں کو جُوں کا توں قبول نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کی طبیعت جدّت چاہتی تھی ——— کہ بات میں بات پیدا ہو اور جو بات بھی کہی جائے وہ اس طرح کہی جائے کہ نئی معلوم ہو وہ جانتے تھے کہ شاعری اس تہذیب کا ایک بنیادی جزو ہے جس میں عرب و عجم کا صدیوں کا سوز و گداز شامل ہے۔ خاص طور سے فارسی شاعری تو اس تہذیب کی مثالی شکل بن گئی ہے۔ وہ اس راز کو خوب سمجھتے تھے کہ کس طرح شاعری کے ذریعے تہذیبی قدریں نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتی رہی ہیں۔ معاشرہ میں شاعر کا کیا مقام اور کیا اثر ہے۔ وہ اس بات کو بھی جانتے تھے اس طرح وہ غالباً شعوری طور پر قدیم اور جدید کے درمیان ایک پُل بن گئے اور اسی بنا پر انھیں اُردو زبان کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا جدید شاعر کہا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج وہ پہلے سے زیادہ مقبول ہیں۔ ان کی غزل اور اُن کی سادہ و پُرکار نثر دونوں سے جدید اُردو ادب کی ابتدا ہوتی ہے۔

غالب نے فارسی ترکیبوں کو اُردو زبان کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ وہ خود ایک منفرد آہنگ و لہجہ بن گیا اس طرح وہ ان تہذیبی روایات کو کمال فن کاری کے ساتھ اُردو جاننے والی نسل میں منتقل کر سکے جو فارسی شاعری میں رچ بس گئی تھیں۔ میں اسے غالب کا ایک بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں۔ اور ہم سب پر یہ اُن کا بڑا احسان ہے۔

سچ یہ ہے کہ غالب نہ تو صوفی تھے اور نہ فلسفی۔ وہ صرف شاعر تھے۔ ہاں ان کے یہاں فکر کا ایک عنصر تھا جو وحدت الوجودی عقیدے کی روایات کے جلو میں ان کی شخصیت اور فن کا جزو بن گیا تھا۔ غالب کے ایسے فارسی اور اُردو اشعار کی تعداد خاصی ہے جن میں فکر کے اس عنصر کی آمیزش سے بڑی بلندی اور گہرائی پیدا ہو گئی ہے۔

غالب کا یہی فکری عنصر جب نکیلی اور تازہ کار ترکیبوں خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں کے ساتھ شعر کے پیکر میں ڈھل گیا تو ہیئت و معنی کی کیسی حسین اور تازہ کار شکلیں سامنے آئیں اور پھر معنی آفرینی کے کیسے کیسے پہلو اُجاگر ہوئے جن اشعار میں فکر کا عنصر نہیں وہاں بھی آہنگ و لہجہ اور الفاظ کی بندش سے شعر پُرفن ہو گیا ہے اور وہ صرف اس وجہ سے کہ اُن کی شخصیت کی انفرادیت ان کے اسلوب کی ندرت بن گئی تھی۔

اپنے اسلوب کی مدد سے غالب نے فکر و جذبے کو کچھ اس طرح سمویا کہ ہر سطح کا شخص اس میں اپنے فکر یا اپنے جذبے کا عکس دیکھنے لگا۔ پھر ایسے اشعار بھی ہیں جن میں تصویر

کشی اور تلخی ایسی شیر و شکر ہو گئی ہیں کہ ان کی دوئی باقی نہیں
رہی۔ سیدھی سادی بات کو موزوں لفظوں میں بیان کرنا صرف
قادر الکلام شاعر ہی کے بس کی بات ہے۔ بعض دفعہ تو یہ محسوس
ہوتا ہے کہ شاعر نے جو بات کہی وہی ہمارے دل میں بھی ہے۔
بس شاعر نے اسے شعر کی زبان میں بیان کر دیا ہے۔

غالب کے خطوط ان کی زندگی کی کھلی کتاب ہے۔ ان
خطوط سے ان کی زندگی کی کوتاہیاں بھی معلوم ہوتی ہیں اور
خوبیاں بھی۔ یعنی یہ کہ وہ ہم جیسے انسان تھے اور ان میں وہ
کوتاہیاں اور خوبیاں تھیں جو انسان کی مشترک پونجی ہے۔ ان
خطوط میں وہی حسن، وہی سادگی اور پُرکاری ہے جو ان کے اشعار
میں ہے۔ البتہ دردمندی، وسیع المشربی اور زندگی کا وہ سوز و
ساز جو اشعار میں اشارت و عبارت کے پردے میں ملتا ہے
خطوں میں وضاحت کے ساتھ عیاں ہے۔ جس شہر میں وہ رہتے
تھے چاہتے تھے کہ کم از کم وہاں کوئی بھوکا ننگا نہ رہے۔ وہ
مسلمان، ہندو، نصرانی سب کو عزیز رکھتے تھے۔ وہ خوش بھی
ہوتے تھے اور ناراض بھی۔ وہ دیتے بھی تھے اور لیتے بھی۔
دوستوں اور عزیزوں پر جان چھڑکتے تھے اور مخالفوں سے
وقار کے ساتھ ملتے تھے۔ ان کے خطوط میں ان کی شخصیت کے
بھی پہلو ملتے ہیں اور اسی لئے وہ ہم کو اور بھی عزیز ہیں۔

غالب ہندوستان کے ان چند اربابِ بصیرت میں سے
تھے جنھوں نے انیسویں صدی کے وسط میں بیسویں صدی کی آہٹ
سن لی تھی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کا ماتم انھوں نے اس
طرح نہیں کیا جیسا دوسروں نے کیا۔

انہوں نے اسی بنا پر مغربی علوم کی ترویج کا خیر مقدم
کیا۔ انہوں نے اپنی ایک غزل میں رموز و استعارے کی زبان
میں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ چاہے اہلِ ہند کے پاس
گوہر و تاج باقی نہ رہا ہو لیکن مغربی تعلیم کی بدولت ذہنی ترقی کا

روسی زبان میں غالب پر کتاب کا ٹائیٹل

جو سامان مہیا ہو گیا ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ سید احمد خاں کی
فرمائش پر انہوں نے آئینِ اکبری پر جو تقریظ لکھی اس میں بھی جدید
تمدن کی برکتوں کو سراہا اور کہا کہ ماضی پرستی زندگی کی ترقی
میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ زندگی نہیں بلکہ مردہ پرستی ہے۔

غالب عمر بھر ذاتی اور معاشرتی پریشانیوں میں مبتلا
رہے۔ لیکن وہ مایوس کبھی نہیں ہوئے۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ
اندھیرا چھا گیا تو وہ اُسے دیکھ کر مسکرا دئے اور کہا کہ یہ بھی
گزر جائے گا۔ اُن کی زندگی میں امید کی شمع کبھی گل نہیں ہوئی اور
اسی اُمید پرستی کے سہارے وہ زندگی سے پورا پورا لطف
اُٹھاتے رہے۔ ان کی سیرت کی یہی خصوصیت آج ان کی مقبولیت
کی ایک وجہ ہے۔ اسی بنا پر وہ کہتے تھے کہ آج نہیں تو کل لوگ
مجھے پہچانیں گے۔ زندگی میں اگر مجھے اطمینان و سکون کا چمن زار
نصیب نہیں تو اس سے کیا ہوا۔ ایک دن وہ ہوگا کہ میرے
مزار کے چاروں طرف چمن بندیاں اور پھولوں کی کیاریاں ہوں گی
یہ اس لئے کہ زندگی میں میرا دل کسی کے حسن کے جلووں سے
معمور اور اس کے قرب کا متمنی تھا۔ میری یہ تمنا میرے مزار کے
چاروں طرف لالہ و گل کی شکل میں نمایاں ہوں گی۔

دیوانِ غالب مصنّفوں کے لئے مشعلِ راہ

صہبا لکھنوی

دیوانِ غالب نے ہمیں صرف نئے زاویوں اور نئے انداز سے محسوس کرنا اور سوچنا ہی نہیں سکھایا ہے ہمارا اندازِ فکر اور طرزِ نگارش بھی بدلا ہے ——— اور اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ ملک کے مایۂ ناز ادیبوں، شاعروں، مفکروں اور افسانہ نگاروں نے اپنی تصانیف کے نام رکھنے کے لئے دیوانِ غالب کا سہارا لیا۔
ذیل میں ہم ان کتابوں کی فہرست شائع کر رہے ہیں جن کے نام غالب کی مخصوص تراکیب اور اختراع پسندی کے رہینِ منت ہیں ——— غالب کا وہ شعر بھی درج ہے جس سے کتاب کا نام بالکل اس طرح نکالا گیا ہے جیسے پھول سے عطر نکالا جاتا ہے۔ ——— مدیران

بالِ جبریل ——— ڈاکٹر محمد اقبال

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

★

محشرِ خیال ——— سجاد انصاری

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

★

گنج ہائے گراں مایہ ——— رشید احمد صدیقی

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

★

نقشِ فریادی ——— فیض احمد فیض

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

دستِ تہِ سنگ ——— فیض احمد فیض

دعوائے گرفتاری و مجبوریِ الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

★

نمرود کی خدائی ——— سعادت حسن منٹو

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

★

لذتِ سنگ ——— سعادت حسن منٹو

سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

★

گویا دبستاں کھل گیا ——— چودھری محمد علی ردولوی

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

دار و رسن کی آزمائش ——— مخمور جالندھری

قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

★

سخن ہائے گفتنی ——— کلیم الدین احمد

بیا ورید گر ایں جا بود زباں دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

★

آشفتہ بیانی میری ——— رشید احمد صدیقی

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

★

غالب نام آورم ——— نادم سیتاپوری

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس
ہم اسداللہم و ہم اسداللہیم

★

چشم نگراں ——— عزیز حامد مدنی

رخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند
دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

★

خون جگر ہونے تک ——— فضل احمد کریم فضلی

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

★

قطرے سے گہر ہونے تک ——— صالحہ عابد حسین

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

گل نغمہ ——— فراق گورکھپوری

نے گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

★

ماتم یک شہر آرزو ——— عبدالعزیز خالد

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

★

چند تصویر بتاں ——— جعفر منصور

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

★

ہزاروں خواہشیں ——— عابدی جعفر

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

★

سنگ و خشت ——— کنہیا لال کپور

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

★

غالب آشفتہ سر ——— عبادت بریلوی

اے ساکنان کوچۂ دل دار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے

★

سحر ہونے تک ——— آغا جانی کشمیری

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اُنھوں نے کہا

غالب نہ فرشتہ تھے نہ شیطان۔ وہ موقع محل کو پہچانتے تھے۔ جو لوگ ان کی قدر کرتے تھے ان سے کام نکالنا بھی جانتے تھے۔ وہ علمی بحث میں گھبرا کر جلی کٹی باتیں بھی کہہ دیتے تھے۔ وہ ہمارے جاگیردارانہ تمدن کی آخری شمع تھے مگر اس کے نظام کو برتنے کی پوری صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ وہ ان دیوتاؤں میں سے تھے جن کے مٹی کے پاؤں فوراً نظر آجاتے ہیں۔

آل احمد سرور

غالب ان خوش نصیب شاعروں میں بلند مقام رکھتے ہیں جن کے پاس اسلوب کا اعجاز اس کا سحر اور اس کی تاثیر ہے۔ اس خصوصیت کے اعتبار سے وہ نہ صرف اپنے معاصرین میں بلکہ پہلے اور بعد کے شعرا میں ایک امتیازی شان کے مالک ہیں۔ غالب کا اندازِ بیان اس قدر نادر، دلچسپ اور ممتاز ہے کہ محض اسلوب ہی کی طاقت سے زندۂ جاوید رہیں گے۔

کوثر چاندپوری

غالب بلاشبہ اس دور کے سب سے بڑے غزل گو ہیں۔ ان کا مختصر اردو دیوان شاعری کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس میں پہلی مرتبہ غزل کے عام ہلکے پھلکے مضامین یا تصوّف کے متعارف مسائل اور موضوعات کی جگہ دقتِ خیال اور فکر انگیز مضامین کی دعوت دی گئی ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

کہتے ہیں جس کو عشق ———— خواجہ احمد عباس

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

★

موت سے پہلے ———— احمد علی

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

★

سنگ گراں اور ———— ڈاکٹر احسن فاروقی

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

★

اور پھر بیاں اپنا ———— اخلاق احمد دہلوی

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

★

وطن سے دور ———— مفتاح الدین ظفر

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

★

دلِ ناداں ———— کرشن موہن

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

★

کاغذی پیرہن ———— خلیل الرحمٰن اعظمی

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا ★★

پیروڈی بر غزل غالب

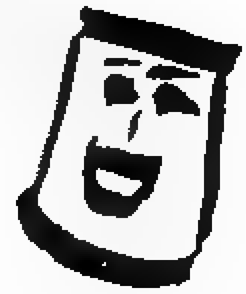

شوکت تھانوی

مرزا غالب جیسے مسلم الثبوت استاد نے جو غزل ہفتوں کی کاوش کے بعد کہی ہوگی پیروڈی تضمین یہ خاکسار محض چند گھنٹوں میں پیش کر رہا ہے۔ میں ان کی روح سے معذرت خواہ ہوں تاکہ حشر کے دن گریبان پکڑنے والوں میں مرزا غالب ایسے بزرگ نہ ہوں۔ اس لئے گواہ رہیے گا کہ میں نے معذرت کر لی ہے۔

شوکت تھانوی

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے

کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہ تھی انہیں
کچھ شرح لکھنا باعثِ عزت نہیں مجھے

آزاد رو ہوں میں، مرا مسلک ہے صلح کل
غالب سے کیا کسی سے عداوت نہیں مجھے

میں شرح لکھ رہا ہوں شرف کچھ یہ کم نہیں
مانا، اسد کا مرتبہ، شوکت نہیں مجھے

غالب پہ اور مجھ کو ہو تنقید کا خیال
یہ تلب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

میرا مزاج آپ ہے، جامِ جہاں نما
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں اور شرح لکھتا، مگر اس سے مدعا
مجزا رتکاب ذوقِ ظرافت نہیں مجھے

یوں ہی سا اک مذاق تھا جو شرح بن گیا
دیکھا کہ چارہ غیر اشاعت نہیں مجھے

اس میں جو آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے ترکِ عقیدت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

حرکت تو یہ بری ہے پہ نیت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا شوکت خدا گواہ
سچ بولتا ہوں گو کہ یہ عادت نہیں مجھے

غالب یادگار قائم کرنے کی تجویز سو سال پرانی ہے

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

غالب جیتے جی جس قدردانی اور عزت افزائی کے مستحق تھے وہ انہیں نہ ملی، بلکہ وہ اپنی بڑھی ہوئی انفرادیت اور جدّت پسندی کی بدولت اپنے عہد میں اجنبی ہی رہے لیکن زمانے کی اس بے اعتنائی کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انہیں اپنی ذات اور صفات کا ایسا عرفان حاصل تھا کہ وہ خارجی حالات کے سامنے کبھی سپر انداختہ نہیں ہوئے بلکہ اپنے کمال فن کے بارے میں کامل اعتماد و یقین کے ساتھ اعلان کرتے رہے کہ آج نہ سہی کل سہی، بہر حال میرا کلام شہرت پائے گا۔

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی دادہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

ان کی یہ پیشین گوئی لفظ بہ لفظ صحیح نکلی۔ ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ان کی شہرت اور عزّت روز بروز بڑھتی گئی۔ مولانا حالی کی "یادگار غالب" اور ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری کی "محاسنِ کلام غالب" کے بعد تو ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ ساری ہندستانی دنیا ان کے فکر و فن پر ٹوٹ پڑی۔ چنانچہ گذشتہ پچاس سال میں جس دل چسپی اور انہماک کے ساتھ غالب کی زندگی اور کلام کا مطالعہ کیا گیا ہے، اور جس تفصیل و تحقیق کے ساتھ ان کے فکر و فن کے بارے میں لکھا گیا ہے کسی دوسرے ہندستانی شاعر کے متعلق نہیں لکھا گیا۔ لطف یہ ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے ان کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے، چنانچہ یہ ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت ہی کا نتیجہ تو ہے کہ نہ صرف پاکستان اور ہندستان بلکہ اس کے باہر بھی عوام اور سرکاری و نیم سرکاری دونوں سطحوں پر ان کی صد سالہ برسی منانے کا اہتمام کیا جا رہا ہے اور کچھ اس انداز سے کہ یہ برسی نہ صرف اپنی نوعیت کی پہلی عظیم اور ہمہ گیر ادبی تقریب ہوگی، بلکہ ہماری ادبی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ کی حیثیت رکھے گی۔

اس سلسلے میں اب تک جو متوقع پروگرام سامنے آئے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس تقریب کا اہم مقصد غالب کی یاد پھر سے تازہ کرنا، ان کی شخصیت اور فن کو دنیا سے روشناس کرانا ان کی زندگی اور کلام کو مزید صحت و صفائی کے ساتھ شائع کرنا ان کی زندگی اور کلام کے بارے میں تازہ مواد جمع کر کے کتابی صورت میں لانا، پرانے مواد کو ایک مفصّل اور مکمل ببلیوگرافی کی شکل دینا، ان کی زندگی اور فن کے بارے میں تحقیقی مطالعے کی سہولتیں فراہم کرنا اور اس قسم کے دوسرے کاموں کے ذریعے غالب کے شایانِ شان ایک علمی و ادبی یادگار قائم کرنا ہے۔

اس قسم کی یادگار قائم کرنے کا خیال پہلے کس کے ذہن میں آیا؟ اس کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ اس قسم کی یادگار قائم کرنے کے سلسلے میں غالب کے نام پر ادبی انجمنوں کے نام رکھنے، غالب اکیڈمی قائم کرنے اور غالب کے نام سے ادبی پرچوں کی بعض اشاعتوں کو مخصوص کرنے کا سلسلہ انفرادی سطح پر اس کی یادگار قائم کرنے کا سوال تو یہ خیال بھی نیا نہیں بہت پرانا ہے، چنانچہ آج ہم اس سلسلے میں جو کچھ کرنا چاہتے ہیں یا کر رہے ہیں اسے بروئے کار لانے کی تجویزیں غالب کی وفات کے فوراً بعد سامنے آنے لگی تھیں۔ اس قسم کی ایک تجویز جسے یادگارِ غالب کے سلسلے کی اولین تجویز کہنا چاہئے —— غالب کی وفات کے دوسرے مہینے ۲۳ مارچ ۱۸۶۹ء کے "اودھ اخبار" میں شائع ہوئی تھی۔

یہ تجویز غالب ہی کے ایک شاگرد مردان علی خاں رعنا

کی ہے۔ غلام رسول مہر نے رعنا کے نام غالب کے دو خطوط درج کیے ہیں، لیکن حالاتِ زندگی پر وہ روشنی نہیں ڈال سکے لکھتے ہیں کہ:

"ان کے متعلق صرف یہ معلوم ہو سکا ہے کہ مہاراجہ کپور تھلہ کے مقربین میں سے تھے اور کلکتے کا سفر بھی کیا تھا۔ نساخ نے اپنے "تذکرۂ شعرا" میں لکھا ہے کہ راقم نے ان کو کلکتے میں دیکھا ہے، اور "غنچۂ راگ" ان کا نظر سے گزرا ممکن ہے "غنچۂ راگ" رعنا کی کوئی کتاب ہو۔"

مالک رام نے البتہ ان کا حال تفصیل سے لکھا ہے،

بروز دوشنبہ ۳ جون ۱۸۷۹ (۱۱ جمادی الثانی ۱۲۹۶ھ) کو سری نگر میں ہیضے میں وفات پائی۔ علم دوست آدمی تھے۔ شروع میں مضطر تخلص کیا، بعد میں بدل کر رعنا کر لیا۔ جب نوابی کا خطاب ملا تو نظام لکھنے لگے، چنانچہ ایک رُباعی میں تینوں کا ذکر ہے۔

آغاز سخن وری میں مضطر تھا نام
رعنا تھا شباب شاعری کا ہنگام
ہے زیرنگیں جو کشور نظم نواب
نواب خطاب اور تخلص ہے نظام

صاحب تصنیف تھے علم جفر جامع اور جفر کبیر کے علاوہ ایک ضخیم کتاب شاہ ایران کے نام پر "ظلِ ناصری" ۱۲۸۱ھ میں تالیف کی۔ تاریخ میں ایک مبسوط "تاریخ البلاد" ۱۲۷۷ھ لکھی۔ علمِ موسیقی میں بھی دو کتابیں یادگار ہیں "نغمۂ صنم" اور "غنچۂ راگ" ۱۲۷۹ھ ریاست جودھ پور کی تاریخ "تواریخ مارواڑ" ۱۸۹۹ء

غالب کی صد سالہ برسی
ایک نظر میں

۱۵ فروری کو مدفنِ غالب پر نائب صدر مسٹر وی وی گری کے ہمراہ غیر ملکی سفیروں، ملکی لیڈروں اور شاعروں نے عقیدت کے پھول چڑھائے، بعد میں عرس محل میں ایک جلسہ ہوا جس میں نائب صدر جمہوریۂ ہند نے کہا "غالب انسان کو صرف انسان سمجھتے تھے ان کے ذہن میں کسی قسم کا بھید بھاؤ نہ تھا۔"

۱۶ فروری کو وگیان بھون میں غالب تقاریب کا سرکاری افتتاح صدر جمہوریۂ ہند نے کیا اور کہا "خدا کرے ہمارے دل میں بھی وہی حرارت پیدا ہو جائے جو غالب کے دل میں تھی ـــــ" اس جلسہ میں وزیر اعظم اندرا گاندھی اپنی اچانک علالت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکیں ان کی تقریر پڑھ کر سنائی گئی۔ اسی دن سہ پہر کو وگیان بھون میں وزیر تعلیم مسٹر ترگنا سین کے ہاتھوں "غالب اور ان کا عہد" کے موضوع پر ایک نمائش کا افتتاح عمل میں آیا۔

۱۷ فروری کو ایک بین الاقوامی سیمینار ہوا جو تین دن تک جاری رہا۔ اس کے بعد لال قلعے میں مشاعرہ ہوا۔ نیشنل اسٹیڈیم میں فلمی اداکاروں کی تقریب ہوئی اور ۲۲ فروری کو غالب اکیڈمی کی عمارت کا افتتاح ہوا۔ بمبئی کے عوامی تھیٹر کی طرف سے لال قلعے میں "دہلی کا آخری مشاعرہ" پیش کیا گیا۔

دہلی کے علاوہ ہندوستان کے ہر شہر میں غالب پر جلسے ہوئے اور مشاعرے منعقد ہوئے۔

مرکزی حکومت نے غالب کی یاد میں ٹکٹ جاری کیے ـــــ محکمۂ اطلاعات نے غالب پر کتابیں چھاپیں، کئی اداروں نے ڈرامے کیے اور غالب مباحثوں کا انعقاد کیا۔

کے نام سے لکھی۔ دو کتابیں مسمریزم کے مضمون پر لکھیں: "سیر غایت" ۱۲۸۴ھ اور "علم نظر" ۱۲۸۹ھ میں ہندستانی میں اس موضوع پر غالباً یہ پہلی کتابیں ہیں۔ انگریزی کی مشہور کتاب "تادر راجستھان" کا ہندستانی ترجمہ بھی ان ہی کی توجہ سے چھپا۔ ان کے اپنے ہندستانی فارسی کلام کا مجموعہ اسی مطبع (مطبع نول کشور لکھنؤ) سے "کلیاتِ نظام" کے نام سے دسمبر ۱۸۷۵ء میں چھپا۔ غالب کے بعد دبیر الدولہ منشی مظفر علی خاں اسیر مرحوم سے اصلاح لی۔

مردان علی خاں رعنا کی اصل تجویز "اودھ اخبار" کی جس اشاعت میں چھپی تھی۔ اس تک ہماری رسائی نہ ہوسکی، لیکن گارساں دتاسی نے اسے فرانسیسی زبان میں منتقل کر کے اپنی "تاریخ ادب ہندستانی" میں محفوظ کرلیا ہے اور اسی کا ہندستانی ترجمہ اس وقت ہمارے سامنے ہے، جسے نیچے نقل کیا جارہا ہے:

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستانی شعرا میں غالب مرحوم خاتم شعرا تھے اور ان کے بعد حقیقی شاعری کا وہ رنگ باقی نہ رہا۔ ایک ایسے استاد کے لیے جس نے اپنی ذہانت سے ہندستان پر جادو کا اثر دکھایا ہو، ضروری ہے کہ ایک ایسی یادگار قائم کی جائے، جو ان کے شایانِ شان ہو۔ اس کام میں جو لوگ ہاتھ بٹا سکتے ہیں وہ ان کے تلامذہ ہیں، اس لیے میں گذارش کرتا ہوں کہ وہ فرماں بردار شاگردوں کی طرح صمیم قلب سے اس خیال کو جلد سے جلد عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں۔ میری ناچیز رائے میں دلّی کے مخصوص حضرات کو ایک انجمن کی تشکیل کرنی چاہیے۔ یہ انجمن اس تجویز کو غور و فکر کے بعد منظور کرے اور تخمینہ پیش کرے کہ اس یادگار کے قائم کرنے میں کیا خرچ آئے گا، پھر اس خرچ کو پورا کرنے کے لیے چندہ جمع کرنے کی کوشش کی جائے، لیکن میرے خیال میں یہ یادگار خالص ادبی یعنی ایک کتاب کی صورت میں ہو تو بہتر ہے جس کے پہلے حصّے میں ان تاریخی واقعات کو ہندستانی فارسی میں مرتب کیا جائے، جن کا ان کی ذات سے گہرا تعلق ہے اور جو دوسروں کے لیے دلچسپی کا سبب بنیں۔ دوسرے حصّے میں ان نظموں اور مضامین کو جمع کردیا جائے جو ان کے شاگردوں نے لکھے ہیں۔۔۔ اس کے بعد ان قطعات تاریخ اور مرثیوں کو مرتب کیا جائے، جو ان کے شاگردوں نے ان کی وفات پر کہے ہیں۔ اس کتاب میں ان کے شاگردوں کا مختصر تذکرہ بھی ہونا چاہیے لیکن یہ تمام نثری اور منظوم تحریریں صرف غالب کے شاگردوں کی ہونی چاہئیں۔ اس کتاب کو دو حصوں ہندستانی اور فارسی پر مشتمل ہونا چاہیے۔ اس کے باوجود اگر کوئی ارادت مند مرحوم کے متعلق کوئی چیز بھیجتا ہے تو اسے بھی کتاب کے خاتمہ میں شامل کرنے میں حرج نہیں ہے۔ اس کتاب میں غالب کی تصویر کے ساتھ ان کے شاگردوں کی مکمل فہرست ہونی بھی ضروری ہے۔۔۔ ہر

شاگرد اور چندہ دینے والے کو اس کتاب کا ایک نسخہ ملنا چاہیے، پھر جو کتابیں بچیں فروخت کر دی جائیں۔

اگر میری اس تجویز پر عمل کیا گیا تو غالب کے شاگرد اپنے لائق استاد کو کھلے بندوں خراج عقیدت پیش کرنے کا حق ادا کریں گے اور یہ اہم ادبی یادگار غالب کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گی۔

اگر یہ انجمن میری اس تجویز کے علاوہ، اس شاعر کی یادگار قائم کرنے کی کوئی صورت پیدا کرے تو وہ اور بہتر ہوگی۔"

محمد مردان علی خان رعنا شاگرد غالب

(ماخوذ از "تاریخ ادب ہندستانی" اور مورخ گارساں دتاسی، ہندستانی ترجمہ، ریلیان سکستان۔ کتاب، ملک ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی)

اس تجویز میں جن ادبی کاموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان میں سے ایک کام "تلامذۂ غالب" کے نام سے پنڈت مالک رام نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے دیا ہے، لیکن اس تجویز کے بعض پہلو ہنوز توجہ طلب ہیں۔ غالب کے سلسلے میں مختلف شعرا، متعدد ادبا خصوصاً ان کے احباب اور تلامذہ کی تعزیتی تحریروں، قطعات، وفات اور مرثیوں کو کتابی صورت میں یکجا کرنے کا کام ابھی تک باقی ہے یہ کام نہایت ضروری ہے، اس کے ذریعے غالب کی زندگی اور فن کے سلسلے کی بہت سی اہم باتوں اور گم شدہ کڑیوں کے سامنے آنے کا امکان ہے۔ امید ہے کہ غالب کے محققین اور پرستاران کی صد سالہ برسی کے موقع پر اس اہم کام کی طرف بھی توجہ دیں گے، اور جس کام کی تجویز آج سے پورے سو سال پہلے کی گئی تھی اسے تکمیل کو پہنچائیں گے۔

غالب کی بیوی

پر لاعلمی کا پردہ پڑا ہے۔ خطوط کے آئینے میں امراؤ بیگم کا عکس "بیڑی اور بلا" کے روپ میں ابھرتا ہے۔ ہر چند یہ بیان ظرافت کے پیرائے میں ہے تاہم اسے جسم کا نشاط اور روح کا چین نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے علاوہ یہ بات قرین قیاس اس لئے ہے کہ ایک عمر کے بعد تنہائی کی شدت سماجی رفاقت کی محرومی کو جان لیوا بنا دیتی ہے اس وقت ناگوار بیوی بھی گوارا ہو جاتی ہے۔ غالب کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ امراؤ بیگم تو غالب کی جنسی کجروی اور رادباش زندگی کے لئے زنجیر کا حکم رکھتی ہوں گی۔ غالب کا آزاد اور حساس دل ذمہ داری کے بوجھ سے بوجھل ہو گیا ہوگا۔ اس عالم میں امراؤ بیگم تو کیا کوئی حور بھی ہوتی تو غالب اسے "بیڑی اور بلا" سمجھ بیٹھے۔ پھر امراؤ بیگم بھی ایک جاگیردار خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ انھیں بھی ورثہ میں ایک زریں معیارِ زندگی ملا ہوگا انھوں نے بھی شادکام ازدواجی زندگی کے فطری خواب دیکھے ہوں گے لیکن غالب کی معاشی زندگی ان تعبیروں کا مول نہیں کر سکتی تھی، غالب کے گھر میں تو خاک اُڑتی رہی۔ گھر کی یہ ویرانی سج جاتی اگر ازدواجی زندگی کی سب سے قیمتی اور سہل الحصول نعمت اسے میسر آ جاتی لیکن غالب کا نصیب اس سے خالی تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان کی پدرانہ محبت نے مایوس ہو کر جب کسی دوسرے کی اولاد کو اپنا مرکز بنایا تو اسے بھی موت آ گئی۔ غالب نے کھل کر کبھی اس غم کا اظہار نہیں کیا لیکن گھر کی ویرانی اور وحشت پر وہ جس طرح روئے ہیں جس طرح ماتم کیا ہے وہ ان کے غم کا غماز ہے ؎

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسباب ویرانی مجھے

(ڈاکٹر قاضی عبدالستار)

آخری مضمون

سلامت علی مہدی

میں غالب کو اردو کا سب سے بڑا شاعر نہیں مانتا۔

لیکن ——!

میں غالب کو ایک عظیم شاعر ضرور کہتا ہوں۔

میں یہ نہیں مانتا کہ غالب ساری عمر غربت اور افلاس کا شکار رہے —— غالب کی حویلی میں تمام عمر کم سے کم نو ملازم ضرور رہے —— انہوں نے روزانہ گوشت کھایا، ہمیشہ اچھا لباس پہنا، ہر شام انہوں نے پرتگالی شراب پی، ہر صبح انہوں نے خیرات کی —— اور کبھی پیدل مکان سے باہر نہیں نکلے۔

وہ ہمیشہ رئیس رہے اور ہندستان نے ہمیشہ ان کو کبھی بھی پریشان نہیں ہونے دیا۔

میرا یقین ہے کہ جس طرح غالب آج کامیاب ہیں اسی طرح اپنی زندگی میں بھی کامیاب تھے۔ جب تک وہ زندہ رہے وقت کے بڑے بڑے رئیس، علماء، صوفی، شاعر اور ارباب حکومت ان سے ملنا اپنی عزت افزائی سمجھتے رہے۔ وقت نے ان کی نازک مزاجی ہی نہیں برداشت کی، ان کے کردار کی خرابیاں بھی برداشت کیں اور مذہب و سماج کے سلسلے میں ان کی کج ادائیاں بھی۔

یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ غالب ساری عمر پریشان رہے

یہ کہنا بالکل بے ہودگی ہے کہ غالب کی زندگی میں کوئی قدر نہیں ہوئی۔ یہ کہنا بالکل دیوانگی ہے کہ غالب نے فارسی شاعری سے سرقہ کیا —— اور یہ کہنا بالکل جنون ہے کہ غالب سے بڑا شاعر آج تک اردو زبان نے پیدا نہیں کیا ہے۔

غالب کی عظمت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ——

لیکن غالب کو ہیرو کہنا بھی غلط ہے۔

غالب جاہ پرست تھے کیوں کہ جب تک لال قلعہ پر مغل پرچم لہرایا وہ بہادر شاہ ظفر کی قصیدہ خوانی کرتے رہے اور جیسے ہی یہ پرچم گرا غالب نے انگریز کی مدح سرائی شروع کر دی۔

غالب خوشامد پسند بھی تھے اور خوشامدی بھی ——

انہوں نے ساری عمر اپنے شاگردوں سے اپنی خوشامد کروائی اور خود ان طاقتوں کی خوشامد کی جو ان کو دنیا کا عیش دے سکتے تھے —— جو ان کو دنیا کی لذت دے سکتے تھے۔

غالب صرف نام کے مسلمان تھے —— انہوں نے بالاعلان شراب پی، جوا کھیلا، روزوں کا بھی مذاق اڑایا اور نماز کا بھی —— انہیں اس پر فخر تھا کہ وہ مسجد کے زیر سایہ خرابات میں مشغول ہیں۔

غالب اپنے گھر میں رہتے ہوئے بھی گھر سے ہمیشہ دور رہے —— ان کی ازدواجی زندگی کامیاب ہوتے ہوئے بھی ناکامیاب رہی۔ وہ جب بھی دوستوں میں بیٹھتے اپنی ڈومنی اور اس کے عشق کا قصہ ضرور چھیڑتے تھے —— ڈومنی کی یاد ان کے دل سے

مرتے مرتے نہیں گئی۔

غالب کے کلام میں بھرپور زندگی ہے ــــ حیات کائنات کا ناقابلِ تردید فلسفہ ہے، غمِ امروز بھی ہے اور غمِ فردا بھی، زندگی کی تلخیاں بھی ہیں اور مسرتیں بھی ــــ ان کے کلام میں صبح کا لوز بھی ہے، دوپہر کے سورج کی تپش بھی ہے، شام کی حیات افروز شفق بھی ہے اور رات کی تاریکی بھی ــــ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے کلام میں بڑی بے ہودگی بھی ہے، بڑی جنس پرستی بھی ہے، بڑی شہوت بھی ہے ــــ ان کے کلام میں ایسے شعر بھی ہیں جو ایک باپ اپنی بیٹی کے سامنے نہیں پڑھ سکتا۔ ایک بھائی اپنی بہن کو نہیں سنا سکتا۔

یہ ٹھیک ہے کہ غالب کو عشقیہ شاعر کہا جاتا ہے لیکن عشق کی بھی کئی قسمیں ہیں ــــ ایک عشق وہ تھا جو منصور حلاج نے کیا تھا اور پھانسی پائی تھی، ایک عشق وہ تھا جو سرمد نے کیا تھا اور گردن کٹائی تھی، ایک عشق وہ تھا جو عمر خیام نے کیا تھا اور عمر کا بڑا حصہ جیل میں گذارا تھا ــــ لیکن غالب کا عشق سب سے الگ تھا ــــ یہ عشق نہ مجازی تھا نہ حقیقی ــــ یہ عشق صرف نفس پرستی تھا، لذت کوشی تھا، جسمانی مسرت تھا ــــ یہ عشق ــــ عشق نہ تھا

ماسکو میں مرزا غالب کا فارسی دیوان بڑے اہتمام سے شائع ہوا ہے اس دیوان کی لاکھوں جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔

عشق کی بدترین مثال تھا۔

غالب کا یہ عشق گذشتہ سو سال سے ملک کے نوجوان کو گمراہ کر رہا ہے۔ غالب کے اسی عشق کی بارگاہ پر اختر شیرانی

جب غالب کا انتقال ہوا تھا

ریاض خیرآبادی کی عمر ۱۴ سال تھی، صفی لکھنوی کی عمر ۷ سال تھی، شبلی نعمانی کی عمر ۱۲ سال تھی، سید علی بلگرامی کی عمر ۱۸ سال تھی، سید احمد دہلوی کی عمر ۲۲ سال تھی، اکبر الہ آبادی کی عمر ۲۳ سال تھی، رتن لال سرشار کی عمر ۲۲ سال تھی، شاد عظیم آبادی کی عمر ۲۳ سال تھی، الطاف حسین حالی کی عمر ۳۲ سال تھی، نذیر احمد کی عمر ۳۳ سال تھی، داغ دہلوی کی عمر ۳۸ سال تھی، امیر مینائی کی عمر ۴۱ سال تھی، محمد حسین آزاد کی عمر ۴۱ سال تھی، سرسید احمد خاں کی عمر ۵۲ سال تھی، میر انیس کی عمر ۶۸ سال تھی۔ ــــ شاکر جبل پوری

www.taemeernews.com

منٹو، اور مجاز بھینٹ چڑھ چکے ہیں اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ غالب کا یہ عشق ابھی اور کتنوں کے خون کی قربانی لے گا۔

مجھے اس سے انکار نہیں کہ غالب فطری شاعر تھے کیونکہ ان کا کوئی استاد نہیں تھا، انہوں نے باقاعدہ کوئی تعلیم نہیں پائی تھی، وہ انتہائی ذہین تھے، وہ وقت کی نبضیں پکڑنا خوب جانتے تھے، انہوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ لئے تھے، انہوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے دور کے لوگ ان کی شاعری کو مہمل اور مشکل قرار دے رہے ہیں تو انہوں نے وہ شعر تخلیق کئے جو آنے والی نسل کو پسند آنے والے تھے ـــــ انہوں نے ۱۸۵۲ میں ۱۹۵۲ کو بھی دیکھ لیا تھا اور ۲۰۵۲ کو بھی ـــــ غالب کی یہ جنسی شاعری، یہ عیش پرستی کی ترغیب دینے والی شاعری، یہ عورت کی زلفوں میں الجھ جانے والی شاعری، یہ شراب کے جام میں ڈوب جانے والی شاعری، یہ شباب میں کھو جانے والی شاعری ـــــ اور یہ لذّت کوش شاعری رہتی دنیا تک پسند کی جائے گی۔

غالب نہ آزادی پرست تھے اور نہ قوم پرست ـــــ ان کے انتہائی گہرے دوست مولانا فضل حق خیر آبادی کو انگریزوں نے کالے پانی کی سزا دی، ان کے مربّی و سرپرست بہادر شاہ ظفر کو جلا وطنی ملی، ان کے ساتھی مولانا صدر الدین کو لال قلعہ کے بعد کس مپرسی کی زندگی ملی ـــــ لیکن ـــــ غالب نے جو سلطنت مغلیہ کی تاریخ لکھ رہے تھے ـــــ مغلیہ سلطنت کا آفتاب غروب ہونے کے فوراً بعد انگریزوں کی قصیدہ خوانی شروع کردی ـــــ انہیں ساری عمر اس کا غم رہا کہ وہ لاہور کے فرنگی سامراج کے دربار میں شریک نہ ہو سکے۔

لیکن غالب ـــــ خوبیوں کا بھی مرقع تھے، اور خرابیوں کا بھی۔ کیوں کہ وہ ایک مکمل انسان تھے۔

غالب یقیناً عظیم تھے۔

غالب سے امریکی شاعروں کی دل چسپی

غالب کی شاعری کے ترجمہ کے منصوبے کا اہتمام نیویارک ایشیا سوسائٹی کے ایشیائی ادب کے پروگرام نے کیا ہے۔ اس سلسلے میں اردو کے اسکالر اور شاعر اعجاز احمد اور دیگر سات ممتاز امریکی شاعروں کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ایشیائی ادب کے پروگراموں کی ڈائرکٹر مسز بولن کراؤن نے کہا کہ انگریزی میں غالب کی شاعری کا ترجمہ کرتے ہوئے جو سب سے اہم واقعہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا امریکی شاعروں پر براہِ راست اثر پڑا ہے۔ انھوں نے ایشیائی ادب پروگرام کا "اہم ترین اور انتہائی ولولہ خیز منصوبہ" قرار دیا ہے۔

مسز کراؤن متعدد برسوں تک ایسے شخص کی تلاش میں رہیں جو غالب کی شاعری کو اردو سے انگریزی میں ترجمے کرتے ہوئے اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کر سکے آخرکار انھیں اعجاز احمد مل گئے جو نیویارک سٹی یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ مسز کراؤن نے کہا ہے کہ اس پراجیکٹ نے امریکی شاعروں میں اس قدر دل چسپی پیدا کی جو حیران کن تھی۔ ہم نے پندرہ بیس شاعر تلاش کئے جن میں سے سات کو منتخب کیا جنھوں نے دستیاب مواد پر کام کیا۔ ان شاعروں نے اس میں گہری دل چسپی لی اور غالب کی غزلوں کو جدید انگریزی شاعری میں منتقل کرنے میں انتہائی محنت اور صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔

اب نیویارک اور واشنگٹن میں غالب انجمنیں بن چکی ہیں۔ غالب صدسالہ برسی کے دوران وہاں کئی مشاعرے بھی ہوئے تھے۔

شکاگو میں ایک مشاعرہ دہلی کے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں ہوا تھا۔

www.taemeernews.com

یہ اور بات ہے کہ انہوں نے اس انگریز کمشنر سے جو باغیوں کو سزا دے رہا تھا یہ کہا: "میں آدھا مسلمان ہوں سوٗر نہیں کھاتا شراب پیتا ہوں"

یہ اور بات ہے کہ انہوں نے انگریز حاکم سے غدر کے فوراً بعد کہا: "میں نے سکہ نہیں لکھا تھا ـــــ" حالانکہ انہوں نے غدر کے دوران بہادر شاہ ظفر کے لئے سکّہ کی عبارت لکھی تھی۔

یہ اور بات ہے کہ وہ لوہارو خاندان کے داماد ہوتے ہوئے بھی نواب لوہارو کی وطن پرستی اور انگریز دشمنی کا ساتھ نہ دے سکے۔

یہ اور بات ہے کہ انہوں نے عقبیٰ پسند کرنے کے بجائے دنیا پسند کی ـــــ انہوں نے ۱۸۵۷ کے بعد دہلی کے زوال پر خط تو لکھے لیکن زوال ہندستان پر کوئی مرثیہ نہیں لکھا۔

یہ اور بات ہے کہ وہ وقت کے ساتھ چلے ـــــ انہوں نے اپنے ضمیر کی آواز نہیں سنی۔

لیکن اس کے باوجود ـــــ غالب ماضی میں بھی عظیم تھے، آج بھی عظیم ہیں اور مستقبل میں بھی عظیم رہیں گے۔

کیوں کہ غالب ـــــ نے اردو کو ایک نیا قالب دیا تھا۔

کیوں کہ غالب نے اردو کے جسم سے فارسی کا لباس اتار کر خالص ہندستانی لباس پہنایا تھا۔

کیوں کہ غالب نے اردو کو ایک عوامی زبان بنایا تھا۔

کیوں کہ غالب نے یہ ثابت کیا تھا کہ انسان فرشتہ نہیں ہوتا ہے۔

کیوں کہ غالب نے دنیا میں صرف مسرتوں کو تلاش کیا تھا۔

کیوں کہ غالب نے یہ کہا تھا کہ کاغذی ہے پیرہن ہر

روس میں غالب

روس میں دیوان غالب کا روسی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کا فارسی کلام شائع ہو چکا ہے اور غالب پر مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

روس کے مشہور مستشرق بابا جان غفوروف نے غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا "غالب اپنے دور سے بہت آگے نکل گئے تھے اور انہوں نے اردو ادب میں جمہوری رجحانات کو فروغ دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ غالب ایک عظیم مفکر اور انسانیت پرست شاعر تھے۔ وہ عظیم ہندوستانی عوام کے ایک عظیم ثبوت تھے۔ لیکن دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی انہیں کچھ کم عقیدت حاصل نہیں ہے۔ غالب کی شاعرانہ بصیرت سب کو حیرت میں ڈال دیتی ہے"

روس میں ادارۂ اقوام ایشیا کے محقق ڈاکٹر سوخاچوف نے کہا "غالب کی شعری اور نثری تحقیقات غالب کے اپنے دور سے پہلے وجود میں نہیں آسکتی تھیں۔ صرف ایک ایسا ہی دور غالب جیسے دلچسپ ادبی مظہر کو جنم دے سکتا تھا جو عبوری دور ہو اور غالب کا دور جاگیردارانہ سماج سے نئے سرمایہ دارانہ رشتوں کے فروغ کا عبوری دور تھا" جشن غالب کے سلسلہ میں ۲۵ فروری کو ماسکو میں غیر ملکی ادب کی لائبریری میں ایک شاندار جلسہ ہوا۔ جس میں روس کے لیڈر، شاعر اور ہند و پاکستان کے سفیر بھی شریک ہوئے۔ اس جلسہ میں غالب کی غزلوں کا ایک رنگا رنگ پروگرام بھی پیش کیا گیا۔

غالب صد سالہ برسی میں شرکت کے لئے روسی وفد دہلی آیا۔

www.taemeernews.com

پیکرِ تصویر کا۔

یقیناً غالب —— ہندستان کے پہلے اردو فلاسفر تھے جنہوں نے ماضی حال اور مستقبل کو ایک ہی نظر میں دیکھ لیا تھا —— یقیناً وہ ہندستان کے پہلے اردو شاعر تھے، جنہوں نے اردو کو عوامی زبان بنایا —— یقیناً وہ پہلے اردو ادیب تھے جنہوں نے یہ ثابت کیا کہ آسان اور عام فہم اردو ہی اردو کی ترقی اور مستقبل کی ضمانت ہے۔

غالب یقیناً اپنے دور کی تہذیب کا مظہر تھے ——

وہ اپنے زمانے کا آئینہ تھے، وہ لٹی ہوئی دہلی کی قدروں کے نقیب تھے۔ وہ آنے والے مستقبل کی علامت تھے۔ انہوں نے دنیا میں مسکرا کر زندہ رہنے کا فلسفہ سمجھ لیا تھا —— اگر انہوں نے یہ فلسفہ نہ سمجھ لیا ہوتا تو آج ان کی قدر نہ ہو رہی ہوتی۔ ان کی صد سالہ برسی نہ منائی جا رہی ہوتی۔

غالب نے وقت کی نبضوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا ——

وہ وقت کے ساتھ ساتھ چلے تھے، انہوں نے ہر صبح کو نئی صبح سمجھا تھا اور ہر رات کو اپنی زندگی کی آخری رات۔

غالب پر اب تک سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں ——

ان پر ہزاروں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مضامین ان کی مخالفت میں بھی ہیں اور ان کی تعریف و توصیف میں بھی، یہ مضامین ان کی صلاحیتوں پر بھی ہیں اور ان کی زندگی کے واقعات پر بھی —— لیکن ان کے بارے میں آج تک یہ نہیں لکھا گیا کہ وہ بد اخلاق تھے، بے مروّت تھے، ظالم تھے، خود غرض تھے کیوں کہ یقیناً وہ ان تمام برائیوں سے پاک تھے —— ان کے مخالفوں نے بھی ان کی انسانیت کے گن گائے ہیں۔

لیکن ——!

اس کے باوجود وہ انسان تھے اور انسان میں برائیاں ضرور ہوتی ہیں کیوں کہ انسان فرشتہ نہیں ہوتا۔

غالب کا سب سے بڑا کارنامہ اردو کو آسان اور عام فہم بنانا تھا —— اور غالب کا یہ کارنامہ رہتی دنیا تک نہیں بھلایا جا سکتا —— غالب نے اپنی زندگی میں بھی اردو کی عزت بڑھائی تھی اور آج بھی جب کہ ان کو مرے ہوئے سو سال ہو چکے ہیں وہ اردو کی عزت بڑھا رہے ہیں —— آج ان کی وجہ سے اردو کا ڈنکا ساری دنیا میں بج رہا ہے۔

اور اسی لئے ——

اردو ادب کی تاریخ غالب کی محراب عظمت کے سامنے ہمیشہ اپنا سر جھکاتی رہے گی عقیدتاً بھی اور محبتاً بھی۔

ہندستان کے تہذیبی سرمائے کو ہمیشہ غالب پر فخر رہے گا اور دنیا کے کروڑوں اردو بولنے والے ہمیشہ غالب کی عظمت کا پرچم لہراتے رہیں گے۔

تلخیص کار: سلامت علی مہدی — حسن کار: جگدیش سیٹھی، ضیاء اور عیاث — مشیر طباعت: جمیل الرحمٰن
طابع و ناشر: محمد یونس دہلوی — مطبوعہ: درگا آرٹ پریس، دہلی — سرورق: رین بو پرنٹرز، بلی ماران، دہلی
مالکان: شمع میگزین، نئی دہلی، مقام اشاعت: ۱۳/۱۲، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱
شبستاں میں شائع ہونے والے تمام مضامین دوسرے رسائل و اخبارات میں نقل کئے جا سکتے ہیں —— لیکن شبستاں، اردو ڈائجسٹ نئی دہلی کا حوالہ دینا ضروری ہے

اردو ڈائجسٹ

شبستان

نئی دہلی

اضافوں کے ساتھ دوسرا ایڈیشن

غالب نمبر

مع مکمل دیوانِ غالب مصوّر